MARCh
APRIL

ماہنامہ تجلّی دیوبند

نقد و نظر نمبر

Rs. 4/-

سالانہ پندرہ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر نمبر

ماہنامہ تجلی دیوبند

پچیسویں (۲۵) سال کا گیارھواں اور بارھواں شمارہ

ایڈیٹر
عامر عثمانی

اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ پر آپکی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔ وی پی ساڑھے سولہ روپے کا ہوگا۔

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کنیڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا اور ملیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ بحری بذریعہ۔ سعودی عرب قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ اور دس شلنگ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ

سالانہ پندرہ روپے

چار روپے

فہرست "نقد و نظر نمبر" بابت مارچ و اپریل

احوالِ واقعی	(ادارہ)	۴
آغازِ سخن	عامر عثمانی	۶
تفہیم القرآن	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	۳۰
منظومات	عامر عثمانی	۳۴
تجلی کی ڈاک	"	۳۵
منظومات	"	۵۷
حضرت مہتمم صاحب کے کچھ ارشادات	"	۵۹
کچھ نظریۂ ارتقاء کے بارے میں	"	۸۵
"جواب تبصرہ" پر ایک نظر	"	۹۹
تفسیر ماجدی	"	۱۱۷
مسجد سے میخانے تک	ملا ابن العرب مکی	۱۲۴
کھرے کھوٹے	عامر عثمانی	۱۴۰
حقائق	فطرت۔ حافظ	۱۵۲

اسلامی پریس۔ دیوبند

احوالِ واقعی

کل کیا ہوگا یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آج تک کے حالات یہ ہیں کہ ماہِ گذشتہ جس ابتلاء کا ذکر ہم نے آغازِ سخن میں کیا تھا وہ ابھی تک انجام کو نہیں پہنچی ہے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ کچھ نہ کچھ مخلصین نے ہماری معروضات پر توجہ تو فرمائی اور مالی تعاون کیا لیکن ابھی تک یہ تعاون اُن حدوں تک نہیں پہنچا جن حدوں تک مطلوب تھا۔ چالیس ہزار کی رقم بہرحال تھوڑی نہیں ہوتی۔ پھر بھی ہماری امید ٹوٹی نہیں ہے۔ ٹوٹنا کیا معنی اس کا پارہ تو ایک بال نیچے بھی نہیں گرا۔ اللہ کارساز ہے۔ وہ ان گداؤں کو مایوس کبھی نہیں کرتا جو صرف اور صرف اسی کے در پر جھولی پھیلاتے ہوں۔ اسی کو واحد مصدرِ بخشش و عطا سمجھتے ہوں اور اسی کی رضا کے طالب ہوں۔ اگر تجلی کی زندگی اس کی رضا کے مطابق ہے تو کون اسے مار سکتا ہے اور ہم ایک فقیرِ بے نوا کی حیثیت میں آج تک اس کے جود و کرم اور فضل و انعام کا جو مشاہدہ کرتے آرہے ہیں اس کے پیشِ نظر یہی کامل یقین رکھتے ہیں کہ وہ تجلی کو زندہ رکھے گا۔

ہماری پُر امیدی اور سکینتِ قلبی کا ثبوت یہ ہے کہ ڈاک نمبر کے فوراً بعد پھر یہ خاص نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے اور آپ دیکھ ہی رہے کہ اس کا کاغذ میلا نہیں ہے بلکہ وہی سفید ہے جو برابر لگتا آرہا ہے۔ بہت جلد ہم ایک اور نمبر بھی نکالنے والے ہیں "کہانی نمبر"۔

کہانی نمبر تجلی جیسے پرچے کے لئے اگرچہ غیر ثقہ سی بات ہے۔ مگر نالائق ملاّ کی واہی تحریروں سے قارئینِ تجلّی کے ذوق و مزاج نے جو منافاہمت کرلی ہے ـــــ یا دوسرے لفظوں میں سازش کرلی ہے اس کا ہم کیا کریں۔ وہ کہتے ہیں ملاّ کی بکواس چاہے تم نہ پڑھو مگر ہمیں پڑھواؤ۔

ہماری کوشش یہ ہوگی کہ اس نمبر میں تجلّی کے ضروری کالم بہرحال شامل رہیں لیکن وہ نالائق اگر لمبی کہانی لکھ لایا تو نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا فیصلہ کیا ہو۔ یہ بہرحال ہیں طے ہے کہ یہ پوری کہانی ایک ہی شمارے میں مکمل چھپے گی۔ ادھوری نہیں چھوڑی جائے گی۔

خریدار حضرات سے گذارش:۔

ہم جانتے ہیں کہ روپے کے سلسلہ میں جو اسکیم پچھلے ماہ ہم نے پیش کی تھی اس میں حصّہ لینا صرف ایسے ہی لوگوں کے لئے ممکن تھا جو ذرا دولت مند ہوں اور دولتمندوں کی تعداد زیادہ کہاں۔ اسی لئے بے شمار مخلصین نے ہمدردی اور دعاؤں کے خطوط تو لکھے مگر افسوس کے ساتھ اپنی بے بسی کا بھی اظہار کیا۔ ہم ان سب کے ممنون ہیں اور ایک آسان اسکیم ان کے سامنے رکھتے ہیں۔ کوشش کر کے ہم یہ آسانی تو فراہم کرسکتے ہیں کہ پوری رقم دو قسطوں میں داخل کریں چنانچہ ایک قسط انشاء اللہ اسی ماہ اپریل میں داخل کردیں گے اور دوسری قسط کے لئے وسط جون تک کی مدت ہے۔ اگرچہ کاغذ کا نرخ مزید بڑھ جانے کی وجہ سے تخمینہ ہے کہ اگلی قسط میں چار پانچ ہزار روپے کا اضافہ ہوجائے گا لیکن بہرحال مجبوری کا نام صبر ہے ـــ اب خریداروں کی خدمت میں تعاون کی درج ذیل صورت پیش کی جاتی ہے۔

ہر خریدار اس تحریر کو پڑھتے ہی جس قدر جلد ممکن ہوسکے اپنا ایک سال کا چندہ منی آرڈر سے بھیجدے۔ چاہے ابھی اسکی میعادِ خریداری کتنی ہی باقی ہو۔ جن حضرات کے لئے ایک سال سے زیادہ سالوں کا چندہ بھیجنا ممکن ہو وہ زیادہ کا بھیجدیں

فی الحال چندہ پندرہ روپے ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ روز افزوں گرانی آگے کو اس میں کتنا اضافہ کرے گی۔ اندازہ فرما لیجئے کہ کاپی جمانے کی جو پلیٹ پچھلے سال چھ روپے کی تھی وہ اب بیس روپے کی ہے۔ پریس کی روشنائی کا جو ڈرم ڈیڑھ سو کا تھا اب پونے چار سو کا ہے۔ کاغذ دوگنے سے اوپر گیا۔ اِن حالات میں رسالہ کی قیمت اور سالانہ چندہ بڑھائے بغیر گاڑی کیسے چل سکتی ہے۔ لیکن جو حضرات اس وقت چندہ بھیج دیں گے ان کے لئے کسی اضافے کا خطرہ نہیں۔ جب تک ان کی میعاد چلے گی پرچہ پہنچتا رہے گا۔ ہم سمجھتے ہیں اکثر خریداروں کے لئے کئی کئی سال کا چندہ بھیج دینا بھی دشوار نہ ہوگا۔ اس طرح ہماری مشکل بھی حل ہو جائے گی اور خریدار بھی دوہرا فائدہ اٹھائیں گے۔ ایک یہ کہ اختتام مدت تک وہ اسی چندے میں پرچہ حاصل کرتے رہیں گے دوسرے یہ کہ جذبۂ تعاون کے صلہ میں اللہ تعالیٰ شاید ثوابِ آخرت بھی دے۔ تجلی بہرحال ایک دینی و علمی پرچہ ہے اور مذہب و ملت کی ٹوٹی پھوٹی خدمات انجام دے رہا ہے۔ امید ہے ہماری یہ گذارش قابلِ قبول ہوگی۔

کہانی نمبر

ملّا ابن العرب مکی کی تحریریں جو دلچسپی قارئین تجلی کو ہے اس کے پیشِ نظر آخر کار ہمیں مان ہی لینا پڑا ہے کہ ایک کہانی نمبر نکال ہی دیں۔ ملّا طبعاً بے حد غیر ذمہ دار اور آزاد منش ہے۔ اس سے پروگرام کے مطابق کچھ لکھوا لینا آسان نہیں ہے۔ روایتی صوفیوں نے اس کی مٹی پلید کر کے رکھدی ہے۔ پھر بھی ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس کی ناک میں نکیل ڈال کر کسی کھونٹے سے باندھ دیں اور اس وقت تک نہ کھولیں جب تک کہانی نمبر کا مواد وہ مکمل نہ کرلے۔ امید ہے کہ اگلے سے اگلا شمارہ کہانی نمبر ہوگا۔ اسکی کچھ تفصیلات انشاء اللہ اگلے شمارہ میں پیش کی جائیں گی۔

اگلا شمارہ طلاق نمبر ہوگا

اگرچہ زیرِ دست شمارے میں مسئلہ طلاق پر کافی بحث آ رہی ہے لیکن مقالات پر دوسری نگاہ غور ڈالنے کے بعد ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ابھی اور کچھ کہا جائے کیونکہ مقالہ نگاروں نے ظاہراً ایسا مواد عوام کے آگے ڈالدیا ہے جو لباس و ہیئت کے اعتبار سے علمی ہے اور سخت غلط فہمی و گمرہی کا موجب بن سکتا ہے۔ ہم اس مواد کی علمی غلطیاں اور تحقیقی خامیاں محسوس کر لینے کے باوجود چپ رہیں تو ضمیر کی ملامت ہمیں چین نہ لینے دے گی اور شاید اللہ بھی ناخوش ہو کہ تم نے دین و شریعت کے دفاع میں غفلت یا رعایت کیوں برتی جب کہ علم کو چھپانا ہم نے جرم قرار دیا ہے۔" کاغذ اس نمبر کے لئے کہاں سے آئے گا' یہ اللہ جانے۔ توکل علی اللہ۔ امتحان کی گھڑی تو اب ہی آئی ہے۔ کوشش ہمارا کام۔ نتائج اللہ کے ہاتھ۔ نعم المولیٰ و نعم الوکیل۔

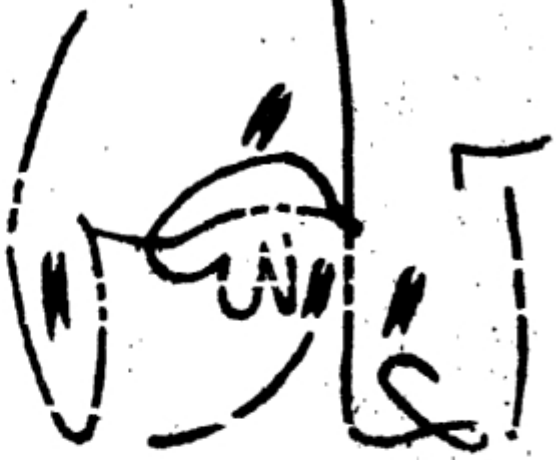

آغازِ سخن

تین طلاقوں کا مسئلہ

ماہِ گذشتہ ڈاک نمبر میں تین طلاق کے مسئلے پر سیمینار کا ذکر اور اس پر ہمارا اظہارِ خیال قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہم نے اس میں وعدہ کیا تھا کہ اس سیمینار میں پڑھے گئے مقالات اگر پریس میں آ گئے تو ان کا مطالعہ کر کے پھر کچھ عرض کیا جائے گا۔ جس ہفتے پچھلا تجلی بصیر ڈاک ہوا اسی ہفتے ماہنامہ زندگی کا "طلاق نمبر" بھی موصول ہوا جس میں سب نہ سہی اکثر مقالات شائع ہو گئے ہیں۔ اکثر سے مراد ہے پانچ مقالات۔ جگہ تنگ ہونے کے باعث دو مقالے شامل ہونے سے رہ گئے۔ بہرحال افہام و تفہیم کے لئے یہ بھی کم نہیں ہیں۔

یہ بات ایک دو بار نہیں دسیوں بار انداز و الفاظ بدل بدل کر ہم نے قارئین تجلی تک پہنچائی ہے کہ ہماری حیثیت فقہی مسائل میں مقلد کی ہے مجتہد کی نہیں اصطلاحی اجتہاد کے لئے جو گوناگوں صلاحیتیں اور صفاتِ عالیہ درکار ہیں وہ ہم میں نہیں پائی جاتیں لہٰذا تقلید کے سوا ہمارے لئے عافیت کی کوئی راہ ہے ہی نہیں۔ جو لوگ کافی استعداد اور مطلوبہ اوصاف کے بغیر مجتہد بن بیٹھے ہیں وہ عموماً خود بھی بھٹکتے ہیں اور دوسروں کو بھی بھٹکاتے ہیں۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کے باب میں نہ صرف فقہ حنفی کا بلکہ مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کا جو مسلک و مذہب ہے وہ سب جانتے ہیں۔ یہ چاروں مکاتبِ فکر اس پر متفق ہیں کہ ایک وقت میں دی ہوئی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں نہ کہ ایک۔ ایسی صورت میں ہم اگر کسی وجہ سے یہ بھی تصور کرتے کہ یہ مسلک دلائل کے اعتبار سے کمزور ہے تب بھی ہماری یہ مجال نہیں ہو سکتی تھی کہ تقلید کا قلادہ گردن سے اُتار پھینکیں کیونکہ اپنے علم، تفقہ اور مطالعے کی کمی کا ہمیں علم ہے اور اپنے مذکورہ تصور کو اسی کمی کا نتیجہ قرار دینے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہ ہوتا۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اس مسئلہ پر اپنی اہلیت اور دسترس کے مطابق ہم نے جتنا غور و فکر اور مطالعہ کیا اس کا ثمرہ اس تصور کی شکل میں برآمد نہیں ہوا بلکہ یہی محسوس

ہوا کہ دلائل کی زیادہ قوت اور شواہد کی مضبوطی مسلک بھی اسی مسلک، مذہب کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اسی کی تائید و پیروی ہم محض تقلیداً ہی نہیں بلکہ اپنی دانست میں علیٰ وجہ البصیرت بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔

اب جو پانچ مقالات سامنے آئے ہیں ان کے مطالعے سے پتا چلا کہ اس سمینار میں تقریباً سب ہی ان افاضل کا اجتماع ہوا جو اس معروف مسلک سے اتفاق نہیں رکھتے۔ تقریباً اس لئے کہ مدیر زندگی مولانا سید احمد عروج قادری کا مقالہ ان سے مختلف ہے۔ وہ کم و بیش وہی رائے رکھتے ہیں جو امت کے سوادِ اعظم کی ہے۔ باقی حضرات تین کو ایک ماننے کی رائے ظاہر فرماتے ہیں اور جو دو مقالے چھپنے سے رہ گئے وہ بھی یقیناً اسی رائے پر مشتمل ہوں گے کیوں کہ دونوں مقالہ نگار اہلِ حدیث مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور اہلِ حدیث کا مسلک معلوم ہی ہے کہ ایک وقت کی متعدد طلاقیں ان کے نزدیک ایک ہی ہوتی ہیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ دو فاضلینِ دیوبند نے بھی۔ یعنی مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا محفوظ الرحمان نے بھی مسلک اہلِ حدیث ہی کی تائید کی اور یہ ثابت فرمایا کہ امت کے سوادِ اعظم نے ائمہ اربعہ کی فقہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جس مسلک کو اجماعی اور قطعی تصور کر رکھا ہے وہ اجماعی و قطعی تو کیا ہوتا قابلِ ترجیح تک نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس باب میں فقہائے سلف و خلف کی فکرِ رسا نے ٹھوکر کھائی ہے اور ضرورت ہے کہ انھیں نظر انداز کر کے ہم اپنی فکرِ بلیغ اور قوتِ استدلال اور بصیرت و تفقہ پر بھروسہ کریں۔

اس بات کو خوشی کی بات ہم نے اس لئے کہا کہ اصولاً اس جرأت کو حق پسندی کا ہی عنوان دیا جا سکتا ہے۔ کسی درس گاہ کا طالب علم اگر اپنی دیانتدارانہ تحقیق اور ایماندارانہ فکر و تعمق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس درس گاہ کا فلاں مسلک و مذہب خلافِ حق ہے تو اس کی روش یہی ہونی چاہیئے کہ برملا اپنے اختلاف کا اظہار کر دے اور اندھی پیروی کی روش پر مصر نہ ہو۔ مذکورہ دونوں افاضل نے اسی کردار کا مظاہرہ کیا ہے اور عرق ریزی کے ساتھ اپنے دلائل و شواہد بھی حوالۂ قلم کر دیئے ہیں۔ ہمیں اس اعتراف میں تامل نہیں کہ سارے ہی مقالات نے قارئین کے لئے غور و فکر کا اچھا خاصا سامان مہیا کیا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے حنفی علماء اس سواد کو سامنے رکھکر مزید غور و فکر نہ کریں اور اگر واقعی اس کی بنیاد پر اپنے قدیم مسلک میں کوئی تبدیلی کی جا سکے تو ضد یا تعصب کی بناء پر اس سے گریز نہ فرمائیں۔ یہ مسئلہ ضرورتِ عامہ سے تعلق رکھتا ہے۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی ایک برائی اور اس کے ثمراتِ بد کے استیصال کا جذبہ ہی موجودہ مرحلے میں اس بحث و نظر کا محرک ہے لہٰذا گروہی عصبیت کو دخل انداز نہ ہونا چاہیئے۔

البتہ ایک ذہنی خلش اور قلبی چبھن جو ہم نے ان مقالات کو پڑھتے ہوئے محسوس کی ہے اس کا اظہار دیانتۃً ضروری ہوگا۔ یہی ضرورت ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ مقالات کے بعض اجزاء پر کھل کر گفتگو کریں۔ مقالہ نگار حضرات میں جو افراد مسلکاً اہلِ حدیث ہیں ان کے لئے تو یہ گفتگو شاید التفات و اعتناء کے لائق نہ ہو کیونکہ وہ پہلے ہی سے ایک معین و معلوم مسلک رکھتے ہیں اور اسی کی تائید و اشاعت کا موقعہ اس سمینار نے انھیں بہم پہنچایا ہے مگر مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہٗ اور مولانا محفوظ الرحمٰن اور مولانا حامد علی کے لئے یہ قابلِ توجہ ہونی چاہیئے۔ ہم ان حضرات کے مقابلے میں طفلِ مکتب ہیں یہ تو بجا اور اطفال مکتب کی باتوں پر التفات اساتذہ کے شایانِ شان نہیں ہوتا یہ بھی برحق لیکن حق پسندی کی ایک شان یہ سنی گئی ہے کہ مت دیکھو کس نے کہا یہ دیکھو کہ کیا کہا۔ اگر واقعۃً یہی طے نہیں کر لیا گیا ہے کہ ہر قیمت پر فلاں مسلک و مذہب پر جما جائے گا تو ان معروضات پر بھی ضرور توجہ کرنی چاہیئے جو ایک طفلِ مکتب کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں۔

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں
بہ غلط بر ہدف زند تیرے

یہ بنیادی اصول ہمیشہ سے مسلّم سمجھا گیا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں تحقیقِ حق مطلوب ہے تو آدمی کو مکمل غیر جانبداری کے ساتھ تمام متعلقہ مواد کا جائزہ لینا چاہیئے۔ غیر جانبداری سے مراد ہے خالی الذہن ہونا اور خالی الذہن ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی کسی قائم شدہ رائے یا میلان و رجحان کی خاطر تلاش و تحقیق سے منھ نہ موڑ لیے جائیں بلکہ ذہن سے ہر میلان و خیال کو کھرچ کر یہ تہیہ کر لیا جائے کہ تحقیق سے جو بھی ثابت ہوگا اسے بطیبِ خاطر اور برضا و رغبت مان لیا جائے گا — حتیٰ کہ اگر کسی داخلی محرک یا افتادِ طبع یا خارجی مصالح کی بنا پر حاصلِ تحقیق خوشگوار محسوس نہ ہو تب بھی اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا ہوگا اور اپنے ذاتی محسوسات کو قبولِ حق کی راہ کا پتھر نہ بنایا جائیگا۔

یہی وہ واحد طرزِ تحقیق ہے جو آدمی کو بے لاگ حقائق تک پہنچا سکتا ہے۔ ورنہ اگر پہلے سے کوئی رائے قائم ہو چکی ہے یا خیالات کے میزان کا پلڑہ کسی ایک رُخ پر جھکا ہوا ہے تو نفسیات کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ حقِ تحقیق ادا نہ ہو سکے گا اور علمی صداقتیں ذاتی رجحان کی آمیزش سے نہ بچ سکیں گی۔ بچ کیسے سکتی ہیں جبکہ ذاتی میلان اپنے مخالف دلائل کو ان کا قرارِ واقعی وزن نہیں دے سکتا اور موافق دلائل کو اس سے زیادہ وزن دینے پر مجبور ہے جو واقعی ان کا ہے۔

ہمیں خلش یہی محسوس کر کے ہوئی کہ بے لاگ خالی الذہنی اور فکری غیر جانبداری کا ثبوت یہ مقالے مہیا نہیں کرتے۔ قدم قدم اندازہ ہوتا ہے کہ وکالت نفسِ حق اور نفسِ صداقت کی نہیں اپنی رائے اور میلانِ طبع کی کی جا رہی ہے۔

کیوں ایسا محسوس ہوا اس کے لئے ہم کچھ مثالیں پیش کریں گے جن سے اسی قسم کا احساس اُبھرتا ہے۔ مقالہ نگار حضرات بھی اور دیگر اربابِ بصیرت بھی منصفانہ التفات فرمائیں۔ مسئلہ علمی ہے اور کافی دقیق لیکن ہم کوشش کریں گے کہ ہمارا اندازِ بیان [illegible] عام فہم ہو۔ اس سے طول ضرور ہوگا لیکن طول اُس اختصار سے بہتر ہے جو تمام قارئین کے پلّے نہ پڑ سکے۔

پہلی مثال

جو حضرات یہ مسلک رکھتے ہیں کہ ایک وقت میں دی ہوئیں متعدد طلاقیں بس ایک طلاق کے حکم میں ہیں ان کے مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ تین کو تین قرار دینے کی ابتدا حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت سے ہوئی ہے۔ دورِ رسالتؐ میں پھر دورِ صدیقیؓ میں اور پھر خلافتِ عمرؓ کے ابتدائی دو سالوں میں بھی ایک وقت کی متعدد طلاقیں ایک ہی تسلیم کی جاتی رہیں لہٰذا قرآن و سنت کا اصل قانون تو یہی ہے بعد میں حضرت عمرؓ کسی مصلحت سے اگر یہ حکم نافذ فرماتے ہیں کہ جتنی دی جائیں گی اتنی ہی مانی جائیں تو یہ ان کا ذاتی فعل اور ہنگامی اجتہاد تو ہو سکتا ہے مستقل قانونِ شریعت نہیں بن سکتا۔ اکیلے حضرت عمرؓ کا یہ مرتبہ بہرحال نہیں ہو سکتا کہ ابوبکر صدیقؓ اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ و رائے کو چھوڑ کر ان کی پیروی کی جائے۔

استدلال کی یہ تقریر کن مضمرات و ثمرات پر مشتمل ہے؟ اس سے فی الحال قطع نظر کر لیجئے کہ دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ کے تعامل کا دعویٰ جن بعض روایات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے کیا وہ معروف معیارِ فن پر اس دعوے کے اثبات میں کافی شافی ہیں۔ ان پہلوؤں پر انشاء اللہ زندگی رہی تو کسی دوسری صحبت میں گفتگو آئے گی۔ اس وقت ہم مانے لیتے ہیں کہ اس طرح کا دعویٰ اخلاص و غیر جانبداری پر مبنی ہو سکتا ہے اور سرسری تحقیق اس کا جواز مہیا کرتی ہے۔ لیکن اس دعوے کی بحث میں حضرت عمرؓ کے اجتہاد کی تاویل کرتے ہوئے حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی اور محترم مولانا شمس پیرزادہ

نے بھی مصر کے معروف صحافی محمد حسین ہیکل کی قیاسی اُڑانوں کو اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مؤخر الذکر نے ہیکل کی اصل کتاب سے استفادہ کیا اور اول الذکر نے اس کے اُردو ترجمے سے ہم یہاں اول الذکر کے مقالے سے ضروری حصّہ نقل کرتے ہیں:-

"اب رہی یہ بات کہ وہ وجہ آخر کیا تھی جس کے باعث حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگوں نے جلد بازی کی راہ اختیار کی تھی؟ اس سوال کے جواب میں عہدِ حاضر کے مشہور اور بلند پایہ مصنف محمد حسین ہیکل اپنی معرکۃ الآراء کتاب عمر الفاروقؓ میں لکھتے ہیں۔

"غالب گمان یہ ہے کہ عہدِ فاروقؓ میں جو لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دیتے تھے وہ طلاق دینے کے بعد ان سے شفقت اور نرمی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ عراق و شام کی کنیزیں بکثرت آگئی تھیں اور مدینہ اور جزیرۃ العرب کے لوگ ان پر فریفتہ تھے اور اپنی ان موہنیوں کو خوش کرنے کے لئے بیویوں کو بعجلت و شدت بیک لفظ تین طلاقیں دینے لگے تاکہ ان کی محبوبہ کو اطمینان ہو جائے کہ اب وہ ان کے دل پر تنہا قابض ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی تھے جن کے باعث صدرِ اول کے مسلمانوں کی ایک جماعت نے طلاقِ ثلاثہ کو ازراہِ بے پروائی و ایذا رسانی ایک کھیل بنالیا تھا۔ ان میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرد کسی آزاد عربی یا عجمی عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا تو وہ یہ شرط پیش کرتی تھی کہ مرد اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تاکہ وہ اس کے لئے حلالے کے بغیر حلال ہی نہ ہو سکے! اب اگر حلالے کے بعد شوہر اپنی پہلی بیوی سے مراجعت کرتا بھی تھا تو اس سے گھر میں ایسی بدمزگی پیدا ہوتی تھی کہ زندگی اجیرن بن جاتی تھی۔ غرض کہ اس قسم کے اسباب تھے جن کے باعث حضرت عمرؓ نے یہ حکم جاری کیا کہ تین طلاقیں جو ایک مجلس میں اور دفعۃً واحدۃً دی جائیں گی ان کا حکم طلاقِ مغلظہ ہونے میں وہی ہوگا جو ان تین طلاقوں کا ہے جو طلاقِ سنت کے مطابق تین طہروں میں دی گئی ہوں۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا جو شخص نکاح کی گرہ کو اتنا بے حقیقت سمجھتا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالتا ہے وہ بے حس اور یاوہ گو انسان ہے اور اسے اس بے حسی اور یاوہ گوئی کی سزا ملنی چاہیئے۔"

یہ نقل کرنے کے بعد مولانا اکبرآبادی تحریر فرماتے ہیں:-

"ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے جو کچھ لکھا ہے بالکل صحیح لکھا ہے اور اس سے خود حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا قول کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔"

محمد حسین ہیکل ڈاکٹر ہوں، زبردست مصنف اور صحافی ہوں۔ جو کچھ بھی ہوں اس سے ہمیں بحث نہیں۔ کہنا ہمیں یہ ہے کہ اگر مولانا اکبرآبادی اور مولانا شمس پیرزادہ زیرِ بحث موضوع کے معاملے میں واقعۃً غیر جانب دار اور بے لاگ ہوتے تو ان کی ذہانت و فراست ایک منٹ کے لئے بھی ہیکل صاحب کی قیاسی تاویل و توجیہ کے لغو اور مضحکہ خیز پہلوؤں سے غفلت نہیں برت سکتی تھی۔ ہرگز ممکن نہیں تھا کہ ان جیسے زیرک و دانا پہلے ہی دہلے میں یہ ادراک نہ فرمالیتے کہ محمد حسین ہیکل محض ابلہ فریبی سے کام لے رہے ہیں اور شاید خود بھی اپنی قیاسی شاعری کے لوازم و عواقب کو پوری طرح محسوس نہیں کر سکے ہیں۔

ان کے کلام کا آغاز "گمان یہ ہے" سے ہوتا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اب تاریخ کے بارے میں علم و تحقیق کے بجائے تخیلات کی اُڑان کا مظاہرہ ہوگا۔ چلیئے اگر تخیل قیاس و منطق سے جوڑ کھا جائے تو یہ بھی قبول مگر قیاس و منطق کا معاملہ اس عجیب و غریب تخیل کو قبول کرنے کیلئے مطلق آمادہ نظر نہیں آتا۔

ہیکل صاحب کی منقولہ توجیہ کے دو جز ہیں۔ پہلا جزو

کنیزوں سے تعلق ہے۔ ہم بھی پہلے اسی کو قیاس و منطق کی ترازو میں تولتے ہیں۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہیکل صاحب کس معاشرے کی بات کر رہے ہیں۔ کیا دورِ رسالت اور دورِ صدیقی میں اسلامی معاشرے کی حالت یہی تھی کہ صحابہؓ اور تابعین اپنی بیویوں کو طلاق دیئے بغیر کسی کنیز سے استفادہ نہ کر سکتے ہوں۔ اگر واقعی ایسا ہو تب تو اس توجیہ کی بسم اللہ الثغات سے لائق سمجھی جا سکتی ہے لیکن ہر صاحب علم جانتا ہے کہ واقعہ تو اس کے برعکس تھا۔ چار تک بیویوں کی اجازت اسلام نے دی ہے اور یہ وہ خیر القرون تھا جب اس اجازت پر عمل در آمد خوب خوب تھا۔ معاشرے میں اس کو ذرا بھی قابل اعتراض نہیں تصور کیا جاتا تھا کہ ایک مسلمان دو تین یا چار بیویاں رکھ لے۔ بیویوں کے علاوہ شرعی طریقوں پر حاصل شدہ کنیزوں سے ہر طرح کا استمتاع یہاں تک کہ جنسی تعلق بھی نہ صرف جائز بلکہ گوارا اور معمول بہا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم ایک کنیز ہی کے بطن سے تولد ہوئے تھے۔

جب حالات یہ ہوں تو آخر کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ صحابہؓ اور تابعین کے عشق و درمان کا جغرافیہ وہی رہا ہو جس کی تصویر کشی افسوس ناک بے تکلفی کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ تصویر ناواقف عوام کو کچھ ایسا تصور دیتی ہے جیسے خیر القرون کی کنیزیں حرمین شریفین میں نہایت آزادی کے ساتھ اپنے غمزہ و ناز کی آزمائش کرتی پھر رہی ہوں اور ہمارے زمانے کی الٹرا موڈرن خواتین کی طرح اس اختیار سے بھی پوری طرح متصف ہوں کہ جس سے چاہیں اپنی مطلوبہ شرائط کے تحت بیاہ رچائیں اور جس سے چاہیں نہ رچائیں۔

حالانکہ محترم ہیکل صاحب اور ان کے شاعرانہ گمان کو سندِ قبول عطا کرنے والے دونوں محترم مقالہ نگار بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ تصویر فاحش حد تک خلافِ واقعہ ہے۔ جہاد میں حاصل شدہ کنیزیں نہ تو دلربائیوں کے لئے آزاد چھوڑ دی جاتی تھیں نہ ان کی پوزیشن ایسی تھی کہ شادی شدہ صحابہ اور تابعین کو اپنا فریفتہ بنا کر من مانی شرائط قبول کرائیں۔ انھیں اللہ کے رسولؐ اور ان کے بعد صدیق اکبرؓ حاکم وقت کی حیثیت سے مستحق لوگوں میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ یہ اپنے مالکوں کی پابند ہوتی تھیں۔ کسی اور کے لئے ان سے جنسی تعلق کا جواز نہ تھا۔ جنسی تعلق تو دور کی بات ہے ان سے عشق بازی بھی اسی طرح گناہ تھی جس طرح آج اجنبی عورتوں سے گناہ ہے۔ مالک اگر بربنائے مصلحت ان سے خود شادی کرنا چاہے تب تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ یہ اپنی کوئی شرط اس پر عائد کر سکیں۔ لیکن کوئی دوسرا شخص نکاح کرنا چاہے تب بھی معاملے کی باگ ڈور ان کے آقاؤں کے ہاتھ میں رہا کرتی تھی اور یہ آقا اگر نکاح پر راضی ہوں تو انھیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ نکاح کرنے والا اپنی موجودہ بیوی یا بیویوں کو لازماً طلاقِ مغلظہ کے ذریعہ آزاد کر دے۔ خود کنیزوں کی طرف سے اس نوع کے مطالبے کی بات ہی خارج از بحث ہے۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ خود فریفتہ حضرات ہی ان کنیزوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی بیویوں کو چٹاپٹ طلاق دینے لگے تاکہ محبوبہ مطمئن ہو جائے تو یہ پرواز تخیل بھی در اصل دورِ حاضرہ کے تصورات کا عکس ہے جس میں زن و شوہر کے تعلقات کو عشق معشوقی کا معاملہ قرار دے کر یہ طے کر دیا گیا ہے کہ کوئی عورت سوکن کی موجودگی میں مطمئن اور آسودہ نہ ہو سکے گی۔ حالانکہ جس دور کی گفتگو ہے اس دور میں کم سے کم اسلامی معاشرے کا یہ ذہن اور یہ طرز فکر نہیں تھا۔ اس وقت تو لوگ کثرت سے متعدد بیویاں کر رہے تھے اور ایک بیوی کی موجودگی میں آنے والی دوسری بیوی رقابت کا وہ مہیب تصور لے کر نہیں آتی تھی جو آج پھیلا ہوا ہے نیز صحابہؓ و تابعین ـــ خواہ وہ کتنے ہی جدید الایمان ہوں اتنے گئے گذرے نہیں تھے کہ بہ کثرت کنیزوں پر عاشق ہوتے

پھریں اور دفورِ عشق میں کھٹ پٹ اپنی بیویوں کو طلاقیں دیتے چلے جائیں۔ یہ گھٹیا تصویر کسی تاریخ سے اگر برآمد کی جاسکتی ہو تو اس کی نشاندہی کی جائے۔ ہم اسے خیر القرون کے مسلم معاشرے پر کلنک کا داغ تصور کرتے ہیں اور ہمارا پختہ خیال ہے کہ اگر ہمارے مقالہ نگار بزرگ اپنے مسلک کی وکالت سے مبالغہ کی حد تک دلچسپی نہ رکھتے تو وہ بھی اس تصویر کی صداقت پر ہرگز مطمئن نہ ہوتے۔

مزید ایک نکتہ اور قابلِ غور ہے۔ چلئے فرض کرلیا کہ عشق و حسن کی یہ کہانی کوئی واقعیت ہی رکھتی ہوگی لیکن جب مقالہ نگار بزرگ پورے وثوق سے یہ بات کہتے ہیں کہ دورِ رسالت ؐ دورِ صدیقی ؓ اور دو سال تک دورِ فاروقی ؓ میں بھی ایک مجلس کی دی ہوئی متعدد طلاقیں ایک ہی مانی جاتی تھیں تو اس مسلّمہ قانونِ شرعی کا علم بہرحال ان سب لوگوں کو بھی یقیناً ہوگا جو قولِ ہیکل صاحب "اپنی من موہنیوں کو خوش کرنے کے ے بیویوں کو بعجلت و شدّت بیک لفظ تین طلاقیں دینے لے تھے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان سب پر دیوانگی ے دورے پڑے تھے کہ ایک بالکل ہی عبث اور بے نتیجہ ﺴل پر پوٹے ٹیک دیئے۔ کیا یہ قابلِ قیاس ہو سکتا ہے کہ ب وقت کی دی ہوئی متعدد طلاقوں کا ایک ہونا بھی ﻠوم و مسلّم ہوا اور من موہنیوں کو خوش کرنے کے لئے شاق بیک لفظ تین طلاقیں دے کر کوئی ثمرہ حاصل نے کی توقع بھی کر سکتے ہوں۔

ہمارے بزرگوں نے غور نہیں فرمایا کہ خود ہیکل صاحب کی شاعری کا یہ ٹکڑا غمازی کر رہا ہے کہ دورِ فاروقی سے ل بھی بیک لفظ تین طلاقیں دینے سے تین پڑجاتی ہونگی بیوی مکمل طور پر جدا ہوجاتی ہوگی ورنہ ممکن ہی نہیں ﻪ مفروضہ محبوباؤں کو خوش کرنے کے لئے اس ہتھیار کا ر تک عشاق کے دل میں آتا۔ آخر کند چھری سے کون ﺍکو ذبح کرتا ہے۔ ذبح کی خواہش رکھنے والا ایسی ہی چھری استعمال کرے گا جس کے بارے میں وہ مطمئن ہو کہ اس سے گردن کٹ جائے گی۔ طلاق ایک شرعی قانون ہے مذکورہ بزرگوں کے دعوے کے مطابق اگر دورِ رسالت ؐ اور دورِ صدیقی ؓ کا قانونِ شرعی معروف اور مسلّم طور پر یہی تھا کہ عجلت و شدّتِ لا حاصل ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی طلاق پڑ سکتی ہے چاہے ہزار سے ضرب دیدو اور تین طلاقوں کے لئے تین ماہ گذارنے ہوں گے تو کوئی بھی آدمی کیوں بیک وقت تین کی زحمت اٹھائے گا اور محبوبائیں اس سے مطمئن کیسے ہوجائیں گی جب کہ وہ بھی اس معاشرے میں بس جانے کے باعث جان چکی ہیں کہ ایک وقت کی تین طلاقیں تین نہیں ہوتیں اور شوہر صاحب تین ماہ تک جب چاہے رجوع فرما سکتے ہیں۔

یہ تو ہیکل صاحب کی توجیہ اول کا تجزیہ ہوا۔ اب اُن نوادرات پر آیئے جو یہ کہہ کر پیش کئے گئے ہیں کہ "اس کے علاوہ کچھ اور اسباب تھے ...."

یہ برابر ملحوظ رہے کہ یہ گفتگو اسی دور سے متعلق ہے جس کے بارے میں مذکورہ بزرگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ایک وقت کی متعدد طلاقیں ایک کے حکم میں تھیں۔

اس دَور میں کوئی آزاد عجمی یا عربی عورت اگر نکاح کی درخواست کرنے والے مرد سے یہ کہتی ہے کہ پہلے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دو تب میں تمھارے حبالۂ عقد میں آؤں گی تو بتایئے اس عورت کا کیا مقصد ہوگا۔ کیا وہ یہ کہنا چاہ رہی ہوگی کہ فی الفور تین طلاقیں دے ڈالو یا یہ کہنا چاہ رہی ہوگی کہ قاعدے کے مطابق تین ماہ تک تین طلاقیں پوری کرو۔

پہلی بات صراحۃً خارج از بحث ہے کیونکہ اس وقت تک تو بقول مذکورہ حضرات ایک وقت میں ایک سے زیادہ طلاقوں کا پڑنا قابلِ تصور ہی نہ تھا۔ یہ عورت کیوں ایک لاحاصل بات کی استدعا کرتی۔ لہٰذا دوسری ہی بات کا امکان ہو سکتا ہے۔ خود یہ عاشق مرد بھی یقیناً یہی دوسرا مفہوم اخذ کرتا ہوگا ــ پھر بھلا ہمارے بزرگوں کا یہ باور

کرانے کی کوشش کرنا کہ مجبوبہ عورت کے مطالبہ پر شادی شدہ مرد کھٹا کھٹ اپنی بیویوں کو بیک وقت تین طلاقیں دینے لگے ابلہ فریبی اور مغالطہ دہی نہیں تو اور کیا ہے۔

ایک قدم آگے بڑھ کر اب ذرا اس پر بھی نگاہ ڈال لیجئے کہ حضرت عمرؓ کی مشہور زمانہ فہم و فراست اور نیکدلی کا کیسا حلیہ محترم ہیکل صاحب کی شاعرانہ جدت طرازی نے بنا دیا۔

عشوہ طراز کنیزوں کے عشق میں پھنس کر دل پھینک مرد اپنی بیویوں کو آناً فاناً طلاقِ مغلظہ کا ہدف بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہ کنیزیں یا دوسری آزاد حسینائیں شادی پر تیار ہی نہیں ہیں جب تک کہ عاشق صاحبان اپنی بیویوں کو مکمل طور پر بے خانماں نہ کر دیں۔ یہ صورتِ حال جیسی کچھ کریہ ہے آپ کے سامنے ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں کیا ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ اس مکروہ صورتِ حال کی حوصلہ شکنی کرنے اور اس پر غمگین ہونے کے بجائے وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ یہ ہو رہے ہیں شاندار کارنامے۔

ہم سمجھتے ہیں حضرت عمرؓ جیسی عظیم مومن شخصیت کے لئے ایسا وہم بھی ناپاک جسارت ہے لیکن ہیکل صاحب کی شاعری ہمیں یہی باور کرانا چاہتی ہے۔ وہ اس طرح کہ یہ بات تو ہیکل صاحب اور ان کی رائے پر صاد کرنے والے مقالہ نگاروں نے طے ہی کر دی کہ جس دورِ مبارک میں یہ سب ہو رہا ہے اُس دور میں بیوی سے مکمل قطعِ تعلق کا واحد طریقہ بس ایک ہی تھا کہ طریقِ سنت کے مطابق ایک ایک ماہ بعد تین طلاقیں دی جائیں۔ ایک وقت میں ایک ہی طلاق واقع کی جاسکتی تھی چاہے زبان سے دو تین چار طلاقیں صادر کر دی جائیں۔ اس ایک طلاق کے بعد رجوع کا حق باقی رہتا تھا اور پھر مہینے بھر بعد بھی چاہے کتنی ہی طلاقیں بول دی جائیں فقط دوسری طلاق پڑتی تھی اور حقِ رجوع پھر بھی باقی رہتا تھا۔ گویا حقِ رجوع کا خاتمہ اور بغیر حلالے کے دوبارہ نکاح کا امتناع صرف اسی شکل میں تھا کہ تیسرے ماہ تیسری طلاق صادر کی جائے۔

اس اپنی ہی فرض کردہ صورتِ حال میں ہیکل صاحب یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ بیوی والے مردوں نے محبوباؤں کے مطالبے پر بیک وقت تین طلاقیں دینی شروع کیں۔ چلئے یہ عجوبہ بھی تسلیم لیکن یہ تو ظاہر ہی ہے کہ اس حرکت سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ طلاق ایک ہی واقع ہوتی تھی اور محبوباؤں کی پوری تسلی اور دلجمعی تین ماہ سے قبل نہ ہو سکتی تھی۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے دورِ رسالت اور دورِ صدیقی کے معروف و مسلم قانونِ طلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ حکم نافذ فرمایا کہ ایک وقت کی تین طلاقیں تین ہی مانی جائیں گی۔

کیا مطلب ہوا؟

قطعاً سامنے کی بات ہے۔ حضرت عمرؓ کو یہ بات پسند نہ آئی کہ عشاق حضرات اپنی منظورِ نظر حسیناؤں کے وصال سے نوے دنوں کی طویل مدت تک محروم رہیں اور ان نازک حسیناؤں کو بھی خواہ مخواہ اپنی شرط کی تکمیل میں تین ماہ کا انتظار کرنا پڑے۔ حضرت عمرؓ کو ان بیویوں سے بھی مطلق ہمدردی نہیں تھی جنھیں ان کے عاشق مزاج شوہر طلاقِ مغلظہ دینے کو بے چین تھے تاکہ عشق منزلِ مراد تک پہنچے۔ ان کی ہمدردیاں تمام کی تمام عاشقانِ کرام اور معشوقانِ عظام سے وابستہ ہوگئیں لہٰذا انھوں نے حکم نافذ فرما دیا کہ آج سے نقد انقد بھی طلاقِ مغلظہ ایک ہی وقت اور مجلس میں دی جاسکے گی اور جو قانون شارع علیہ السلام کے دورِ مبارک میں یا خلیفۂ اول کے زمانِ سعادت میں شائع ذائع تھا اسے آج سے طاقِ نسیان کی زینت بنایا جاتا ہے۔ اب گویا کسی حسینہ کو یہ اندیشہ نہ کرنا چاہیئے کہ اس کے شیدائی مرد نے اپنی بیوی یا بیویوں کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی ہیں تو رجوع کا امکان اب بھی ہے۔ اور کسی شادی شدہ من چلے کو یہ اضطراب نہ ہونا چاہیئے کہ بیوی کو مکمل طور پر جدا کرنا اس کے لئے تین ماہ سے کم میں ممکن نہ ہوگا۔

کیسے تین ماہ۔ ایک سانس میں تین طلاق دو اور محبوبہ سے نکاح رچالو۔ وہ انکار نہیں کرے گی کیونکہ اس کی شرط پوری ہو گئی ہے۔

عجوبہ در عجوبہ یہ کہ تمام موجود الوقت صحابہؓ نے بھی حضرت عمرؓ کے اس جابرانہ فیصلے سے بلا تأمل اور بلا تکلف اتفاق کر لیا۔ سب کی دلی ہمدردیاں عشاق ہی کے حق میں گئیں۔ عشق کی قتل گاہ میں قربان کی جانے والی بیویوں پر رحم کسی کو نہ آیا۔

اہلِ انصاف اور اہلِ بصیرت خدا کو حاضر و ناظر جان کر فیصلہ فرمائیں کہ ہیکل صاحب کی قیاسی توجیہ کا حاصل و محصول کیا اس کے سوا بھی کچھ نکلتا ہے۔ کیا بیچاری ہوئی بیویوں کو بے خانماں کرنے والے عشاق اور ظالمانہ شرط عائد کرنے والی حسیناؤں کے نازیبا کردار کی یا انھیں انعام عطا کیا گیا۔ کیا حضرت عمرؓ اور جملہ تقبیہ حیات صحابہؓ ایسے ہی نعوذ باللہ بدعقل اور پست مذاق اور شقی ہو سکتے تھے کہ نہایت گھٹیا اور بازاری طرزِ عمل اختیار کرنے والے عشق باز جوڑوں کو جنس ازبہیں آسانیاں فراہم کریں اور اس شان سے فراہم کریں کہ ایک وقت میں ایک ہی طلاق پڑنے کا جو شرعی ضابطہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ کے زمانوں سے چلا آرہا تھا اسے منسوخ کرنے میں انھیں ذرا جھجک نہ ہو۔

کوئی باہوش مسلمان ان مضمرات و نتائج کے کسی بھی جزو سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اور ہمارے محترم مقالہ نگار بزرگ بھی یقیناً ان سے اتفاق نہیں کر سکتے مگر وہ چونکہ ایک خاص رائے اور رجحان کی وکالت شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے اوپر لازم کر چکے ہیں اسلئے انھیں محمد حسین ہیکل صاحب کا مشہور و بلند پایہ مصنف ہونا تو نظر آیا لیکن ان کے ظن و تخمین کی نمایاں قباحت محسوس نہ فرما سکے۔

خدا علیم ہے خیر القرون کے تذکرے میں عاشقی معشوقی وغیرہ کے الفاظ نوکِ قلم پر لاتے ہوئے ہمارے وجدان کو بڑے کرب سے گذرنا پڑا ہے مگر جب ہمارے بہت ہی محترم بزرگ مولانا اکبر آبادی نے ہیکل صاحب کے متن کا وہ اردو ترجمہ نقل کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھا جو من موہنی اور محبوبہ جیسے نامتبوع الفاظ پر مشتمل ہے تو ہمیں دل پہ پتھر رکھ کر قارئین کو یہ محسوس کرانا پڑا کہ اس قبیل کے الفاظ گفتگو کو کس قسم کا رُخ دے سکتے ہیں۔ جو طرزِ تحریر ہم نے اختیار کیا وہ ہمارا طبع زاد نہیں بلکہ ہیکل والی توجیہ کے بین السطور سے ابھر کر آیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ حریری پردہ ڈال کر کہا تھا ہم نے اسے بے پردہ کر دیا تاکہ کوئی دھوکہ نہ کھائے۔ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔

دو گوشے یہاں ابھی اور گفتگو طلب ہیں۔ ایک یہ کہ ہیکل صاحب کی توجیہ صدرِ اول کے مسلمانوں میں کسی ایسی جماعت کا انکشاف کر رہی ہے جس نے عورتوں کو ایذا پہنچانے کے ارادے سے یا از راہِ لاپروائی تین طلاقوں کو ایک کھیل بنا لیا تھا۔

اس انکشاف کی واقعاتی حیثیت کیا ہے اور ہیکل صاحب کی توجیہ کے فریم میں یہ کہاں تک فٹ ہو رہا ہے اس پر بھی غور کرنا ہوگا۔ صدرِ اوّل سے مراد یہاں ظاہر ہے وہ زمانہ ہے جب تک حضرت عمرؓ نے وقتِ واحد کی تین طلاقوں کو نافذ کرنے کا حکم جاری نہیں فرمایا تھا گویا پورا دورِ رسالتؐ، پورا دورِ صدیقی اور خلافتِ عمرؓ کے ابتدائی سال۔ اس صدرِ اول کے بارے میں ہیکل صاحب اور ان کی توثیق کرنے والے محترم مقالہ نگار یہ طے ہی کر چکے ہیں کہ وقتِ واحد میں ایک ہی طلاق پڑا کرتی تھی اور زائد جو دی جائیں وہ فضول و لایعنی سمجھی جاتی تھیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہیکل صاحب نے مذکورہ فقرے میں کہنا کیا چاہا ہے اور مقالہ نگاروں نے کیا سمجھ کر اس کی توثیق فرمائی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ فقرہ کوئی واقعاتی مفہوم ہی نہیں رکھتا بلکہ بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہے۔ مفروضہ جماعت اگر واقعی کوئی تھی اور اس کا اذیت پسند مزاج بیویوں کو ایذا پہنچا کر ہی خوش ہوتا تھا تو تین طلاقیں آخر اسکی آسودگی اور مطلب براری کا باعث کیسے بنیں۔ دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ ایک وقت کی تین طلاقوں کا بھی حاصل وہی تھا جو ایک کا ہوتا ہے پھر کیا مطلب ہوا تین دینے کا۔ کیوں ایک ظالمانہ رجحان کا جوڑ تین طلاقوں سے ملایا جا رہا ہے جب کہ تین تو ایک ہی کے مرادف ہیں۔ اگر یہ بدگہر لوگ اپنی بیویوں کو ایذا ہی پہنچانے کی نیت سے طلاق کا کھیل کھیلا کرتے تھے تو تین یا دس بیس طلاقوں کا ذکر فضول جب کہ ان کی بے اثری اور لغویت مسلّم ہو۔ تین دے کر بھی وہ اس سے زیادہ کچھ حاصل نہ کر سکتے تھے جو ایک دے کر کر سکتے تھے۔ عورت کو جو بھی ایذا ان کے طرزِ عمل نے پہنچائی وہ ایک اور تین کی بظاہر مختلف صورتوں میں یکساں ہی ہے کیونکہ دعوے کے مطابق ان دونوں صورتوں میں ایک ہی طلاقِ رجعی واقع ہو رہی ہے۔

کس قدر کھلا تضاد ہے کہ ایک طرف تو ہمارے بزرگ یہ منوانے پر مصر ہیں کہ صدرِ اول میں وقتِ واحد کی متعدد طلاقیں متعدد تھیں ہی نہیں فقط ایک تھیں مگر دوسری طرف وہ تخمین وظن کے سہارے ایسی منطق پیش فرمائے جاتے ہیں جو اس کی نفی کرتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی احساس نہیں فرما رہے ہیں کہ اعلیٰ ترین دورِ سعادت کے مسلمانوں میں کسی ایسی جماعت کو فرض کر لینا جو محض بیویوں کی ایذا رسانی کے لئے طلاق کا کھیل کھیلتی رہی ہو کتنا ناموزوں اور خلافِ قیاس مفروضہ ہے۔

واقعہ یہ ہے ـــ اور اسے اکثر ثقہ مفسرین نے حوالۂ قلم کیا ہے کہ عرب کے کافر معاشرے میں عورتوں کی ایذا رسانی کے مختلف کھیل کھیلے جاتے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بیوی کو طلاق دی اور دورانِ عدت میں رجوع کر لیا۔ پھر دی پھر رجوع کر لیا۔ اسی طرح اسے مسلسل لٹکائے رکھتے اور حقِ رجوع کبھی ختم نہ ہوتا۔ اسلام آیا تو اس نے اس بربریت کی ناک میں نکیل ڈالی۔ سورۂ بقرہ کی وہ آیات جن میں اللہ نے واضح کیا ہے کہ تیسری طلاق کے بعد حقِ رجوع نہیں رہتا اسی سنگدلانہ اور کافرانہ روش کی اصلاح کے لئے نازل ہوئی تھیں۔ اب کسی شخص کے لئے اس کی گنجائش نہیں رہ گئی کہ وہ اسلام بھی لائے اور طلاق ورجوع کا لامحدود کھیل بھی جاری رکھے۔ اب اسلام نے یہ بھی ذہن نشین کرایا کہ عورتیں جانور نہیں ہیں انسان ہیں۔ ان کے بھی حقوق ہیں۔ انھیں ستانا جرمِ عظیم ہے۔ انھیں طلاق دینا انتہائی سنجیدہ وجوہ کی بنا پر جائز ہے نہ یہ کہ ایذا پہنچانا مقصود ہو۔ تمھیں حقِ رجوع صرف دو طلاقوں تک باقی رہتا ہے۔ تیسری کے بعد نہیں۔

یہ وہ دور تھا کہ جو بھی لوگ ایمان لائے انھوں نے اطاعتِ رسول ﷺ کا حق بھی خوب ادا کیا۔ ان میں سے معدودے چند افراد ایسے ہو سکتے ہیں جن کی اذیت پسند طبیعت میں اب بھی کوئی انقلاب نہ آیا ہو۔ انھیں ایک مستقل جماعت کا نام نہیں دیا جا سکتا اور اگر زبردستی دے بھی دیں تو قانون نے بہرحال طلاق ورجوع والے لامحدود کھیل کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ وہ بیویوں کو جو بھی اذیت پہنچا سکتے ہیں تین ماہ تک ایک ایک طلاق دے کر پہنچا سکتے ہیں یک وقت تین دیکر نہیں پہنچا سکتے کیونکہ اگر مقالہ نگاروں کے دعوے کے مطابق ایک وقت کی تین طلاقیں اس وقت ایک ہی ہوتی تھیں تو تین دے کر بھی وہ محض وہی اذیت پہنچا رہے ہیں جو ایک دے کر پہنچاتے اور اگر تین تین ہی ہوتی تھیں جب تو قصہ ہی ختم ہوا۔ اب نہ وہ رجوع کر سکتے ہیں نہ عورت کو لٹکا سکتے ہیں عدت پوری ہونے پر عورت آزاد ہے کہ جہاں چاہے جائے اور جس سے چاہے نکاح کرے۔

خلاصہ یہ کہ مہکل صاحب نے اپنے مسلک کی حمایت میں صحابہؓ و تابعین کے اندر ایک بدگہر قسم کی جماعت فرض بھی کی تو ان کے استدلال کو کوئی قوت نہیں پہنچی بلکہ وہ مضحکہ خیز حد تک تناقض کا شکار رہا۔ بالیقین ہمارے محترم مولانا اکبر آبادی بھی اور مولانا شمس پیرزادہ بھی اس

تناقض اور بھونڈے پن کا ادراک فرمالیتے اگر جانبداری کے بجائے معروضی اور حقیقت پسندانہ انداز میں مطالعہ و تفکر سے کام لیتے۔

غور کیا جائے تو ہیکل صاحب کی قیاس آرائی کا کوئی منطقی جواز ایک اور ہی شکل میں نکل سکتا ہے۔ وہ یہ کہ صدر اول میں یعنی دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ میں ایک وقت کی تین طلاقیں تین ہی قرار پاتی ہوں اور عاشق مزاج مسلمان اپنی من موہنیوں اور محبوباؤں کے مطالبے پر کھٹ کھٹ بیویوں کو بیک وقت تین طلاقیں دے کر فوری وصال سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ اب حضرت عمرؓ اس المناک صورتِ حال سے متأثر ہو کر یہ حکم جاری کریں کہ آج سے ایک وقت کی متعدد طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی اور کوئی بیوی اپنے شوہر پر بغیر اس کے حرام نہ ہو گی کہ شوہر طریقِ سنت کے مطابق ایک ایک ماہ بعد ایک ایک طلاق دے۔

اس حکم کا مفاد ظاہر ہے۔ اس سے عشاق کی بھی ہمت شکنی ہوتی کہ وہ ہاتھوں ہاتھ طلاقِ مغلظہ وارد نہیں کر سکتے اور من موہنیوں کو بھی صدمہ پہنچتا کہ اب کم سے کم تین ماہ تک تو وہ یہ توقع نہیں رکھ سکتیں کہ بقول ہیکل صاحب تنہا عشاق کے دلوں پر قابض ہو جائیں گی۔ مظلوم بیویوں کی خیر خواہی کا پہلو اس میں یہ نکلا کہ ممکن ہے تین مہینوں کے اندر عاشق مزاج شوہروں کی عقل پر پڑے ہوئے پتھر کچھ اِدھر اُدھر سرک جائیں اور وہ بیویوں کو بے خانماں کرنے سے باز آجائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مفروضہ من موہنیوں کو تین ماہ کی طویل مدت میں کچھ کنوارے عاشق مہیا ہو جائیں جن سے وہ نقد انقد شادی رچالیں اور جو شوہر صاحبان ان بیوفاؤں کے مطالبے پر تین طلاقوں کا کورس پورا کر رہے تھے وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی بیویوں ہی پر قناعت کر جائیں۔

تفنن نہیں ہے نہ پیروڈی ہے۔ سنجیدگی سے سوچیے کہ قیاس و منطق سے مطابقت اس شکل میں ہے یا اُس شکل میں جو ہیکل صاحب نے فرض کی۔ حضرت عمرؓ تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کا حکم نافذ نہیں کر رہے ہیں بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے لہٰذا اس کی وہ وجہ ہرگز نہیں ہو سکتی جو ہیکل صاحب نے تجویز کی۔ حضرت عمرؓ ان لوگوں میں نہیں ہو سکتے جو سنگدل عشاق اور بدکار حسیناؤں کیلئے آسانیاں مہیا فرمائیں اور ایسا حکم نافذ کریں جس سے ظلم و شقاوت کو شہ ملے۔

بات منقح ہو گئی۔ پھر بھی ہیکل صاحب کا ایک فقرہ اور ہے جو مزید تنقیح میں معاون ہو گا۔ ورق اُلٹ کر دیکھئے۔ انھوں نے فرمایا:۔

"حضرت عمرؓ نے دیکھا جو شخص نکاح کی گرہ کو اتنا بے حقیقت سمجھتا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالتا ہے وہ بے حس اور بادہ گو انسان ہے اور اسے اس بے حسی اور یادہ گوئی سزا ملنی چاہیئے۔"

اس بات کو جانے دیجئے کہ جب ہیکل صاحب کے دعوے کے مطابق اس وقت تک ایک وقت میں ایک ہی طلاق پڑا کرتی تھی چاہے کتنی ہی دے ڈالی جائیں تو آخر حضرت عمرؓ کو اس سے کیا اور کیوں دلچسپی ہو سکتی تھی کہ فلاں صاحب بیک وقت کتنی طلاقیں دے رہے ہیں۔ ان تک تو اس کی اطلاع بھی نہ پہنچنی چاہیئے تھی کہ کن لوگوں نے ایسی حرکت کی۔ اطلاع پہنچانے کا محرک کسی کے لئے اگر کوئی ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا کہ تین طلاقیں بیک وقت دینے سے تین ہی پڑ جائیں اور مطلقہ کا کوئی ہمدرد یا طلاق دینے والے کا کوئی دشمن خلیفۂ وقت کے آگے احتجاج کرنے پہنچے کہ دیکھئے فلاں صاحب نے خلافِ سنت طریقہ اختیار کر کے زوجہ کو بے خانماں کر دیا۔ رجوع کی بھی گنجائش نہ چھوڑی۔ انھیں کوئی سزا دیجئے۔ لیکن جب تین طلاقیں بیک وقت

واقع ہی نہ ہوتی تھیں تو خلیفہ کے آگے فریاد لے جانے کا داعیہ کہاں پیدا ہو سکتا تھا اور اتفاقاً اگر خلیفہ کو اطلاع مل ہی جاتی تو اس کا مطلب ان کیلئے اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ فلاں شخص نے بیوی کو ایک طلاق دیدی۔ ایک طلاق بہرحال مرد کا شرعی حق ہے لہذا کیا وہ اس پر غصہ کرتے کہ یہ حق کیوں استعمال کیا گیا۔

یہ سب نظر انداز کر کے مان ہی لیجئے کہ حضرت عمرؓ غصے میں بھر گئے ہیں اور بے حس اور یاوہ گو عشق بازوں کو سزا دینا چاہتے ہیں تو کیا سزا اسی کا نام ہے کہ رائج و نافذ قانون کے تحت یہ عشق باز وصالِ محبوب کی جس منزل پر تین ماہ بعد پہنچ سکتے تھے اس منزل پر حضرت عمرؓ انھیں ہاتھوں ہاتھ پہنچا دیں اور فرمائیں کہ نالائقو جاؤ ایک ہی وقت کی تین طلاقیں آج سے تین مان لی گئیں۔ تم اپنی من موہنیوں کو اطلاع دو کہ وہ ابھی سے تمہارے دلوں پر تنہا قابض ہو جانے کی پوزیشن میں آگئی ہیں اور مطلقہ بیوی یا بیویوں سے تمہارے رجوع کا امکان خلیفۂ وقت نے از راہِ مہربانی ختم کر دیا ہے۔

یہ اگر سزا ہے اے بزرگو تو پھر جزا اور انعام آخر کسے کہتے ہیں!

واقعۃً سزا اگر ہو سکتی تھی تو یہ ہو سکتی تھی کہ بیک وقت زبان متعدد طلاقیں دینے کے فعلِ عبث پر دو چار دُرّے رسید کرتے اور فرماتے کہ تین طلاقیں تو بہرحال تین ماہ بعد ہی قابلِ تسلیم ہوں گی فی الحال تمہاری بیویاں تم پر حرام نہیں ہوتی ہیں۔ اور کسی من موہنی کو بھی طلب فرما کر ڈانٹ پلاتے کہ تم اگر شریفانہ طور پر کسی شادی شدہ مرد کی بیوی بننا ہی چاہتی ہو تو یہ کیا ذلیل حرکت ہے کہ اس کی بیوی کو طلاقِ مغلظہ دلوانے پر تلی ہوئی ہو۔ شریعت نے منع تو نہیں کیا ہے کہ تم دوسری یا تیسری یا چوتھی بیوی کی حیثیت سے زندگی گذار لو۔ گھروں کو اُجاڑنے اور بے قصور بیویوں کو بیوہ بنانے والے شرائط پیش کرنے پر ہم تمہاری چمڑی بھی اُدھیڑ سکتے ہیں، کیونکہ معاشرے کی شیرازہ بندی اور ظلم و آوارگی کی حوصلہ شکنی ہمارے فرائضِ شرعیہ میں داخل ہے۔

اگر حضرت عمرؓ ایسا کرتے تو یہ ایک معقول بات ہوتی اور ان کی ذات والا صفات سے ایسی ہی معقولیت اور عدل پروری کی اُمید کی بھی جا سکتی تھی۔ لیکن ہمارے بزرگ ظاہر فریب الفاظ کی آڑ میں غالباً نادانستہ طور پر ان پر کیچڑ اچھال گئے ہیں۔ ایسی بھول چوک کی نفسیاتی وجہ بس یہی ہے کہ وہ خالص علمی و تحقیقی نقطۂ نظر کے بجائے اپنی آراء کی وکالت کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔

دوسری مثال

محترم مولانا اکبر آبادی نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل فرمایا:۔

> "میرے پاس جب کبھی محلّل اور محلل لہٗ[1] لائے جائیں گے میں ان دونوں کو رجم کرا دوں گا۔"

ہمارا ناچیز خیال ہے کہ اس قول کا اس بحث سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ ایک وقت کی تین طلاقیں تین ہوتی ہیں یا ایک۔ حلالہ ہر حال میں ملعون و مردود ہے خواہ اس کی نوبت ایک وقت میں دی ہوئی تین طلاقوں سے آئی ہو یا تین ماہ میں دی ہوئی تین طلاقوں سے۔ لیکن مولانائے محترم نے اسے بھی اپنے لئے بنائے استدلال بنالیا ہے۔ یہ قول نقل کرنے کے بعد وہ رقمطراز ہیں:۔

> "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عرب سوسائٹی میں تحلیل کا رواج ہوتا جا رہا تھا اور اسی رواج کے زیر اثر لوگوں نے عجلت پسندی کی راہ سے بیک وقت تین طلاقیں دینے کا طریقہ اختیار کر لیا ہوگا۔"

---

[1] تین طلاقیں دینے کے بعد شوہر مطلقہ کا نکاح کسی شخص سے بہ این مقصد کرائے کہ وہ رات گذار کر اسے طلاق دیدے تو اس شخص کو محلّل کہیں گے اور شوہر کو محلّل لہٗ۔

گے پڑھنے سے پہلے ان فقروں کو سمجھنے کی کوشش کرلی جائے۔
تحلیل (یعنی مطلقہ کا کسی اور سے نکاح کرکے طلاق
نے اور پھر شوہر اول سے نکاح کرنے) کی نوبت تین طلاق
ے بعد ہی آسکتی ہے۔ مکتبی زبان میں یوں کہئے کہ حلالہ موقوف
ہے تین طلاقوں پر۔ اگر کسی سوسائٹی میں واقعۃً تحلیل کے
قعات کثرت سے پیش آرہے ہوں تو یہ نتیجہ ہوگا اس
ت کا کہ لوگ اپنی بیویوں کو بہ کثرت تین طلاقیں دے
ہیں مگر مولانائے محترم اس کے برعکس تین طلاقیں دینے کے
اج کو کثرتِ تحلیل کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں گویا تحلیل
لے ہے اور تین طلاقیں بعد میں۔ موقوف کا پہلے اور موقوف
ہ کا بعد میں آنا اتنا واضح البطلان ہے کہ مولانا بھی
ین سے اسے جانتے ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود ایسا
نکوس استدلال کرنا غمازی کررہا ہے کہ وہ ہر جا اور
ہ جا طریق پر اپنے موقف کی صحت تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔
گے انھوں نے فرمایا:۔

"اور ظاہر ہے یہ رواج معاشرے میں جنسی بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط کا ایک ایسا ہی بڑا ذریعہ بن سکتا ہے جیسا کہ متعہ۔ اس بنا پر جس طرح حضرت عمرؓ نے متعہ قطعی طور پر حرام قرار دیدیا ہے اسی طرح طلاق کی کثرت اور اس کے اثراتِ مابعد سے جو صورتِ حال پیدا ہوتی جارہی تھی اسی کے انسداد کی شکل یہ نکالی کہ ایک طرف ایک ہی مجلس میں اور دفعۃً دی گئی تین طلاقوں کا حکم طلاقِ مغلظہ قرار دیدیا اور دوسری جانب تحلیل کو بالکل ممنوع اور حرام قرار دیا۔"

ہمیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے یہاں بھی مضمراتِ
م پر غور نہیں فرمایا ورنہ استدلال ان کے موافق نہیں
ف جارہا ہے۔
غور فرمایا جائے۔ دوسرے ہم مسلکوں کی طرح مولانا
ا یہ طے فرما چکے ہیں کہ دورِ رسالتؐ میں پھر دورِ صدیقیؓ
ا اور خلافتِ عمرؓ کے ابتدائی دو سالوں میں بھی تین طلاقوں
کا وقوع طریقِ سنت میں محدود تھا یعنی ایک ایک ماہ
بعد ایک طلاق۔ اگر کوئی بیک وقت ایک سے زیادہ دیتا
تھا تو زیادہ بے کار جاتی تھیں اور ایک ہی طلاق واقع
ہوتی تھی۔ اب اگر اس دَور کے بارے میں وہ یہ قیاس
قائم کرتے ہیں کہ تحلیل کا رواج عام ہوتا جارہا تھا تو انھیں
یہ بھی ماننا ہوگا کہ تحلیل کی نوبت اِس جلد بازی کی بنا پر
نہ آتی ہوگی کہ شوہر کو غصّہ آیا اور اس نے فرطِ غضب
میں ایکدم تین طلاقیں دے ڈالیں۔ یہ تو اِن کے دعوے
کے مطابق ایک ہی طلاق پڑتی جس سے تحلیل کی ضرورت
پیدا نہیں ہوتی لہذا یہی تصور کیا جاسکتا ہے کہ لوگ ایک
ایک ماہ بعد طلاقیں دے کر تین کا عدد پورا کرتے ہوں گے۔
ایسی صورت میں تحلیل ایک رواج کی صورت اختیار
کرلے یہ ناممکن ہے۔ تحلیل کی مکروہ صورت کو پسند کرنا
ثمرہ ہوتا ہے پچھتاوے کا اور پچھتاوا اسی وقت ہوا کرتا
ہے جب ہم جلد بازی اور فرطِ جذبات میں دفعتاً اپنا
نقصان کر بیٹھیں۔ لیکن جو لوگ تین ماہ کی طویل مدت میں
تین طلاقیں دیں وہ نہ تو جلد باز ہوں گے نہ جذبات سے
مغلوب۔ انھوں نے تو پوری طرح سوچ سمجھ کر سنجیدگی
کے ساتھ یہ کام کیا ہوگا۔ اب اس کا امکان شاذ ہی ہے
کہ وہ پھر اس مطلقہ کو زوجہ بنانے کے لئے اتنے مشتاق
ہوں کہ تحلیل کا انتظام کراتے پھریں۔ اس طرح کے شاذ
امکانات اتنے کثیر الوقوع بن جائیں کہ ان پر رواج کا
لفظ صادق آسکے قطعاً بعید از قیاس ہے۔
لہذا دو میں سے ایک بات تسلیم کرنی ہوگی۔ یا تو
یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ تحلیل کا رواج عام ہوگیا تھا یا پھر
یہ دعویٰ غلط ہے کہ صدرِ اول میں خلافِ سنت طریقے
سے تین طلاقیں واقع نہیں ہوتی تھیں۔ تحلیل کی کثرت
کو تسلیم کرلینا لازماً یہ ثابت کرتا ہے کہ جلد بازی میں دی
ہوئی تین طلاقیں تین ہی قرار پاتی تھیں اور اسی لئے
پچھتانے اور حلالے کرانے کے واقعات کثرت سے پیش
آتے تھے۔

ویسے بھی یہ بات عجیب وغریب ہی ہے کہ لوگ باقاعدہ تین تین مہینے کی سوچی بھی مغلظ طلاقیں دینے کے بعد بھی حلالوں کے پیچھے دوڑ رہے ہوں اور حضرت عمرؓ اس گندی صورتِ حال کا علاج یہ تجویز کریں کہ آج سے ایک وقت کی تین طلاقیں تین ہی شمار کی جائیں گی۔ یہ علاج ہوا یا بڑھاوا دینا۔ اس کا تو صریحاً یہ نتیجہ ہوگا کہ تین طلاقوں کے واقعات بہت بڑھ جائیں اور اسی نسبت سے حلالوں میں اضافہ ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہیکل صاحب یا ان کے ہمرائے حضرات نے قیاس وتخیل کے ذریعہ جتنی بھی توجیہات مرتب کی ہیں وہ قیاسی اور منطقی اغلاط کا لشتارہ ہیں جنھیں کوئی بھی غیر جانب دار محقق و مفکر قابل التفات نہیں سمجھ سکتا۔ ہمارے محترم مولانا اکبرآبادی اور مولانا شمس پیرزادہ بھی ان توجیہات کو دیوار پر دے مارتے اگر ایک خاص مسلک کے جذبۂ حمایت نے انکی فہم و فراست پر سایہ نہ ڈال دیا ہوتا۔

تیسری مثال

مولانا اکبرآبادی نے تحریر فرمایا:۔

"قرآن مجید میں تین طلاقوں کے بارے میں جو آیت ہے وہ اس باب میں نصِ قطعی ہے کہ طلاقِ مغلظہ اس وقت واقع ہوگی جب کہ تین طلاقیں یکے بعد دیگرے مختلف مجلسوں میں واقع کی جائیں۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ نے قرآن کی نصِ قطعی کو رد کرتے ہوئے بلا تکلف ایک نیا آرڈر جاری کر دیا اور تمام صحابہؓ بھی نصوصِ قرآنیہ کی واقفیت کے باوجود اس سے متفق ہو گئے۔

یہ مطلب اتنا خوفناک ہے کہ شعوری طور پر مولانا بھی اسے گوارا نہیں کہہ سکتے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اجتہاد نصوص کی پیروی کا نام ہے نہ کہ انھیں مسترد کرنے کا اور کوئی بھی امیر المؤمنین نص کے استرداد کا مجاز نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعتہً آیتِ قرآنی متذکرہ موقف کے لئے نصِ قطعی ہو تو ایک ہی راہ رہ جاتی ہے کہ ہم خاکم بدہن حضرت عمرؓ کو بدعتی کہیں۔ قرآن کا محرّف کہیں۔ قانونِ شریعت کا دشمن کہیں۔ اور ان کی روش پر راضی رہنے والے صحابہؓ کو بھی اس خیال کا حامل مانیں کہ قرآن کے قانون سے بڑھ کر خلیفۂ وقت کا فرمان ہے۔ العیاذ باللہ۔

مذکورہ عبارت لکھنے سے قبل ممدوح نے رقم فرمایا تھا:۔

"حضرت عمرؓ کے اس اجتہاد کو قبول عام حاصل ہوا اور تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو تسلیم کر لیا اور اس کا حکم وہی ہو گیا جو اجماع صحابہ کا ہوتا ہے چنانچہ ائمہ اربعہ کا مسلک بھی یہی ہے اور اسی پر ان کا فتویٰ ہے۔"

ممدوح نے ذرا احساس نہیں فرمایا کہ آج کے دورِ فتن میں ان کی دونوں عبارتیں مل کر کیا فسادِ مبین پیدا کر سکتی ہیں آج مغربی اساتذہ اور تعلیم جدید کے پالے ہوئے کتنے ہی مسلمان دانشور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ اسلام کے بعض اجماعی قوانین کو تبدیل کر دیں مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں بھی ان کی جارحیت اور اسلام بیزاری مشاہدے میں آچکی ہے۔ ان کے مقابلے میں ہماری سب سے مضبوط ڈھال "اجماع" ہی ہے۔ اجماع مسلّم طور پر شریعت کے مآخذ میں سے ایک مستند ماخذ ہے اور یہ بھی ہم سب مسلمانوں کا ایمان ہے کہ صحابہؓ و تابعین اور علماء و اتقیاء کسی ایسی رائے پر ہرگز اجماع نہیں کر سکتے جو قرآن یا احادیث متواترہ کی قطعی صراحتوں کے خلاف ہو۔

مگر جب مولانا اکبرآبادی جیسا صحیح العقیدہ اور معروف عالم ایک ہی سانس میں یہ بھی کہے گا کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کا تین نہ ہونا قرآن کی نصِ قطعی سے ثابت ہے اور یہ بھی کہے گا کہ دوسرے خلیفۂ راشد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس نصِ قطعی کے خلاف نہ صرف

اجتہاد کیا بلکہ بہ زور اس اجتہاد کو امت پر نافذ بھی کر دیا۔ اور تمام صحابہؓ نے بے چون و چرا اسے تسلیم بھی کر لیا جس سے یہ اجماعی مسئلہ بن گیا اور پھر امت کے مقبول چاروں مذاہب فقہیہ نے اسی پر صاد کر دیا اور فتویٰ بھی اسی پر دیا جانے لگا تو آخر ہم کس منھ سے دانشوران تحریف پیشہ سے یہ کہہ سکیں گے کہ فلاں قانون تو قرآن یا حدیث یا اجماع سے ثابت ہے لہٰذا اسے بدلنا حرام ہے۔ کیا وہ ہمارے منھ پر طمانچہ رسید نہ کریں گے کہ حضرت عمرؓ جیسے ثقہ اور راشد امیرالمومنین نے اور جملہ معروف مکاتب فقہ نے جب اسے حرام نہیں سمجھا تو تم کس کھیت کے تھوے ہو جو ہمارے منھ آرہے ہو۔

غلط ہے اے محترم بزرگ کہ نصِ قطعی کے خلاف بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہو اور غلط ہے کہ وہ چیز نص قطعی سے ثابت ہو جس کے خلاف پر صحابہؓ اور مذاہب اربعہ نے اجماع کر لیا۔ آپ کو تفسیرِ آیت پر توجہ دلانا سورج کے آگے چراغ جلانے کے مرادف ہے لیکن آپ اِس وقت ایک خاص ذہنی رو میں بہہ رہے ہیں اس لئے دینِ حق کی صیانت اور علم و تحقیق کی آبرو کے تحفظ کی خاطر ہم یہ جسارت بھی کر ہی ڈالیں گے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ	طلاقیں دو بار ہیں جن کے بعد یا تو
فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ	مطلقہ کو معروف طریقے پر روک لیا جائے
اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ	یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دیا جائے۔

یہ ہے وہ آیت جسے آپ اپنے بیان کردہ مفہوم کیلئے نصِ قطعی قرار دے رہے ہیں۔

آپ کو یقیناً علم ہوگا کہ کتنے ہی بڑے بڑے علمائے سلف نے مَرَّتَان کو یہاں اِثْنَتَان کے مرادف بھی کہا ہے یعنی طلاقیں دو ہیں جن کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔ انکی رائے ہے کہ قرآن کی مراد مرّۃً بعد مرّۃٍ نہیں ہے یعنی قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ دو طلاقیں دو مرحلوں یا دو مختلف وقتوں میں دی جانا ضروری ہیں ورنہ ایک ہی مانی جائیں گی بلکہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ رجوع کا حق صرف دو طلاقوں تک باقی رہتا ہے اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ دو طلاقیں بیک وقت دی گئی ہوں یا مختلف اوقات میں۔

بہت سے اہلِ علم کی اس رائے سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس رائے کی کوئی گنجائش آیت میں نہیں ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ مولانا شمس پیرزادہ نے بھی اپنے مقالے میں بڑی جلد بازی کے ساتھ یہ طے کر دیا کہ لغت عرب کی رو سے مرّتان کے معنی لازمی طور پر یہی ہو سکتے ہیں کہ دو طلاقیں مختلف وقتوں میں دی گئی ہوں۔ ان سے گذارش ہے کہ اس بارے میں ہماری معروضات وہ بھی غور و متانت کے ساتھ ملاحظہ فرمالیں۔

مرّتان یا مرّات کا استعمال عرب میں دونوں ہی طرح ہے۔ کبھی اس میں اختلافِ اوقات ملحوظ ہوتا ہے اور کبھی بالکل ملحوظ نہیں ہوتا۔ پہلی صورت کی مثال ضروری نہیں کہ اس پر تو اصرار ہی کیا جا رہا ہے اور ہم اس سے انکاری بھی نہیں۔ البتہ دوسری صورت کی دو مثالیں قرآن ہی سے پیشِ خدمت ہیں۔

سورۂ قصص میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا تذکرہ فرما رہا ہے جو پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لائے تھے اور جب قرآن ان پر پیش کیا گیا تو اس پر بھی ایمان لے آئے ایسے لوگوں کے لئے بشارت دی جا رہی ہے کہ انھیں دوہرا ثواب دیا جائیگا۔ اس کے لئے الفاظ یہ استعمال فرمائے گئے۔ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ (آیت ۔ ۵۴) اسی طرح سورۂ احزاب میں فرمایا گیا کہ اے نبی کی بیویو اگر تم نے کوئی بے شرمی کا کام کیا تو تمھیں دوہرا عذاب دیا جائے گا اور اگر شرم و حیا کی روش اختیار کی اور بھلے طور پر زندگی گذاری تو دوہرا اجر عطا کیا جائے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اوّلاً ضِعْفَيْنِ کا لفظ استعمال فرمایا یعنی دوگنا عذاب اور ثانیاً مَرَّتَيْنِ کا اس سے بھی مراد دوگنا اجر ہے (آیت ۳۰ و ۳۱)۔ بتایا جائے کیا ان دونوں مقامات پر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرّتین سے مراد یہ ہے کہ دو مختلف وقتوں میں اجر

غلط کیا جائے گا۔

آپ اور ہم روزمرّہ کے طریق استعمال کو دیکھ لیں۔ فرض کیجئے آپ کسی دوست کے گھر جا کر کنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔ جواب نہیں ملتا۔ پھر کھٹکھٹاتے ہیں۔ صدائے برنخواست۔ تیسری بار زور سے کھٹکھٹاتے ہیں تو دوست باہر آتا ہے۔ آپ برملا فرماتے ہیں :-

"تین مرتبہ کنڈی پیٹی ہے جب جناب تشریف لائے ہیں۔"

تو کیا ایک ہی وقت اور مجلس کے تہرے عمل کو آپ نے "تین مرتبہ" سے تعبیر نہیں کیا۔ اسی کا نام ہے ثلاث مرّات (تین مرتبہ) صرف دوبار پیٹی ہوتی تو اسے بلا تکلف مرّتان بھی کہہ سکتے اور اثنتان بھی۔ اسی طرح ایک استاد سبق کے دوران دو مرتبہ ایک فقرے کا مفہوم سمجھا چکا ہے۔ دفعتاً ایک شاگرد اسی فقرے کا مطلب پھر سے پوچھ بیٹھتا ہے تو استاد برملا کہتا ہے — "میاں دو مرتبہ تو سمجھا چکا ہوں پھر بھی تمھاری موٹی عقل میں نہیں آیا۔" دیکھئے ایک ہی وقت اور مجلس کے مکرر فعل وعمل کے لئے دو مرتبہ (مرّتین) کے الفاظ بولے گئے اور اس استعمال کو کوئی بھی اہلِ زبان غلط نہیں کہہ سکتا۔ مولانا شمس صاحب نے یہاں ایک منطقی نکتہ حوالۂ قلم فرمایا ہے :-

"اگر کوئی مثال اجتماع کی پیش کی جاسکتی ہے تو وہ اعیان کی ہوگی نہ کہ افعال کی۔ کیونکہ فعل میں زمانۂ واحد میں "مرّتان" کا اجتماع ممکن نہیں۔"

اعیان" کہہ کر مولانا نے گویا ان دو آیات کا جواب پیشگی مہیا فرما دیا جو ہم نے ابھی پیش کیں کیونکہ اجر نہ ثواب بہر حال اعیان کے قبیل سے ہے۔ لیکن وہ یہ نظر انداز فرما گئے کہ زمانِ واحد کی منطقی تعریف کیا ہے منطقی تعریف کی رو سے آپ بلا شبہ کسی شخص کے ایک وقت میں ایک ہی چانٹا مار سکتے ہیں لیکن پے درپے کئی مارے چلے جائیں تو کیا یہ منطقی استدلال قابل قبول ہو سکے گا کہ زمانِ واحد میں فعل کا تعدد ممکن نہیں لہذا چانٹا بس ایک ہی پڑا ہے۔ مولانا سوچیں کہ زید اگر بیوی سے یوں کہتا ہے کہ میں نے تجھے طلاق دی۔ میں نے تجھے طلاق دی۔ تو طلاق دینے کے فعل کا ارتکاب اس نے زمانۂ واحد میں نہیں کیا بلکہ منطقی اعتبار سے دو زمانوں میں کیا۔ پہلا زمانہ تو پہلے فقرے کے ساتھ گذر گیا۔ دوبارہ اس فقرے کو دوسرے زمانے میں دہرایا گیا۔ اس طرح وہ منطقی استحالہ اس پر لازم نہیں آتا جسے موصوف نے پیش فرمایا ہے۔

یہ بھی ایک نمونہ ہے ذہنی جانب داری کا۔ کیا وجہ ہے کہ مولانا شمس کو قرآن میں وہ دو آیتیں تو ملیں جن میں لفظ مرّات مختلف اوقات کے لئے استعمال ہوا ہے اور ان کو انھوں نے مقالہ میں درج بھی فرما دیا مگر مذکورہ بالا آیات نہ ملیں جن سے یہ دعویٰ غلط ہو جاتا تھا کہ مرّتان یا مرّات جب بھی بولا جائے گا لازماً اختلافِ وقت ملحوظ ہوگا۔ یہی بات ہماری خلش کا باعث ہے کہ ذہنی صلاحیتوں کو کسی غیر جانبدار منصف کی طرح نہیں بلکہ جانب دار وکیل کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔

بہر حال روئے سخن ہمارا مولانا اکبر آبادی کی طرف تھا۔ ان سے عرض ہے کہ جب آیت کے لفظ مرّتان کے دو مفہوم علمی اعتبار سے ممکن ہیں تو کسی ایک مفہوم کے لئے قطعیت اور نصّیت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال تو علم کلام کا ابتدائی ضابطہ ہے۔

دوسرے یہ کہ مرّتین کا مطلب "یکے بعد دیگرے" مان لینے کے بعد بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ "مختلف مجالس" کی قید آپ کہاں سے لے آئے۔ مجلسِ واحدہ طویل بھی ہو سکتی ہے اور قصیر بھی۔ قصیر ترین مجلس میں بھی کوئی فعل یکے بعد دیگرے کیا جا سکتا ہے۔ زید بیوی کو ایک طلاق دیتا ہے پھر اگلے منٹ یا دس منٹ بعد دوسری دے ڈالتا ہے۔ مجلس تو نہیں بدلی مگر کیا وقت بھی نہیں

بلا اور کیا اس پر "یکے بعد دیگرے" کا اطلاق کرنے میں کوئی مانع ہے۔ یہ تو مرّتین کے دونوں ہی مفہوموں سے صریح مطابقت ہوگئی۔ پھر آخر "اختلاف مجلس" کی بار زائد از قرآن نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ اس قید کے لئے کتنے ہی علمائے فن کے حوالے لے آئیں وہ بہرحال جتہاد و رائے کے قبیل سے ہوں گے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ذاف مجلس نصِ قطعی سے ثابت ہو رہا ہے۔

علمی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہے آیت عام ہے اور یہ بحث اس کے دائرۂ اطلاق سے خارج ہے کہ دو طلاقیں ایک مجلس میں دی گئیں یا دو مجلسوں میں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مجلس کی متعدد طلاقوں کو متعدد ہی نے پر صحابہؓ و فقہاء نے اجماع کر لیا اور جو گوناگوں دلائل نہیں اس رائے کے حق میں ملے انھیں آیت سے متصادم ہور نہیں کیا بلکہ آیت ہی کی تفسیر و ترجمانی کے زمرے ہیں رکھا۔

[…]ھی مثال

محترم نے ارشاد فرمایا۔

"طلاق حالتِ غضب میں نہیں دینی چاہیئے۔"

اس کے لئے ابن قیمؒ کی زاد المعاد کے حوالہ سے یہ حدیث نقل کی۔ لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق۔ پھر مبرّد کے الے سے بتایا کہ اغلاق کے معنی ہیں ـــ "تنگدلی، بے چینی، دری" ـــ اور یہ کہ ابن قیمؒ نے اس کے معنی غضب کے لئے یا۔ پھر ارشاد ہوا۔

"اس بنا پر اس ارشاد نبویؐ کا مطلب یہ ہوا کہ غضب اور مجبوری کی حالت میں جو طلاق دی جائے وہ طلاق ہی نہیں ہے۔ چنانچہ امام مالکؒ کا مذہب یہی ہے اور اس کی خاطر انھوں نے جو شدائد برداشت کئے ہیں وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔"

اگر بزرگِ محترم کے ذہن پر یہ جذبہ طاری نہ ہوتا کہ جس حد تک بھی ہو سکے طلاق کے وقوع کو مسترد کیا جائے تو وہ یقیناً محسوس فرماتے کہ میری یہ سطریں انتہائی مغالطہ انگیز بھی ہیں اور علمی اعتبار سے ناقص بھی۔

اُردو میں "حالتِ غضب" غصّے کی حالت کو کہا جاتا ہے۔ غصے کے بہت سے اسٹیج ہیں اور ہر اسٹیج کے لئے یہ لفظ بلا تکلف استعمال کر لیا جاتا ہے۔ لیکن محترم یقیناً جانتے ہوں گے کہ مستند فقہاء نے "غضب" کے متعدد درجات تشخیص کئے ہیں اور تصریح فرمایا ہے کہ فلاں درجے میں طلاق بے شک نہیں پڑتی اور فلاں درجے میں یقیناً پڑ جاتی ہے حتیٰ کہ امام مالکؒ ہوں یا اور کوئی مجتہد و فقیہ ایک بھی ایسا نہیں جس کا مذہب یہ رہا ہو کہ غضب کے کسی بھی درجے اور اسٹیج میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اگر یہ مذہب اختیار کر لیا جائے تب تو ہزاروں میں دس بیس طلاقیں بھی شاید نہ پڑیں کیونکہ طلاق خوشی کا سودا تو ہے نہیں یہ بالعموم حالتِ غضب یعنی غصّے ہی میں دی جاتی ہے۔ وہ حافظ ابن قیمؒ جو کہیں اپنے استاد ابن تیمیہؒ کی پیروی میں اور کہیں ذاتی اجتہاد کی بنا پر معروف ائمہ سے بلا تکلف اختلاف کرتے چلے جاتے ہیں وہ اگرچہ حدیث کے لفظ اغلاق کا ترجمہ غضب ہی کرتے ہیں مگر غضب کی تین اقسام بھی پیش فرماتے ہیں۔ شامی کتاب الطلاق میں ان کے رسالہ طلاق الغضبان سے ان کا فرمودہ نقل کیا گیا ہے۔ اس میں وہ غضب کے تین درجات میں سے صرف ایک درجے کو ایسا مانتے ہیں جس میں ان کے نزدیک طلاق ہرگز واقع نہیں ہوتی۔ دوسرے درجے کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ طلاق کا پڑنا نہ پڑنا محلِ غور ہے اور تیسرے درجے کے بارے میں ان کا فیصلہ ہے کہ لا اشکال فیہ یعنی اس درجے میں طلاق واقع ہو جانا یقینی ہے اور اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں۔

صورتِ مسئلہ جب یوں ہے تو مولانائے محترم خود انصاف فرمائیں کہ ان کی تحریر سے کیا کچھ مغالطہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ عذر عبث ہوگا کہ مقالہ اہلِ علم کی مجلس کے لئے تھا اور اہلِ علم جانتے ہی ہیں کہ غضب کا وہ اسٹیج کونسا ہوتا ہے جس میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اوّل تو آج "اہلِ علم"

بالعموم جس معیار کے پائے جارہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ پھر سمیناروں میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی کہ غیر اہل علم سامعین حاضر مجلس نہ ہو سکیں۔ علاوہ ازیں یہ توقع کرنے کے معقول قرائن موجود تھے کہ مقالات منظرِ عام پر آئیں گے مستزاد یہ کہ الفاظ کے صحیح ترین استعمال اور ایک ایک لفظ کے محتاط انتخاب کی جتنی ضرورت قانونی مباحث میں ہے اور کسی مبحث میں نہیں۔ طلاق کی بحث صریحاً قانونی بحث ہے لہٰذا ہر حال میں ایک ایک لفظ کا استعمال حزم و احتیاط کے ساتھ ہونا چاہئے تھا مگر نظر یہ آرہا ہے کہ غیر محتاط اور مغالطہ آفریں الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔

تنگ دلی، بے چینی، مجبوری۔ ان میں سے ایک بھی لفظ ایسا نہیں ہے جو حدیث کے لفظ اغلاق کا صحیح ترجمان ہو نہ ان میں سے کوئی لفظ غضب کے اُس خاص درجے کی نشاندہی کرتا ہے جس میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔ تنگ دلی اور بے چینی تو یکسر خارج از بحث الفاظ ہیں۔ حیرت ہے کس طرح یہ ممدوح کے قلم سے نکل گئے۔ لفظ "مجبوری" کسی درجے میں مرادِ حدیث سے قریب ہے مگر پوری طرح نہیں۔ اُردو میں "مجبوری" بڑا وسیع الاطلاق ہے۔ زید دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے۔ عورت شرط رکھتی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دو۔ اگر نہیں دیتے تو میں تم سے نکاح نہیں کرتی۔ زید ایسا نہیں چاہتا تھا مگر شرط سے بے بس ہو کر طلاق دے ڈالتا ہے۔ اس سے آپ پوچھئے کہ بھائی بیوی کو طلاق کیوں دی۔ بغیر اس کے ہی دوسری بیوی لاسکتے تھے۔ وہ جواب دے گا۔ کیا کروں مجبوری تھی۔ عورت بغیر اس کے مان ہی نہیں رہی تھی۔

بتائیے کیا لفظ مجبوری کا اس طرح کے مواقع پر استعمال ہمارے یہاں عام نہیں ہے ــ تو کیا ایسی مجبوری میں زید کی دی ہوئی طلاق بیوی پر واقع نہ ہوگی؟

اسی طرح مجبوریوں کی بے شمار نوعیتیں ہیں جن میں طلاق بلا اختلاف پڑتی ہے اور امام مالکؒ کا مذہب بھی صحیح نقل نہیں ہوا۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ طلاقِ مکرہ واقع نہیں ہوتی۔ اسی کی خاطر انھوں نے آزمائش جھیلی تھی "مُکرَہ" وہ شخص ہے جس پر جبر کیا جائے کہ طلاق دے ڈال۔ اور جبر کی بھی مخصوص نوعیتیں ہیں جن میں امام مالکؒ کہتے تھے کہ طلاق نہیں پڑتی۔ لفظِ مجبور اگرچہ "جبر" ہی سے بنا ہے اور لغتاً مُکرَہ کا مرادف کہا جاسکتا ہے لیکن مولانا خوب جانتے ہیں اور ہر صاحبِ علم اور زبان داں جانتا ہے کہ جہاں جہاں کسی شخص کو "مجبور" کہہ سکتے ہیں ضروری نہیں کہ وہاں وہاں مُکرَہ بھی کہہ سکیں۔ یہ ایک فقہی اصطلاح ہے جو اپنے خاص حدود و قیود رکھتی ہے جب کہ "مجبور" ایک عام لفظ ہے جس کے اطلاق میں بڑی وسعتیں ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی شخص بیوی کی بدشکلی سے متنفر ہو اور طلاق دے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ کیا کروں دل سے مجبور تھا طلاق دینی ہی پڑی۔ یہاں کسی طرح ممکن نہیں کہ لفظِ مجبور کو مُکرَہ کے ہم معنی سمجھ لیا جائے چنانچہ امام مالکؒ کے نزدیک بھی اس شخص کی طلاق بلا ریب واقع ہو جائیگی۔

حاصلِ گذارش یہ کہ تفکر کے ایک مخصوص رُخ پر بہتے ہوئے مولانا یہ ایسی عبارت لکھ گئے ہیں جو عوام کے لئے حرام کے مواقع مہیا کرتی ہے اور طلاق پلاسٹک کا کھلونا بن کر رہ جاتی ہے۔

پانچویں مثال

قارئین بھولیں نہیں کہ ہم کس چیز کی مثالیں دے رہے ہیں۔ ہم اپنی اس خلش کے شواہد پیش کر رہے ہیں کہ مقالہ نگاروں نے بے لاگ علمی تحقیق کا التزام نہیں کیا بلکہ اپنی پسندیدہ رائے اور میلانِ طبع کی حمایت و وکالت میں لگ گئے۔ فی الحال ہم اس سے بحث نہیں کر رہے ہیں کہ کونسا موقف صحیح ہے اور کونسا غلط، بلکہ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ کوئی موقف اپنی جگہ صحیح بھی ہو تو اس کے لئے غلط قسم کے دلائل پیش کرنا اور مخالف دلائل کو نظرانداز کرتے چلے جانا حق شعاری اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ

نہیں ہے۔

زندگی رہی تو جملہ مقالات کے محلِ نظر گوشوں پر علمی نقد بھی ہمیں انشاء اللہ کرنا ہے لیکن موجودہ مرحلے میں صرف چند مثالیں یا نمونے ہی ہدیۂ ناظرین ہو جائیں تو کافی ہیں۔

مولانا حامد علی صاحب — جو جماعتِ اسلامی کے رکن ہیں اور ہمارے بہت بے تکلف دوستوں میں ہیں۔ ابھی انھیں دہلی سے ڈاسنہ بھی کھینچ لے گئے تھے جہاں جماعت کے میرٹھ ڈویژن کا اجتماع تھا اور پہلی شب مشاعرے کے لئے مخصوص تھی۔ ان کا مقالہ سب سے طویل اور عالمانہ ہے۔ بڑی محنت سے انھوں نے بہت سا مواد جمع کر دیا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے زبانی بھی انھیں جتلا دیا تھا ان پر بھی بے لاگ تحقیق کے بجائے اپنی ایک قائم شدہ رائے کی وکالت کا جذبہ اس حد تک طاری ہے کہ بعض مقامات پر وہ بات کی پچ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پانچویں مثال ہم ان کے ہی مقالے سے پیش کریں گے۔

مشہور حنفی فقیہ اور مفسرِ قرآن ابوبکر جصّاص رحؒ کے زمودات پر شرح و بسط سے گفتگو کرتے ہوئے وہ مرحلہ آتا ہے جہاں جصاص اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ تم جب ایک وقت میں تین طلاقیں دینے کو گناہ کا کام سمجھتے ہو تو یہ فیصلہ کیوں دیتے ہو کہ وہ واقع ہو جائیں گی۔ تمھیں کہنا چاہیئے کہ اس حرکت سے آدمی چونکہ گناہگار ہوتا ہے اس لئے تین طلاقیں واقع نہیں ہوتیں۔

ان کا جواب یہ ہے کہ دیکھو اپنی بیوی کو ماں کہہ دینا جھوٹ (زور) ہے اور اللہ تعالیٰ قرآن میں صاف فرما رہا ہے کہ جو لوگ ایسا قول کرتے ہیں وہ معصیت اور جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ قرآن یہ بھی واضح کر رہا ہے کہ یہ کارِ گناہ بے اثر اور کالعدم نہ ہوگا بلکہ اپنا کام کر جائے گا اور جب تک شوہر کفارہ ادا نہ کرلے بیوی سے صحبت ممنوع رہے گی کفارہ بھی اسی جگہ قرآن نے بتا دیا ہے کہ یا تو غلام آزاد کرے یا دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

جصاص کا یہ جواب اتنا مضبوط تھا کہ غیر جانبدار ذہن کو اس پر ٹھٹک جانا چاہیئے تھا اور اپنی بات پر اڑے نہیں رہنا چاہیئے تھا لیکن مولانا حامد علی نے محض پیچھا چھڑانے کے انداز میں ذیل کی جوابی تقریر حوالۂ قلم کی:۔

"قرآن مجید نے جس بات کو منکر اور زور کہا ہے وہ یہ ہے کہ بیوی کو ماں کہا جائے یہ ایک ایسی بات ہے جو صریح عقل کے مطابق ہے اس کے باوجود عرب میں یہ طریقہ عورت کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا تھا۔ قرآن مجید نے اس طریقے کو ممنوع نہیں قرار دیا بلکہ مشروع طریقے پر اسے باقی رکھا۔ اگلی آیات میں اس کے احکام بیان کئے اور ان سب کو حدود اللہ سے تعبیر کیا اور ان اللہ لعفوّ غفور سے یہ بات واضح کر دی کہ اس میں معصیت کا جو پہلو ہے اللہ اسے معاف کرتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اللہ نے رجوع اور تلافیِ مافات کا طریقہ بتایا اور وہ عورت جو عربِ جاہلیت کے رواج کی رو سے حرام تھی اللہ کے حکم سے اس کے حلال ہونے کا راستہ نکل آیا۔ صورتِ زیرِ بحث میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ عربِ جاہلیت میں نہ طلاق کی کوئی حد تھی نہ رجوع کرنے کیلئے طلاق کی کوئی تعداد تھی۔ اسلام نے طلاق اور رجوع دونوں کے احکام دیئے اور یہ بتایا کہ طلاق ایک مرتبہ میں ایک ہی دینا چاہیئے۔ دو بار طلاق دینے تک رجعت کا حق باقی رہتا ہے اور تیسری بار طلاق دینے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ ایک بار میں تین طلاق دینا غیر مشروع اور معصیت ہے اب سوال یہ ہے کہ جو شخص ایک بار میں تین طلاق دینے کا غیر مشروع طریقہ اختیار کرتا ہے اس کا حکم کیا ہے؟ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

واقع ہوئی تو کتنی؟ اس کی عورت اس پر حرام
ہوئی یا رجعت کی گنجائش باقی ہے؟"

اہلِ نظر انصاف فرمائیں کہ اس لمبی تقریر میں کیا جصّاص کے استدلال کی کوئی کاٹ واقعی موجود ہے۔ مولانا حامد علی معمولی فہم کے آدمی نہیں۔ وہ اگر کسی اور کے یہاں اس طرح کی عبارت آرائی دیکھتے تو فوراً پکار اٹھتے کہ لکھنے والے نے یا تو جصاص کے استدلال کو سمجھا ہی نہیں اور کلام و منطق کے آداب سے وہ آشنا ہی نہیں یا پھر دانستہ الفاظ کی ریل پیل سے استدلال کو چٹکیوں میں اڑا دینا چاہتا ہے۔

ایک وقت کی تین طلاقیں بلاشبہ تین ہوتی ہیں۔ یہ مذہب ابوحنیفہؒ کا بھی ہے اور شافعیؒ کا بھی۔ فرق اتنا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک تو بیک وقت تین طلاقیں دینے والا گناہ گار بھی نہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک گناہگار ہے۔ جصّاص گناہگار ہونے کے وجوہ بیان کرتے ہیں۔ کہنے والا اس پر کہتا ہے کہ جب یہ حرکت گناہ ہے تو اسے آپ مؤثر بھی نہ مانئیے فتویٰ دیجئے کہ ایک ہی طلاق پڑے گی تین اس لئے نہیں پڑیں گی کہ بیک وقت تین دینا گناہ ہے۔ خلاف سنت ہے۔

جصّاص عرض کرتے ہیں کہ بھائی قانون میرے بنانے کی چیز تو نہیں ہے۔ میں کیسے فتویٰ دوں جب کہ متعدد مثالیں اللہ اور رسولؐ کے یہاں ایسی دیکھ رہا ہوں کہ فعل اگرچہ گناہ ہے مگر مؤثر ہے۔ جیسے مثلاً حیض میں طلاق دینا گناہ ہے مگر اللہ کے رسولؐ بتاتے ہیں کہ وہ واقع ہوجاتی ہے اسی طرح بیوی کو ماں کہہ کر خود پر حرام کرلینا گناہ ہے مگر اس گناہ کی تاثیر قرآن میں صریحاً مذکور ہے۔ بیوی واقعی حرام ہوجاتی ہے اور اس حرمت کو دور کرنے کے لئے متعینہ کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح تین طلاقوں کا معاملہ ہے کہ بیک وقت دینا ہے تو بدعت اور خلاف سنت مگر تاثیر ان کی بہر حال زائل نہیں ہوتی اور رجوع نہیں کیا جاسکتا۔

اس قوی ترین استدلال کو مولانا حامد علی صاحب جس طرح چٹکیوں میں اڑا رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کو رد کرنا اسی صورت میں ممکن تھا جب کہ مولانا مضبوط دلائل سے یہ قاعدہ ثابت فرما دیتے کہ جو فعل شرعاً گناہ ہو وہ مؤثر بھی نہیں ہوگا اور اس پر احکام متفرع نہیں ہوں گے مگر اس محوری نقطے پر نگاہ جما کر گفتگو کرنے کے بجائے وہ غیر ضروری گوشوں کی طرف دوڑ گئے ہیں۔

یہ کہدینا کہ صورتِ زیرِ بحث میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے کوئی منطقی معنویت نہیں رکھتا۔ یہ کہکر جو تفصیلات طلاق کے بارے میں موصوف نے پیش کی ہیں وہ برعکس ہونے کا ادنیٰ بھی ثبوت نہیں۔ بس اس کا ثبوت ہیں کہ طلاق اور ظہار (بیوی کو ماں بہن کہنا) دو الگ الگ مسئلے ہیں جس طرح نماز اور زکوٰۃ دو الگ الگ مسئلے ہیں۔ اس امرِ واقعہ کا آخر منکر کون ہے جو ثبوت آرائی کی ضرورت پڑے۔

بیوی کو ماں کہنا صریح جھوٹ تھا اور جھوٹ کے گناہ ہونے میں کیا شک ہے پھر قرآن نے اسے منکر کہہ کر اور بھی تصریح اس کے مکروہ و مذموم ہونے کی کردی اب جب مولانا یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن نے اس طریقے کو ممنوع قرار نہیں دیا تو یہ در اصل یہ تسلیم کرنا ہے کہ جو فعل فی نفسہٖ گناہ اور منکر ہو اسے اللہ بھی مؤثر ضرور قرار دیتا ہے۔ اگر وہ مؤثر نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا کہ اہلِ عرب بیوی کو ماں کہہ کر صریح جھوٹ بات کہتے ہیں لہٰذا اسے بے نتیجہ اور عبث اور غیر مؤثر سمجھو۔ اس سے زن و شوہر کے تعلق کا جواز قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ تو صاف کہہ رہا ہے کہ یہ اپنا اثر کر گیا۔ اب تم اس اثر کو زائل کرنے کے لئے فلاں کفارہ ادا کرو۔ نہیں کروگے تو جنسی تعلق کا معطل شدہ جواز بحال نہ ہوگا۔

ٹھیک اسی طرح طلاق کا معاملہ سمجھیئے۔ یہ طلاق رشتۂ نکاح کو کاٹ دینے کا سبب قرار دی گئی۔ پھر از راہِ بندہ نوازی یہ رعایت فرمائی گئی کہ ایک یا دو طلاقوں

تک تم رجوع کر سکتے ہو اور تین طلاقوں کے بعد بھی دوبارہ نکاح حلال ہو سکتا ہے اگر یہ مطلقہ کسی اور کی زوجیت میں آکر پھر بیوہ ہو جائے۔ اب ایک شخص یک وقت تین طلاقیں دیتا ہے تو امام شافعیؒ تو اسے گناہ بھی نہیں مانتے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا گناہ ہونا نصِ قطعی سے ثابت نہیں۔ مگر احناف متعدد دلائل کی بنا پر اسے گناہ مانتے ہیں۔ اب کیا گناہ ہونے کے باوجود اسے اسی طرح مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہونا چاہیئے جس طرح بیوی کو ماں کہنا کذبِ صریح ہونے کے باوجود مؤثر ہوا۔ اس کے بارے میں تو کوئی ایک بھی فقیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ قولِ مُنکر و مذموم نہیں ہے۔ پھر بھی اس کا زوجین کے تعلق پر اثر انداز ہونا مسلّم رہا تو آخر تین طلاقوں کے یکبارگی دینے کا فعل غیر مؤثر کیسے رہ سکتا ہے جب کہ اس کا گناہ ہونا متفق علیہ بھی نہیں ہے۔

مولانا نے انّ اللہ لعفوٌ غفور سے یہ تأثر دینا چاہا ہے کہ بیوی کو ماں کہنا تو دراصل گناہ ہی نہ رہا، کیونکہ اس کے معصیتی پہلو کو اللہ معاف فرما رہا ہے لہٰذا اس کا مؤثر ہونا طلاقِ ثلاثہ والے فعل کی نظیر نہیں بن سکتا کیونکہ اس کی معافی کا کوئی اعلان نہیں ہوا ہے۔ مگر یہ جواب کئی اعتبار سے لاحاصل ہے۔ ایک یوں کہ آیت بیانیہ ہے اور فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ بیویوں کو ماں کہہ کہہ کر اپنے اوپر حرام کرتے رہے ہیں وہ اگرچہ کذبِ صریح کے مرتکب ہوئے ہیں لیکن اللہ بہت شفیق اور بخشش والا ہے اس لئے انھیں معاف کرتا ہے۔ اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آئندہ بھی جو لوگ یہ حرکت کرتے رہیں گے وہ پیشگی معاف کر دیئے گئے۔ پچھلوں کا قصور تو اس لئے معافی کے لائق ٹھیرا کہ انھیں دین کا علم پہنچا ہی کب تھا اب اللہ کا آخری رسولؐ تنزیلِ وحی کے ساتھ ساتھ انھیں ہر طرح کی تعلیم دے رہا ہے لہٰذا ان کا قبولِ اسلام کر لینا اس کا متقاضی ہے کہ پچھلے قصوروں کو معاف کر دیا جائے۔ یہ طے کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ بیوی کو خود پر حرام کرنے کا یہ طریقہ آج کے بعد سے بے عیب اور خالی از کراہت طریقہ ہو گیا جس پر اللہ کے یہاں گرفت ہو ہی نہیں سکے گی۔ یہ سمجھ لینا کہ اللہ نے اس کی ایک مشروع شکل طے فرما دی ہے اس لئے جھوٹ جھوٹ نہ رہا اور منکر معروف بن گیا محض مغالطہ ہے۔ جو تفسیر یا علم کلام کے کسی ضابطے کے تحت نہیں آتا۔

جو خطائیں سہواً سرزد ہوں ان کا کفارہ ادا کرنے کے بعد تو یہ اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے یہاں پکڑ نہیں ہو گی۔ جیسے حج کی متعدد جنایتیں، یا جیسے کسی معقول عذر کی بنا پر قسم پوری نہ کرنا۔ لیکن جو گناہ ارادۃً کئے جائیں ان کا قانونی کفارہ ادا کرنے کے بعد بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ کے یہاں کی باز پرس اب نہ ہو گی۔ وہ عفو و غفور ہے تو منتقم و قہار بھی ہے۔ بیوی کو ماں کہنا جب قرآن کی صراحت کے مطابق قابلِ نکیر فعل ہے تو یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کوئی مسلمان اس کا مرتکب ہوتا ہے تو اگرچہ کفارہ ادا کرنے کے بعد بیوی اس کے لئے حلال ہو جائے گی مگر یہ گارنٹی نہیں ہے کہ عند اللہ وہ قطعاً مسئول نہ ہو۔ کتنے ہی صحابہ کی بعض غلطیوں پر قرآن میں سرزنش آئی ہے اور پھر انھیں معافی دیتے ہوئے اللہ نے ایسے ہی الفاظ نازل فرمائے ہیں۔ اللہ غفور ہے۔ رحیم ہے۔ رؤف ہے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اب کوئی بھی ان غلطیوں کا ارتکاب کرتا رہے احتساب سے بچا رہے گا۔ ظاہر ہے کہ بالکل نہیں تو پھر ظہار کے بارے میں اللہ کا کچھ قانونی احکام نازل کر دینا بھی یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس حرکت ناشائستہ کی قباحت ختم ہی ہو گئی۔

دوسرے یوں کہ ان اللہ لعفوٌ غفور کا مطلب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بیوی کو ماں کہہ کر اگرچہ تم نے ایسے فعل کا ارتکاب کیا ہے جس کے بعد تمھاری بیوی مرتے دم تک تمھارے لئے حرام رہے تو بے جا نہیں لیکن یہ اللہ کی رحمت و شفقت ہے کہ اس نے محض کفارہ ادا کر دینے پر

انھیں پھر سے قیامِ تعلق کا موقع دے دیا۔

یہ مطلب لینے میں کوئی نحوی قاعدہ مانع نہیں۔ کوئی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ زیادہ بہتر اور دل لگتا مطلب تو وہی ہے جو مولانا حامد علی صاحب بیان کر رہے ہیں۔ چلئے تسلیم مگر دوسرے مطلب کا احتمال بہرحال مسلم لہٰذا مولانا کا استدلال مشکوک رہے گا۔ اس میں قطعیت نہ آ سکے گی۔

رہا یہ کہنا کہ ــــ "دوسری اہم بات یہ ہے کہ اللہ نے رجوع اور تلافی مافات کا طریقہ بتایا۔" تو اس سے بھی جصاص کے استدلال پر حرف نہیں آتا۔ کیا طلاق کے بعد اللہ نے رجوع اور تلافیِ مافات کا طریقہ نہیں بتایا۔ یہاں تک کہ تین طلاقوں کے بعد بھی وہ یہ نہیں فرماتا کہ اب زندگی بھر کوئی صورت تعلق کی ممکن ہی نہیں حلالہ اس کو ممکن بنانے والا قانون عطا فرما دیا ــ حالاں کہ ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ بعض صورتوں میں ایک عورت کسی مرد کے لئے ہمیشہ کو حرام ہو جاتی ہے۔ جیسے ساس یا بیوی کی بیٹی۔ اللہ چاہتا تو مغلظ طلاق پانے والی عورت کو بھی اسی زمرے میں رکھ دیتا مگر اس نے تلافی کا امکان باقی رکھا۔ لہٰذا کیا جوہری فرق ہوا ظہار و طلاق کے زیرِ بحث پہلوؤں میں۔

کتنا ہی گہرے اتر جائیے اگر ذہن واقعی غیر جانب دار ہے تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مولنا حامد علی کی منقولہ تقریر جواب حقیقتاً جواب نہیں ہے بلکہ اس تحت الشعوری خواہش کی مظہر ہے کہ فریقِ ثانی کو ہر قیمت پر ضیق میں ڈال دیا جائے اور اپنے موقف کو برحق یا قوی ثابت کر کے چھوڑا جائے۔

کے اس فتوے کا ماخذ کیا ہے۔"

یہ فقرہ صحیح طور پر ایک ایسی ذہنی جھلاہٹ کا غماز ہے جس کا علمی بردباری سے جوڑ نہیں۔ تمام صحابہؓ، جملہ ائمہ اور کثیر ترین علمائے خلف اس فتوے کے علمبردار ہیں۔ ہزاروں صفحات پر اس کی بحثیں پھیلی ہوئی ہیں۔ بال بال کی کھال نکالی جا چکی ہے پھر بھی اگر ہمارے دوست کی نوکِ قلم پر یہ سوال اُبھر آتا ہے تو تجاہلِ عارفانہ کے سوا اسے کیا کہیں گے حالانکہ علمی مباحث میں تجاہلِ عارفانہ غیر سنجیدگی کا نام ہے۔ اس طرح کا سوال ایک چوکہ ہے جو فریقِ ثانی کے لگایا جا رہا ہے۔ ایک چٹکی ہے جو قدرے مذاق کے انداز میں لی جا رہی ہے۔ وہی مثل ہوئی کہ رات بھر روئے اور ایک بھی نہ مرا۔ فقط ایک مرا تھا وہی صبح اُٹھ کر بھاگ گیا۔

موصوف مزید فرماتے ہیں:۔

"ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہ حکم کم از کم قرآن سے ثابت نہیں ہے۔"

چلئے مان لیا مگر کیا قرآن سے اس کے خلاف ثابت ہے؟ کیا قرآن میں کہیں یہ آیا ہے کہ تین طلاقیں ایک مجلس میں دو گے تو وہ نہیں پڑیں گی۔ بہت سے بہت لفظ مرّتان سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دو طلاقیں دو مرتبہ میں ہونی چاہئیں۔ اس پر ہم بحث کر چکے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ بہتیرے علماءِ سلف اسے اثنتان کے معنی میں لیتے ہیں اور خود قرآن کی دو آیات میں یہ لفظ دوہرے اور دُگنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے نہ کہ دو مرتبہ کے مفہوم میں۔ تاہم "دو مرتبہ" ہی ترجمہ فرمائیے تو اس سے دو مجلس نکالنا بہرحال آپ کا اضافہ ہی ہوگا نہ کہ بیانِ قرآنی۔ دو بار طلاق کا جملہ دوہرایا جائے تو کیا وجہ ہے کہ اس پر دو بار (مرّتان) کا اطلاق نہ ہو جبکہ پہلا جملہ منھ سے نکلتے ہی ماضی کا سرمایہ بن گیا اور دوسرا جملہ زمانۂ حال میں دہرایا گیا۔ واقعہ یہ ہے ایک وقت کی تین طلاقوں کا ایک ہونا تو قرآن کی کسی آیت سے

چھٹی مثال

یہیں کچھ سطور بعد محترم دوست لکھتے ہیں:۔

"جو لوگ ایک بار میں تین طلاق کو طلاقِ مغلظہ بائنہ قرار دیتے ہیں سوال ان سے یہ ہے کہ ان

اشارۃً بھی مستفاد نہیں بلکہ تعین ہونا اشارۃً نکلتا ہے جیسا کہ ہمارے لفظی تجزیئے سے ظاہر ہے اور اجماعِ صحابہ اس اشارے کی صحت کا مضبوط قرینہ ہے۔

اب ایک بار پھر محترم موصوف جصاص کا رد بایں طور فرماتے ہیں:-

"اس سلسلہ میں ظہار کی مثال دینا صحیح نہیں ہے، ظہار کے قول منکر و زور ہونے کے باوجود عرب جاہلیت کی رکاوٹوں کو اللہ نے دور فرما دیا اور حلالِ عورت کو حلال کرنے کا طریقہ اہلِ ایمان کو بتایا مگر یہ حضرات طلاق کے سلسلے میں اس سہولت کو جو قبل از اسلام لوگوں کو حاصل تھی اور جسے قرآن نے ختم نہیں کیا ختم کرنا چاہتے ہیں اور ظہار کی مثال دیتے ہیں۔"

اس عبارت کی نقل ضروری نہیں تھی کیونکہ اس میں جو جواب جصاص کو دیا جا رہا ہے اس کی حقیقت ہم واضح کر چکے مگر اس لئے ہم نے اسے بھی نقل کر دیا کہ کہیں موصوف یہ شکایت نہ کر بیٹھیں کہ میں نے دوسرے جملے میں جو جواب دیا تھا اسے تو نالائق عامر عثمانی نے نظر انداز ہی کر دیا۔

نیز اس لئے بھی نقل کر دیا کہ یہ عبارت اپنے الفاظ اور دروبست کے لحاظ سے اور زیادہ چغلی کھا رہی ہے کہ جذباتی خروش نے علمی متانت کو داغ داغ کر دیا ہے۔

ذرا ہمارے دوست ہی انصاف فرمائیں کہ "یہ حضرات" کا مصداق کون لوگ ہیں اور اسلام کی دی ہوئی کسی سہولت کو ختم کرنے کی جسارت کا رسوا کن الزام کن کن پر عائد کیا جا رہا ہے۔ کیا خود موصوف ہی یہ نہیں جانتے در مانتے کہ حضرت عمر فاروقؓ سمیت جملہ صحابہؓ اور سینکڑوں ائمہؒ اور ہزاروں علماءِ حق اس "جسارت" کے مرتکب ہیں۔ تو کیا اس مقدس کاروانِ اتقیاء کی طرف ایسا جارحانہ اشارہ علمی سنجیدگی کے دائرے میں آ سکتا ہے۔ جوش کا طوفان ہوش کی حدیں پار کر گیا۔ کاش دماغ ٹھنڈا رکھا گیا ہوتا۔

جہاں تک عبارت کی استدلالی حیثیت کا تعلق ہے وہ پچھلی تقریرِ جواب سے مختلف نہیں۔ ظہار کے بعد اللہ نے عورت کو حلال کرنے کا طریقہ اہلِ ایمان کو بتایا تو کیا طلاق کے بعد حلال کرنے کا طریقہ نہیں بتایا۔ ظہار کے بعد تو اچھا خاصا کفارہ بھی ہے جس کے بغیر بیوی حلال نہیں ہوتی۔ دو ماہ کے مسلسل روزے یا ساٹھ مسکینوں کا کھانا۔ مگر ایک اور دو طلاقوں تک رجوع کے لئے اللہ نے کوئی کفارہ بھی نہیں رکھا۔ حالانکہ ظہار کی طرح طلاق بھی جنسی تعلق سے دست برداری کا اعلان ہے۔ پھر تین کے بعد اگرچہ مرد اس کا مستحق نہیں رہا تھا کہ رجوع کر سکے مگر پھر بھی اللہ نے یہ گنجائش دے ہی دی کہ عورت دوبارہ کسی سے شادی کر کے بیوہ ہو جائے تو تعلق کی تجدید کی جا سکتی ہے۔ فرمایا جائے ان خداداد سہولتوں میں سے کسی سہولت کو ختم کرنے کی ناپاک خواہش کا اظہار صحابہؓ و ائمہ نے یا ان کے کفش بردار ہم اخلاف نے کب کیا ہے۔

اور یہ کیا فرما دیا کہ طلاق کے سلسلے میں جو سہولت قبل از اسلام لوگوں کو حاصل تھی اسے قرآن نے ختم نہیں کیا۔ کاش فہم و علم دونوں کو لگام دی جاتی۔ قبل از اسلام تو لوگ بار بار طلاقیں دے کر رجوع کرتے رہتے اور عورت غریب ادھر میں لٹکی رہتی۔ طلاق کا کوئی عدد ایسا نہیں تھا جس کے بعد شوہر کا حقِ رجوع ختم ہو جاتا۔ کیا قرآن نے بھی اس سہولت کو باقی رہنے دیا؟ اور کیا واقعی اس ظلمِ مبین کو "سہولت" کا معصوم عنوان دیا بھی جا سکتا ہے!

تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آیاتِ طلاق نازل ہی ہوئی ہیں اس ظالمانہ روش کی اصلاح کیلئے جسے عرب کے مردوں نے اپنے لئے "سہولت" قرار دے رکھا تھا اور عورت غریب اس سہولت کے پاٹے استبداد تلے کچلی جا رہی تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ خبردار! تمہارا حقِ رجوع بس دو طلاقوں پر ختم ہو جاتا ہے تیسری دی اور ہمیشہ کو چھٹی ہوئی۔ اب دوبارہ اس سے نکاح بھی نہیں کر سکتے

یہ بھگتے وہ کہیں اور نکاح کرے اور پھر بیوہ بنے۔ ہمارے دوست سوچیں کہ کیا قرآن نے قبل از اسلام والی "سہولت" کو باقی رہنے دیا یا سختی سے ختم فرما دیا۔ اور یہ سوچیں کہ جو کچھ قرآن نے کیا آخر اس سے زیادہ حضرت عمرؓ اور ان کی رائے سے اتفاق کرنے والے صحابہؓ و ائمہ نے کیا کر ڈالا جسے آپ برملا الزام بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

ہاں اگر ایسا ہوتا کہ قبل از اسلام لوگ بیک وقت متعدد طلاقیں دے کر رجوع کیا کرتے اور پھر قرآن بھی یہ اعلان کر دیتا کہ ایک وقت میں خواہ کتنی ہی طلاقیں دو رجوع کا حق باقی رہے گا تب یہ الزام درست ہو سکتا تھا کہ فلاں گروہ ایک وقت کی متعدد طلاقوں کو متعدد ہی مان کر قرآن کی دی ہوئی سہولت ختم کر رہا ہے۔ مگر ایسا تو دور دور بھی نہیں۔ قرآن نے یہ صراحت کئے بغیر کہ متعدد طلاقیں بیک لفظ دی جائیں یا الگ الگ اور مجلس واحد میں دی جائیں یا مختلف مجلسوں میں حکم نافذ فرما دیا کہ دو طلاقوں تک رجوع ممکن ہے اس کے بعد نہیں فلاں فلاں بے چارے اسی حکم کو سینے سے لگائے پھر رہے ہیں۔ انھیں قرآنی سہولتوں کا دشمن اور بیری قرار دینا محض روانیِ قلم اور کثافتِ فہم ہے۔ علم و تحقیق نہیں۔

ساتویں مثال

ہمارے دوست فرماتے ہیں:۔

"ایک شخص ایک مجلس میں تین کیا ہزار طلاقیں دے سکتا ہے لیکن کیا یہ سب طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ تین سے زیادہ طلاق واقع ہونے کا کوئی قائل نہیں ہے اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک بار میں ایک سے زائد طلاق واقع نہ ہوگی"

یہ بھی فقط کج بحثی ہے جسے ہمارے دوست بھی کج بحثی ہی مانتے اگر مرتکب کوئی اور ہوتا۔ جب قرآن نے طے کر دیا کہ تیسری طلاق وہ تلوار ہے جو رشتۂ نکاح کی رگِ گلو کاٹ ڈالتی ہے تو اب حیات کا درجہ ہی کونسا رہ گیا جسے ذبح کرنے کے لئے مزید تلوار کی ضرورت محسوس کی جائے۔ سرد لاش پر گولیوں کی بوچھار کیجئے تو کون ان گولیوں سے دلچسپی لے گا۔ ذی روح اجسام کے بارے میں تو یہ امکان بھی ہو سکتا ہے کہ قتل یا ذبح کے بعد آپ ان کا قیمہ بنانے کی نیت سے تلوار یا چھری کو مزید حرکت دیئے جائیں لیکن نکاح اجسام میں سے نہیں معنی و مفہوم کے قبیل سے ہے۔ اس کا رشتہ جب مکمل طور پر کٹ گیا تو اب قیمہ بنانے کا یا تِکا بوٹی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا تین سے زیادہ طلاقوں کے وقوع کا قائل ہو کر کوئی کیا کرے گا اور کس کے دماغ میں پھوڑا ہے کہ لا یعنی شے کو اہمیت دے۔ تین طلاقیں اُس رشتے ہی کو فنا کر دیتی ہیں جسے منقطع کرنے کے لئے لفظ طلاق مقرر ہوا ہے۔ جب محلِ وقوع ہی نہ رہا تو مزید طلاقیں واقع کہاں ہونگی اور یہ بحث ہی کہاں اٹھے گی کہ ان کے وقوع کا کوئی قائل ہے یا نہیں ہے۔

اس کے برخلاف ایک دو طلاقیں رشتۂ نکاح کو فنا سے ہم کنار نہیں کرتیں۔ بس اس حد تک کاٹ دیتی ہیں کہ لب لگائیے اور جوڑ لیجئے۔ ابھی مزید طلاق کا محلِ وقوع باقی ہے۔ لہٰذا اس شکل کے لئے شکلِ اول کو نظیر بنانا مجادلہ اور مکابرہ تو ہو سکتا ہے برہان نہیں۔

مثالیں اور بھی متعدد ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سمینار کے تقریباً تمام شرکاء خالصتہً تحقیق و تدقیق کے لئے نہیں بلکہ ایک پہلے سے پسند کی ہوئی رائے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ ان کے حسنِ نیت میں شک ہم نہیں کرتے۔ وہ یقیناً ملت کے درد مند اور اصلاح کے دلدادہ ہیں۔ ان کی عام قابلیت بھی مسلم۔ لیکن ان اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ رشیدہ کو صحیح سمت میں کارفرما کرنے والی وہ واحد شے جسے بے لاگ تحقیق اور غیر جانب دارانہ تفقہ سے تعبیر کرتے ہیں موجود نہیں تھی اسی لئے وہ اپنی رائے کے

صرف روشن و مفید پہلو دیکھ سکے تاریک و مضر پہلوؤں پر ان کی نظر نہیں گئی۔ حد ہے کہ انھوں نے حضرت عمرؓ سمیت تمام صحابہؓ کو اور ائمہ اربعہ سمیت بیشمار اساطین فقہ کو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا اور نہیں محسوس فرمایا کہ یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

آج کی گفتگو ہم نے فریق مخالف کی حیثیت میں نہیں کی۔ ہمارا انشاء صرف یہ احساس دلانا تھا کہ کوئی مسلک و مذہب اگر حق بجانب بھی ہو تو اسکے لئے فاسد یا بے اصل یا مضرت رساں دلائل لانا ٹھیک نہیں ہے۔ آئندہ ہم تمام مقالات کے ضروری اجزاء سامنے رکھ کر یہ دکھلانے کی کوشش کریں گے کہ مقالہ نگار دوں کا پسند فرمودہ مسلک و مذہب فی نفسہ حق بجانب بھی نہیں ہے۔ اللہ ہمارا والی و ناصر ہو اور ہمارے قلم کو کجروی سے محفوظ رکھے۔

بے مثال انصاف

سمرقند فتح ہونے کے سات سال بعد حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو ان کے پاس سمرقند کا ایک وفد پہنچا جس نے شکایت کی کہ قتیبہؒ نے جب اس علاقہ کو فتح کیا تھا تو اسلامی اصول کے خلاف قبضہ کر کے مسلمانوں کو یہاں بسا دیا تھا یہ شکایت سن کر عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے گورنر کو لکھا کہ ایک قاضی (اسپیشل) اس کام کے لئے مقرر کر کے اس سے فیصلہ کرایا جائے، اگر وہ مسلمانوں کے سمرقند سے نکلنے کا فیصلہ کرے تو ان کو اسی وقت شہر سے باہر کر دیا جائے اہل سمرقند کی جانب سے "ابن حاضر الباجی" کو قاضی مقرر کیا گیا اور اس کے بعد انھوں نے فیصلہ دیا کہ "مسلمان شہر چھوڑ کر باہر چلے جائیں" پھر اس کے بعد برابر کا مقابلہ ہو، اہل سمرقند اس بے مثال انصاف سے بیحد متاثر ہوئے اور اس پر تیار ہو گئے کہ مسلمان وہاں رہیں۔ (فتوح البلدان)

قدرت کی تقسیم!

ایک بزرگ تھے نازدل سے شکستہ حال، پراگندہ (بال) ایک شہر کے دروازے پر پہنچے تو شہر پناہ بند، لوگوں سے پوچھا کہ دن میں شہر پناہ کیوں بند ہے؟ جواب ملا کہ بادشاہ کا "باز" چھوٹ گیا ہے، اس لئے دروازے بند کر دیئے کہ کہیں نکل نہ جائے۔ آپ نے (بارگاہ خداوندی) میں عرض کیا کہ حضور ایسوں کو تو نے سلطنت دے رکھی ہے جن میں اتنی بھی عقل نہیں، ایک ہم ہیں کہ عقل بھی، علم بھی، مگر ضروریات سے کتنی تنگ، اس پر عتاب ہوا اور بطور الہام ارشاد ہوا کہ تم اس پر راضی ہو کہ تمہارا علم، تقویٰ اور اخلاص اس کو دیدیا جائے اور اسکی سلطنت مع بے عقلی تم کو دیدی جائے، بس کانپ اٹھے اور توبہ کی۔

(حضرت تھانویؒ)

سو سے بُرا تو ایک سے اچھا بنا دیا
جو جس کے حق میں تھا وہ بہتر بنا دیا

نوٹ کیجئے

انشاء اللہ عنقریب "کہانی نمبر" آرہا ہے

مُلّا ابن العرب مکی کی جولانیوں پر —

طنز و مزاح اور عصری ادب کی

تاریخ میں یہ نمبر شاید شاہکار ثابت ہو۔

تفہیم القرآن

القیٰمۃ

نام پہلی ہی آیت کے لفظ القیٰمۃ کو اس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس سُورہ کا عنوان بھی ہے کیونکہ اس میں قیامت ہی پر بحث کی گئی ہے۔

زمانۂ نزول اگرچہ کسی روایت سے اس کا زمانۂ نزول معلوم نہیں ہوتا لیکن اس کے مضمون میں ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ آیت ۱۵ کے بعد یکایک سلسلۂ کلام توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ "اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے"۔ اس کے بعد آیت ۲۰ سے پھر وہی مضمون شروع ہو جاتا ہے جو ابتداء سے آیت ۱۵ تک چلا آ رہا تھا۔ یہ جملۂ معترضہ اپنے موقع و محل سے بھی اور روایات کی رو سے بھی اس بنا پر دورانِ کلام میں وارد ہوا ہے کہ جس وقت حضرت جبریلؑ یہ سُورہ حضورؐ کو سنا رہے تھے اس وقت آپ اِس اندیشے سے کہ کہیں بعد میں بھول نہ جائیں، اس کے الفاظ اپنی زبان مبارک سے دُہراتے جا رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نزولِ وحی کا نیا نیا تجربہ ہو رہا تھا اور ابھی آپ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اچھی طرح نہیں پڑی تھی۔ قرآن مجید میں اس کی دو مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ ایک، سُورۂ طٰہٰ میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ۔ "اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔" (آیت ۱۱۴)۔ دوسرے سُورۂ اعلیٰ میں جہاں حضورؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى "ہم عنقریب تم کو پڑھوا دیں گے پھر تم بھولو گے نہیں۔" (آیت ۶) بعد میں جب حضورؐ کو وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق ہو گئی تو اس طرح کی ہدایات دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی لئے قرآن میں ان تین مقامات کے سوا اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

موضوع اور مضمون یہاں سے آخرِ کلام اللہ تک جو سورتیں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر اپنے مضمون اور اندازِ بیان سے اُس زمانہ کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں جب سُورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات کے بعد نزولِ قرآن کا سلسلہ بارش کی طرح شروع ہوا اور پے در پے نازل ہونے والی سُورتوں میں ایسے پُرزور اور مؤثر طریقے سے

نہایت جامع اور مختصر فقروں میں اسلام اور اس کے بنیادی عقائد اور اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا گیا اور اہلِ مکہ کو ان کی گمراہیوں پر متنبہ کیا گیا جس سے قریش کے سردار بوکھلا گئے اور پہلا حج آنے سے پہلے حضورؐ کو زک دینے کی تدبیریں سوچنے کے لئے انھوں نے وہ کانفرنس منعقد کی جس کا ذکر ہم سورۂ مدثر کے دیباچہ میں کر چکے ہیں۔

اس سورہ میں منکرینِ آخرت کو خطاب کر کے ان کے ایک ایک شبہ اور ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ قیامت اور آخرت کے امکان، وقوع اور وجوب کا ثبوت دیا گیا ہے اور یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ بھی آخرت کا انکار کرتے ہیں ان کے انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل اسے ناممکن سمجھتی ہے بلکہ اس کا اصل محرک یہ ہے کہ ان کی خواہشاتِ نفس اسے ماننا نہیں چاہتیں۔ اس کے ساتھ لوگوں کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ جس وقت کے آنے کا تم انکار کر رہے ہو وہ آکر رہے گا، تمہارا سب کیا دھرا تمہارے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا اور حقیقت میں تو اپنا نامۂ اعمال دیکھنے سے بھی پہلے تم میں سے ہر شخص کو خود معلوم ہو گا کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے، کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے آپ سے ناواقف نہیں ہوتا، خواہ وہ دنیا کو بہکانے اور اپنے ضمیر کو بہلانے کے لئے اپنی حرکات کے لئے کتنے ہی بہانے اور عذرات تراشتا رہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نہیں[۱]، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی، اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس[۲] کی۔

۱؎ کلام کی ابتدا "نہیں" سے کرنا خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے سے کوئی بات چل رہی تھی جس کی تردید میں یہ سورہ نازل ہوئی ہے اور آگے کا مضمون آپ ہی ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ بات قیامت اور آخرت کی زندگی کے بارے میں تھی جس کا اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے بلکہ ساتھ ساتھ مذاق بھی اڑا رہے تھے۔ اس طرزِ بیان کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر آپ محض رسولؐ کی صداقت کا اقرار کرنا چاہتے ہوں تو آپ کہیں گے "خدا کی قسم رسولؐ برحق ہے۔" لیکن اگر کچھ لوگ رسولؐ کی صداقت کا انکار کر رہے ہوں تو آپ جواب میں یوں کہیں گے کہ "نہیں، خدا کی قسم رسولؐ برحق ہے۔" اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔

۲؎ قرآن مجید میں نفسِ انسانی کی تین قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ نفس جو انسان کو برائیوں پر اکساتا ہے۔ اس کا نام نفسِ امارہ ہے۔ دوسرا وہ نفس جو غلط کام کرنے .... یا غلط سوچنے یا بری نیت رکھنے پر نادم ہوتا ہے اور انسان کو اس بات پر ملامت کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ لوامہ ہے اور اسی کو ہم آج کل کی اصطلاح میں ضمیر کہتے ہیں۔ تیسرا وہ نفس جو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے میں اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی ہے اسے بیان نہیں کیا ہے کیونکہ بعد کا فقرہ خود اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا اور وہ ایسا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر ان دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے؟

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اُس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا آنا یقینی ہے۔ پوری کائنات کا نظام اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ اس کی نوعیت ہی خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اس گمانِ بے اصل کے لئے کوئی مضبوط دلیل نہ پاتی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہو سکتی ہے، لیکن جتنا جتنا اس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس ہنگامۂ ہست و بود کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا، اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی کی قسم کھائی ہے، اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکی انسان کو جو اپنے موجود ہونے ہی میں شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمہاری جان کی قسم تم موجود ہو، یعنی تمہارا وجود خود تمہارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔

لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد پھر انسان دوبارہ اُٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا اور وہ اپنے کئے کا اچھا یا برا نتیجہ دیکھے گا، تو اس کے لئے دوسری قسم نفسِ لوّامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس ضمیر میں لازماً بھلائی اور بُرائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اس کا ضمیر اسے کوئی برائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے۔ قطعِ نظر اس سے کہ اس نے بھلائی اور بُرائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے، اس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور بُرائی کی تمیز پائی جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو .... اپنے اچھے اور برے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے، اور جس بُرائی کا ارتکاب اُس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو اس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہو لے، تو اس کے برعکس صورت میں جب کہ اُسی برائی کا ارتکاب کسی دوسرے نے اُس کے ساتھ کیا ہو، اس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہئے۔ اب اگر انسان کے وجود میں اس طرح کے ایک نفسِ لوّامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفسِ لوّامہ زندگی بعدِ موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے، کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے اُن کی جزا یا سزا اُس کو ضرور ملنی چاہئے، زندگی بعدِ موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہو سکتا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اُس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم رہ جائے گا، اور اس کی بہت سی برائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لئے جب تک آدمی اس بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظامِ کائنات میں پیدا ہو گیا ہے، اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی، اُس وقت تک وہ حیات بعدِ موت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تناسخ یا آواگون کا فلسفہ بھی فطرت کے اس مطالبے کا جواب نہیں ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنے اخلاقی اعمال کی سزا یا جزا پانے کے لئے پھر اسی دنیا میں جنم لیتا چلا جائے تو ہر جنم میں وہ پھر کچھ مزید اخلاقی اعمال کرتا چلا جائے گا جو نئے سرے سے جزا و سزا کے متقاضی ہوں گے اور اس لامتناہی سلسلے میں بجائے اس کے کہ اس کا حساب کبھی چُک سکے، اُلٹا اس کا حساب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لئے فطرت کا یہ تقاضا صرف اسی صورت میں پورا ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی صرف ایک زندگی ہو، اور پھر پوری

نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں انسان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک حساب کر کے اسے پوری جزا اور سزا دیدی جائے (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰)

قرآن اور تعمیرِ سیرت

تعلیمات قرآنی کا نچوڑ تصوف اور ادب صالح کا دلکش مجموعہ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین کے قلم سے۔ قیمت ـــ چھ روپے

عورت کیا کچھ کر سکتی ہے؟

تاریخی شہادتوں کے ساتھ صحابی عورتوں کے وہ شاندار کارنامے جو تاریخ کی پیشانی پر ثبت ہو گئے۔ اندازِ بیان اس قدر عمدہ کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ (پیش لفظ مولانا عامر عثمانی کا ہے) قیمت ـــ ۴/۲۵

غنیۃ الطالبین

مصنفہ:۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ قیمت مجلد چوبیس روپے -/۲۴

چند لٹریری کتابیں

اردو تنقید کا ارتقاء

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی معرکۃ الآراء تصنیف۔ بابائے اردو مولانا عبدالحق کے مقدمہ سے مزین۔ مجلد دس روپے

فن افسانہ نگاری

ترمیم اور اضافہ شدہ ایڈیشن۔ وقار عظیم کی یہ کتاب فن افسانہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خاصے کی چیز سمجھی گئی ہے۔ قیمت مجلد ـــ سات روپے

تعلیمی نفسیات

تصنیف:۔ رالف گیری • ترجمہ:۔ راج کمار

تجربات اور تفکر کی روشنی میں۔ تعلیم کی نفسیات اور ضروری پہلوؤں پر مفید گفتگو۔ قیمت مجلد۔ ڈیڑھ روپیہ 1/50

جدید تعلیمی نفسیات

از:۔ ڈاکٹر عبدالرؤف۔ تعلیم کے موضوع پر بہت اچھی اور فائدہ مند تصنیف۔ ہر صاحبِ اولاد کے لئے مطالعہ کی چیز۔ قیمت مجلد ـــ آٹھ روپے ۸/-

تاریخِ اسلام کے حیرت انگیز لمحات

قاہرہ کے ایک فاضل بیرسٹر عبداللہ عنان کی تالیف نئے اسلوب میں۔ تاریخِ اسلام کے بعض وقائع پر علم و تحقیق کی روشنی۔ قیمت ـــ ساڑھے سات روپے

سرسید اور ان کے نامور رفقاء

ڈاکٹر سید عبداللہ کے قلم سے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ معلومات کا بیش بہا ذخیرہ۔ قیمت مجلد ـــ دس روپے

اسلام اور ترقی

مولانا اشرف علیؒ کے احادیث سے بھرپور ارشادات۔ قیمت ـــ ۷۰ پیسے

تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانیؒ

ملک و ملت کی ایک ممتاز شخصیت مولانا عبداللطیف نعمانیؒ شیخ الحدیث مفتاح العلوم مئو (۱۳۹۲ھ) کی دینی، علمی، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے زندۂ جاوید کارنامے اور اہلِ علم و رہنمایانِ ملک و ملت کے خراجہائے عقیدت۔ قیمت پانچ روپے ۵/-

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یوپی)

کیسے رائیگاں جاتا میرا صبرِ مظلومی
ہر کسی کے لب تر تھے، میری پیاس تھی تنہا
وقت کے طمانچوں سے رہ گیا کھنڈر بن کر
میکدے کو لے ڈوبی میری تشنگی تنہا

رفتہ رفتہ سب ساتھی ساتھ چھوڑ آئے تھے
دشتِ غم میں کاٹی ہے میں نے زندگی تنہا
میری موت کا ماتم دشتِ غم میں کرتا کون
پھوٹ پھوٹ کر روئی میری بیکسی تنہا

بوالہوس سمجھتے کیا درجۂ شہادت کو
میکدے کی چوکھٹ پر میں نے جان دی تنہا
رند سب رہے محروم تشنگی کی لذت سے
پیاس کی مئے کہنہ صرف میں نے پی تنہا

ناقدری کی اربابِ ہنر دیکھ کے ہم نے
داوات اُلٹ دی ہے قلم توڑ دیا ہے
جب دام لگے بے بصری بے خبری کے
کوزے کی طرح ساغرِ جم توڑ دیا ہے

نازک تو بہت تھی وہ منظر پھر یہ ہوا کیا
تھا مجھ میں اَنا کا جو صنم توڑ دیا ہے
منتظر مرے وجدان کی آنکھوں نے یہ دیکھا
خود مجھ میں کسی شخص نے دم توڑ دیا ہے

جس درِ غمِ عشق کے نغمات ملے تھے
لے جا کے وہیں بربطِ غم توڑ دیا ہے
وہ عامرِ بدنام کہ تھا رندِ خرابات
اس نے درِ محبوب پہ دم توڑ دیا ہے

صحرا صحرا غم کے بگولے، بستی بستی درد کی آگ
جینے کا ماحول نہیں ہے لیکن پھر بھی جیتے ہیں
ساغر ساغر زہر گھلا ہے، قطرہ قطرہ قاتل ہے
یہ سب کچھ معلوم ہے لیکن پیاس لگی ہے پیتے ہیں

عالم عثمانی

دو اعتراض • جہیز کی باطل رسم • غائبانہ نمازِ جنازہ • ایک حدیث کا مطلب • کذب اور نبوت • حضورؐ کی بشریت • حقانی صاحب کی "شریعت یا جہالت" • وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ • فقہ کی طرف رجوع کیجئے۔ • مکو کا لفظ • روزے کی نیت • فقیر و مسکین کی اصطلاحیں۔

تجلی کی ڈاک

دو اعتراض

سوال :- از :- محمد خالد پٹیل ۔ نظام پور۔

دسمبر ۷۳ء کی "تجلی کی ڈاک" میں آپ نے لکھا ہے "حدیث میں شطرنج کی ممانعت ہو یہ ہمارے علم میں نہیں ہے"۔ مگر مشکوٰۃ کی کتاب التصاویر میں شطرنج کی ممانعت میں مندرجہ ذیل دو حدیثیں موجود ہیں۔

۱) حضرت علیؓ نے بیان کیا کہ شطرنج عجمی لوگوں کا جوا ہے۔ (بیہقی)

۲) ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعریؓ نے بیان کیا شطرنج سے وہی شخص کھیلتا ہے جو خطا کار اور گنہگار ہے۔

اسی طرح آپ نے لکھا ہے۔ "میت کو قبر میں رکھتے ہوئے الفاظ کہنے پسندیدہ ہیں۔ بسم اللہ وعلیٰ ملۃ رسول اللہ۔ پسندیدہ سے مراد یہ ہے کہ درجۂ استحباب میں ہیں۔ سنت یا مسنون نہیں۔" (ص ۴۶)

مگر حافظ ابن قیمؒ نے ان الفاظ کو مسنون بتایا ہے۔ چنانچہ زاد المعاد میں لکھتے ہیں۔ "(حضورؐ) میت کو قبر میں رکھتے تو فرماتے بسم اللہ وعلیٰ ملۃ رسول اللہ۔"

نیز ابو داؤد میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم لوگ مُردوں کو قبر میں رکھو تو کہو بسم اللہ وعلیٰ ملۃ رسول اللہ۔"

امید کہ قارئین کی آگاہی کے لئے اس خط کو تجلی کے قریبی شمارے میں شائع فرمائیں گے۔

جواب :-

(۱) محدود کتبی اصطلاح میں تو بے شک صحابہؓ سے منسوب اقوال بھی حدیث کہلاتے ہیں۔ لیکن کتب کے احاطے سے نکلکر روزمرہ کی گفتگو میں حدیث صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا نام ہے۔ تجلی میں جو گفتگو کی جاتی ہے وہ عموماً عام اصطلاحات کے تحت کی جاتی ہے۔ لہذا یہ سمجھنے میں کسی کو دشواری نہیں ہونی چاہئے تھی کہ حدیث سے ہماری مراد ارشادِ پیغمبرؐ ہے نہ کہ قولِ صحابیؓ

آپ نے مشکوٰۃ سے دو قول نقل کئے۔ دونوں قولِ صحابی ہیں۔ پہلا قول حضرت علیؓ کا ہے۔ اس سے کوئی شرعی حکم نہیں نکلتا۔ حضرت علیؓ کو جس نے بھی یہ اطلاع دی کہ عجمی لوگ شطرنج پر جوا کھیلتے ہیں اسے یا تو غلط فہمی ہوئی ہے یا پھر اس نے کچھ لوگوں کو واقعی اس پر جوا کھیلتے دیکھا ہوگا اور اطلاع دینے کا انداز ایسا ہوگا جس سے حضرت علیؓ نے یہ سمجھا کہ شطرنج کسی جوے ہی کا نام ہے۔

جوا مالی ہار جیت کو کہتے ہیں۔ کوئی رقم داؤ پر لگا کر آپ شطرنج یا تاش کھیلیں یا سکہ اُچھالیں اسے جوا ہی قرار دیا جائے گا لیکن رقم کی ہار جیت نہ ہو تو جوے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شطرنج عموماً جوے کے طور پر نہیں کھیلی جاتی بلکہ دلچسپی کے لئے کھیلی جاتی ہے۔ حضرت علیؓ یا کسی بھی صحابی کا کوئی خیال بہر حال حقائق کو تو افسانہ نہیں بنا سکتا۔ شطرنج جیسی غیر معمولی دلچسپی رکھنے والا کھیل شاید ہی کوئی ہو۔ اسی لئے اکثر و بیشتر اسے خالصۃً دلچسپی ہی کے نقطۂ نظر سے کھیلا جاتا ہے۔ پھر بھلا یہ کہنا امر واقعہ کے اعتبار سے کیسے درست ہو سکتا ہے کہ شطرنج عجمی لوگوں کا جوا ہے۔

دوسرا قول حضرت ابو موسیٰؓ کا ہے۔ اس کا اصل متن یہ ہے۔ لا یلعب بالشطرنج الا خاطئ۔ آنجناب نے اسکے ترجمے میں لفظ "گنہگار" کا اضافہ کر دیا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے جس جواب کے تعلق سے آپ گفتگو فرما رہے ہیں کیا ہم نے اس میں اس حد تک شطرنج کی تقبیح نہیں کی جس حد تک لفظ "خاطی" سے ظاہر ہو رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے ہم نے تو اس سے زیادہ تقبیح کی ہے۔

کم سے کم ہمارے الفاظ دہرا لیجئے:۔

> "حدیث میں شطرنج کی ممانعت آئی ہو، یہ ہمارے علم میں نہیں تاہم لہو ولعب کی جو اقسام حدیث کی رو سے ممنوع یا مکروہ ہیں ان میں بہر حال یہ داخل ہے۔"

کیا اس سے کچھ زیادہ بھی ابو موسیٰؓ کے قول سے ثابت ہو رہا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ ذی علم ہو کر آپ نے قولِ صحابی کو محض اس لئے قولِ رسولؐ کے درجے میں رکھ دیا کہ وہ مشکوٰۃ میں ذکر ہوا ہے۔ حالانکہ ایسی غلط فہمی کا کوئی منطقی جواز موجود نہیں تھا۔ آدمی کو حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ قرآن کا ایک الگ درجہ ہے۔ حدیث کا الگ اور قولِ صحابی کا الگ۔ جو چیز جس درجے میں حلال یا حرام یا مستحسن یا مکروہ ثابت ہو رہی ہو اسے اسی درجے میں رکھنا چاہئے۔ اپنی طرف سے گھٹانا بڑھانا بے احتیاطی ہے اور اسی بے احتیاطی نے بیشمار غلط روایات اور بے جا اختلافات اور ناقص نظریات و عقائد کو جنم دیا ہے۔

(۲) معلوم ہوتا ہے آپ ہر اُس قول یا فعل کو "سنت" تصور کرتے ہیں جو حضورؐ سے منسوب ہو۔ حالانکہ فقہ میں فرض، واجب مکروہ وغیرہ کی طرح لفظ "سنت" بھی ایک اصطلاح ہے اور لفظ "استحباب" بھی ایک معلوم اصطلاحی مفہوم میں بولا جاتا ہے کتب اصول میں ان تفصیلات کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ آسانی کے لئے ہم سہل الحصول کتاب "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" کی نشاندہی کرتے ہیں۔

السنّۃ:۔ ھی ما طلبہ الشارع واکد امرہ وعظم قدرہ ولم یدل دلیل علی وجوبہ۔ (جلد اول ص۴۳)

یعنی قانون شرعی کی اصطلاح میں سنت وہ چیزیں ہیں جن کے واجب ہونے پر اگرچہ دلیل قوی قائم نہ ہو لیکن شارع کی طرف سے ان کی اچھی خاصی تاکید کی گئی ہو اور قرائن بتاتے ہوں کہ ان کی بڑی اہمیت و عظمت ہے۔

المندوب:۔ ھو ما طلبہ الشارع طلباً غیر جازم وخفف امرہ واذا فعلہ المکلف یثاب واذا ترکہ لا یعاقب۔ (حوالۂ مذکورہ)

یعنی مندوب (مستحب) وہ چیزیں ہیں کہ شارع کو وہ مطلوب تو ہوں مگر شدت و تاکید کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے حکم میں نرم اور غیر تاکیدی انداز اختیار کیا گیا ہو۔ اور ان چیزوں کے اختیار کرنے سے ثواب تو ملے مگر نہ کرنے سے عذاب نہ ملے۔

اس تصریح سے ثابت ہے کہ قانونِ شرعی کی زبان میں ہر وہ فعل یا قول "سنت" نہیں ہے جس کا انتساب حضورؐ کی

طرف ہو جائے۔ آپ دیکھتے ہیں وہ تمام نمازیں جنھیں نفل کہا جاتا ہے حضورؐ سے ثابت ہیں۔ حضورؐ نے قول اور عمل دونوں سے ان کی ترغیب دی ہے اور ترغیب کے لئے بھی عربی میں "امر" ہی کے صیغے استعمال ہوتے ہیں مگر ان نوافل کو "سنن" نہیں کہا جاتا "نوافل" کا عنوان دیا جاتا ہے۔

اسی طرح مُردوں کو قبر میں رکھتے وقت کہے جانے والے اُس فقرے کا معاملہ ہے جس پر بات چل رہی ہے۔ ان لیا کہ حضورؐ نے یہ فقرے فرمائے اور ان کی ترغیب بھی دی لیکن اس فعل و قولی ترغیب میں اصرار و تاکید نہیں ہے لہٰذا قانونی اصطلاح کے مطابق اس سے سنیت نہیں فقط استحباب (ندب) ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ احناف کی معروف کتب قانون، بحر الرائق، ردّ المحتار، عالمگیری وغیرہ میں اس کی وضاحت ہے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر لفظ "سنت" کا اطلاق شاید اُس وسیع مفہوم کے اعتبار سے کر دیا جو وعظ و تبلیغ اور ترغیب و ترہیب کی زبان میں رائج ہے۔ یعنی کسی عمل یا قول کا حضورؐ سے منسوب و مربوط ہونا۔ یہ بلاشبہ درست ہے کہ زیر تذکرہ الفاظ حضورؐ سے ثابت ہیں۔

ہم "تجلی کی ڈاک" میں جہاں فقہی مسائل بیان کرتے ہیں وہاں کسی بھی اصطلاحی لفظ کا مصداق و مفہوم صرف وہی لینا چاہیئے جو فقہ میں معتبر ہو۔ مستحب، مندوب، مستحسن، پسندیدہ جیسے الفاظ فقہ میں ایسے ہی اُمور کے لئے بولے جاتے ہیں جو شرعاً مطلوب تو ہوں مگر طلب میں اصرار و تاکید اور جزم و تشدید نہ ہو۔

اور یہ بھی ملحوظ رکھیئے کہ حافظ ابن قیمؒ یا امام ابن تیمیہ یا کوئی بھی بڑے پائے کا عالم اگر مسلکاً حنفی نہیں ہے تو حنفی فقہ میں اس کے قول سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی۔ احناف کے اپنے اصول و مناہج، اپنے طریقے اور اپنے دلائل ہیں۔ ان کا تحقیقی مطالعہ کئے بغیر سرسری اور سطحی استدلال کے ساتھ تعریض شروع کر دینا علم و تفقہ کی شان کو گھٹاتا ہے جس سے قانونِ شرعی کے وقار کو دھکا لگتا ہے۔

آخر میں ایک نصیحت گوشگذار کر دیں:-

آپ نے مشکوٰۃ کا اصل متن نقل کئے بغیر حضرت ابو موسٰی اشعریؓ کا ارشاد اُردو میں پیش کر دیا۔ ایسی صورت میں علمی ذمہ داری اور دیانت کا تقاضا تھا کہ ترجمے میں ایک لفظ بھی اپنی طرف سے داخل نہ کیا جائے۔ قانونی مباحث میں تو حرف حرف کی بڑی قیمت ہے۔ صحابی مذکور نے فقط لفظ "خاطی" فرمایا تھا۔ آپ نے اس کا ترجمہ "خطاکار" کر دیا ٹھیک کیا مگر "گنہگار" کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ بات ظاہراً معمولی ہوتے ہوئے بھی معمولی نہیں۔ ہم معنی یا کم و بیش ہم معنی الفاظ زور اور تاکید کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ خطاکار اور گنہگار قریب قریب ایک ہی معنی کے حامل ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابو موسٰیؓ نے خاطی کے ساتھ آثم یا مذنب جیسا کوئی لفظ بھی ارشاد فرمایا مگر مشکوٰۃ میں تو یہ لفظ موجود نہیں پھر کیا آپ کا ایک لفظ بڑھا دینا غلط طور پر یہ تاثر نہیں دیتا کہ ابو موسٰیؓ شد و مد اور زور و تاکید کے ساتھ شطرنج کی مذمت فرما رہے ہیں۔

احتیاط! محترم بزرگ احتیاط!!

جہیز کی باطل رسم

سوال ۲:- از۔ کے عبد الرزاق۔ کولار۔

تجلی بابت ماہ جولائی و اگست ۷۳ء کے ایمان افروز صفحہ نمبر ۳۴ پر بعنوان "شادی بیاہ"۔ آپ نے لکھا ہے:-

"یہ رسم لڑکی والے لڑکے والوں سے یا لڑکے والے لڑکیوں والوں سے جہیز میں فلاں فلاں چیزیں مانگیں، شرعاً حرام ہے۔"

اس کا حوالہ آپ نے نہیں دیا ہے۔ مہربانی سے حوالہ دیں اور حرام کیسے ہو جائے گا جب کہ بخوشی دے سکتے ہیں لے سکتے ہیں۔ کیا کوئی قرآنی آیت یا حدیث یا اجماع صحابہ سے ثابت ہے۔ اُمید کہ ضرور بضرور فوراً اس خط کے ہم دست ہوتے ہی

جواب سے سرفراز فرمائیں گے تاخیر نہ کریں۔

جوابؔ:-

آنجناب شاید زیادہ عرصہ سے تجلی کا مطالعہ نہیں کر رہے ہیں ورنہ جہیز کے موضوع پر تو بار ہا اس میں مدلّل اور تشفی بخش گفتگو آچکی ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے اس پر بار بار گفتگو ہونا بھی چونکہ افادیت سے خالی نہیں اس لئے آج بھی بقدرِ ضرورت لب کشائی کرنے میں ہمیں تامل نہیں۔

"جہیز" کافی پرانی اصطلاح ہے۔ اس کا اطلاق اُس سازوسامان پر ہوا کرتا تھا جو لڑکی کے سرپرست شادی کے موقع پر اپنی لڑکی کو دیدیں۔ اولاد اور والدین کے درمیان اللہ نے محبت کا گہرا رشتہ رکھا ہے لہذا یہ ایک طبعی اور فطری ہی بات ہے کہ والدین جب اپنی بچی کو دلھن بناکر گھر سے رخصت کریں تو اس کی آرائش و آسائش کا بھی کچھ نہ کچھ سامان کر دیں۔ اس طرزِ عمل میں نہ عقلاً کوئی قباحت ہے نہ نقلاً۔ شریعت بھی اس پر اعتراض نہیں کرتی۔

لیکن اس چودھویں صدی میں یہ اصطلاح اپنے پرانے اطلاق تک محدود نہیں رہی بلکہ غیر مسلم سماج سے لئے ہوئے ایک رواج نے اسے کچھ اور معنی پہنا دیئے۔ یہ معنی ہیں لڑکے والوں کے مطالبے پر لڑکی والوں کا فلاں فلاں سازوسامان تیار کرنا اور بسا اوقات نقد پیسہ بھی دینا۔ اس معنی کو کہیں جہیز اور کہیں گھوڑا جوڑا کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے اور اسی پر اسلامی شریعت کا سخت اعتراض ہے۔

آپ نے بخوشی لینے دینے کی حرمت پر دلیل کی فرمائش کی ہے مگر ایسے لین دین کو حرام کس نے کہا۔ جو فقرے آپ نے ہمارے نقل کئے ان میں بھی "مانگنے" کا لفظ صراحتہً موجود ہے۔ مانگنے کی صورت میں معاملہ ذاتی خوشی اور رضامندی کا نہیں رہتا مصلحین اور علمائے حق جس شے کو حرام قرار دیتے ہیں وہ یہی تو ہے کہ لڑکے والے لڑکی والوں سے مطالبات کریں اور لڑکی والے رسم و رواج کی مجبوری سے ان مطالبات کے آگے گھٹنے ٹیک دیں۔ یہ سودا خوشی کا نہیں دباؤ اور جبر کا ہے۔ اس کی حرمت پر عقل ونقل کے بے شمار دلائل ناطق ہیں جن میں سے کچھ کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

اللہ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:-

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (بقرہ، آیت

(اے بندو! تم ایک دوسرے کا مال باطل طور پر مت کھاؤ) یہ تو آپ کو علم ہی ہوگا کہ "کھانا" ایسے موقع پر لغوی مفہوم میں نہیں بولا جاتا بلکہ مجازی معنی میں بولتے ہیں یعنی مال قبضالینا۔ ہڑپ کرلینا۔ لے لینا۔ آپ اگر یوں کہیں کہ زید نے فلاں شخص کا لاکھوں روپیہ کھالیا تو آپ کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ زید نے لاکھوں روپے کے نوٹ یا سکے منھ میں رکھکر حلق سے نیچے اُتار لئے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ لاکھوں روپے ناحق طور سے لے لئے خواہ ان روپوں کو اپنی کسی بھی ضرورت میں استعمال کیا ہو۔ کپڑے بنائے ہوں۔ جائدادیں خریدی ہوں یا تجوری میں بند کرکے رکھا ہو یا جو کچھ بھی کیا ہو۔

آیت میں بھی "کھانے" کا یہی مفہوم ہے۔ اللہ ہدایت کر رہا ہے کہ جو بھی مال لو جائز طور پر لو۔ ناجائز طور پر مت لو۔ ٹھیک یہی ہدایت سورۂ نساء میں وارد ہوئی۔ اب یہ سوچئے کہ کسی بھی روش اور طرزِ عمل کے حق یا باطل ہونے کا پتا مسلمان کو کیسے چلا کرتا ہے۔ ایک ہی جواب ملے گا۔ قرآن وحدیث یا اجماع وقیاس یا مستند مفتیوں کے فتاویٰ سے حق اور باطل کی تعلیم اللہ اور اس کے رسولؐ نے خوب خوب دیدی ہے۔ اور عبادات کی طرح معاملات کے بھی تمام گوشے اور پہلو اچھی طرح کھول دیئے ہیں۔

آئیے دیکھیں کہ اللہ اور رسولؐ کے نزدیک شادی کا معاملہ کس نوعیت کا ہے اور اس میں کس فریق پر کونسی مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

قرآن وحدیث کو پوری طرح دیکھنے کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ عقدِ نکاح کو اللہ نے مرد اور عورت کے درمیان ایک ایسا معاملہ قرار دیا ہے جس میں مرد خریدار ہے اور عورت فروخت کنندہ۔ فروخت ہونے والی شے وہ حقِ تصرف ہے جو مرد کو عورت کے جسم پر حاصل ہوتا ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں

اسے مِلکِ بُضع کہتے ہیں۔ خریدار مال کی قیمت ادا کرے یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جو دنیا بھر میں مسلّم ہے چنانچہ اللہ اور رسولؐ نے طے فرمادیا کہ نکاح درست ہو ہی نہیں سکتا جب تک مرد عورت کو کوئی نہ کوئی رقم ادا کرنے پر تیار نہ ہو۔ اسی رقم کا اصطلاحی نام "مہر" ہے۔ آں جناب کو معلوم ہی ہوگا کہ اگر کوئی نکاح مہر کا ذکر بیچ میں آئے بغیر کرلیا جائے تب بھی مرد پر مہرِ مثل واجب ہو جاتا ہے یعنی اتنا مہر جتنا اس گھرانے میں مروّج ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نکاح کے معاملے میں اسلام نے مالی بار مرد پر ڈالا اور عورت کو اس کا مستحق قرار دیا کہ اُس حقِ تصرف کی قیمت وصول کرے جو عقدِ نکاح کے ذریعہ مرد کو اس کے جسم پر حاصل ہو رہا ہے۔

جب کھلی صورتِ حال یہ ہے تو آپ سے آپ معلوم ہو جاتا ہے کہ شادی کے موقعہ پر مالی مطالبہ عورت ہی کا حق ہے جسے وہ اپنے سرپرستوں کے توسّط سے استعمال کرے گی۔ مرد یا اس کے سرپرستوں کو حق نہیں کہ بجائے مالی بوجھ برداشت کرنے کے اُلٹا لڑکی والوں سے یہ کہیں کہ ہمیں اتنا روپیہ یا فلاں فلاں سامان دو۔ ایسا کہنا صریحاً شریعت سے انحراف اور دین سے بغاوت ہوگا۔ آخر کون اس بات کو معقول اور منصفانہ کہہ سکتا ہے کہ خریدار وہ شئے بھی حاصل کرے جس کا سودا ہوا ہے اور بیچنے والے سے کچھ مال بھی اینٹھ لے۔ یہ باطل طریقہ ہے جس سے حکمِ قرآنی کی نافرمانی ہوتی ہے۔

چنانچہ آپ گذشتہ تیرہ صدیوں کے مسلم معاشرے کا سروے کر دیکھئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی شادیاں کیں۔ آپ کے اصحابؓ شادیاں کرتے رہے۔ تابعین، تبع تابعین، محدثین، مفسرین، مشائخ وصوفیاء، اولیاء و اقطاب فقہاء وائمہ سبھی اس مرحلے سے گذرے۔ کوئی ایک مثال آپ تاریخ سے نہیں لاسکتے کہ ان بزرگوں میں سے کسی نے لڑکی والوں سے کسی سازوسامان یا نقدی کا مطالبہ کیا ہو۔ فرمائش کی ہو کہ فلاں فلاں چیز ضرور دیجئے۔ لڑکی والوں نے اپنی آزاد مرضی سے بغیر کسی مطالبے اور فرمائش کے جو بھی جہیز اپنی بچیوں کو دیا یا جو بھی تحفہ ہونے والے دامادوں کو پیش کیا اس کی مطلق بحث نہیں۔ بحث لڑکے والوں کی طلب اور مانگ کی ہے۔ وہ چاہے صاف الفاظ میں چاہے اشاروں اور کنایوں کے ذریعے اگر لڑکی والوں سے مطالبات کرتے ہیں تو اس کی کوئی نظیر سلف میں نہیں ملتی۔ بتلائیے اس سے بڑھ کر اجماع اور کیا ہوگا۔ اگر بیٹی والوں سے کچھ طلب کرنا باطل نہ ہوتا تو آخر کون سی چیز مانع تھی کہ پہلی صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے آغاز تک پوری امتِ مسلمہ اس سے پرہیز کرتی رہی اور اب چودھویں صدی کے ہندوستان میں یہ رواج دوسری اقوام سے مسلمانوں کے معاشروں میں آگھسا۔

یوں بھی سوچئے۔ لڑکی کے سرپرست لڑکی کے آرام و راحت کی خاطر جو کچھ دیں گے وہ لڑکی ہی کو تو دیں گے۔ ماں باپ کو شریعت نے اولاد کا کفیل و مربّی بنایا ہے۔ ان پر ذمہ داری عائد کی ہے کہ جب تک وہ بالغ نہ ہوں ان پر اپنا مال خرچ کرتے رہیں اور لڑکیاں جب بالغ ہو جائیں تو اپنی بساط اور استطاعت کے مطابق ان کے لئے کچھ سامان کر کے عقد کا فریضہ ادا کر دیا جائے اس اعتبار سے والدین کا اپنی لڑکی کو بطورِ جہیز کچھ ساز و سامان دینا بلاشبہ شریعت سے ہم آہنگ اور معقولیت سے ہم رشتہ ہے لیکن لڑکی کے والدین پر ایسی کوئی ذمہ داری شریعت نے عائد نہیں کی کہ وہ ہونے والے داماد کے لئے بھی کچھ ساز و سامان یا اس کے سرپرستوں کے لئے بھی کچھ نقدی مہیا کریں لہٰذا داماد یا اس کے سرپرست اگر مالی مطالبات کی کوئی فہرست لڑکی والوں کے آگے رکھتے ہیں تو وہ ایک ایسا فعل کرتے ہیں جس کا حق شریعت نے انھیں نہیں دیا۔ اس فعل کے نتیجے میں وہ لڑکی والوں پر ایسا مالی بوجھ ڈالتے ہیں جس سے شریعت نے انھیں آزاد رکھا تھا۔ اگر ہم غلط کہہ رہے ہیں تو جہیز

کی مروجہ رسم کے حامی حضرات قرآن یا حدیث سے ایسی کوئی نص (آیت یا حدیث) لاکر دکھلائیں جس سے ہماری غلطی ثابت ہو۔ یا رسولؐ یا صحابہ کرامؓ کے فعل و عمل کی کوئی نظیر پیش کریں۔

حق یہ ہے کہ جہیز کا معاملہ فی الحقیقت لڑکی اور اسکے سرپرستوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں جب لڑکے والوں کے مطالبات بھی داخل ہوگئے تو معاملہ کی نوعیت بدل گئی۔ اب گویا لڑکی کے سرپرستوں سے "جہیز" کے نام پر لڑکے والے اپنے لئے کچھ طلب کر رہے ہیں۔ اسے حرص و طمع کے سوا کیا کہیں گے۔ لوٹ مار، چوری، جیب تراشی، بلیک میلنگ، غصب، غبن، جس طرح مال حاصل کرنے کے یہ سارے ذرائع باطل ہیں اسی طرح نکاح کے معاملے میں لڑکی والوں کو مطالبات کی تلوار سے بے بس کر کے کچھ بھی وصول کرنا باطل ہی باطل ہے ——— ڈکیتی کا ایک مہذب طریقہ کسب حرام کا ایک جدید اسلوب۔

بات اگر صرف اتنی ہوتی کہ لڑکے والوں نے اتفاقاً ازراہِ بے تکلفی کسی چیز کی فرمائش کردی اور لڑکی والوں نے خوش دلی کے ساتھ اسے پورا کر دیا تو اس پر بولنے کی کوئی حاجت مصلحین کو نہیں تھی کیونکہ دوستانہ فرمائش اور دوستانہ داد و دہش اسلام کی نظر میں معیوب نہیں ہے۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ بات صرف اتنی نہیں۔ بات تو اس سے کہیں زیادہ بھیانک یہ ہے کہ نکاح سے قبل لڑکے والوں کی طرف سے لمبے چوڑے مطالبات با ایں طور پیش کئے جاتے ہیں کہ انھیں پورا نہ کروگے تو شادی نہیں کی جائے گی۔ لڑکی والا کسی بھی طرح ان مطالبات کو پورا کر دے تب تو شادی ہوگی ورنہ معاملہ ختم۔ یہ جبر اور دباؤ کی ایک قسم ہے۔ یہ ایک ظالمانہ اور ناپاک رواج ہے جس نے نکاح کی اسلامی روح اور حکمت و مصلحت کو ایڑیوں تلے روند دیا ہے۔

اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں کفار عرب لڑکیوں کی پیدائش کو مصیبتِ عظمیٰ تصور کرتے تھے۔ اسلام نے اس عذاب کو ختم کیا اور عورت کو اس کے حقوق، اس کی عزت و حرمت، اس کا وقار، اس کا صحیح درجہ اور مرتبہ عطا فرمایا۔ ایسے قوانین اور نظریات انسان کو دیئے کہ کوئی بھی والدین لڑکی کی پیدائش سے پریشانی محسوس نہ کریں اور ان کے دل و دماغ پر یہ سہم سوار نہ ہو کہ لڑکی جوان ہو کر ان کے لئے دشواری اور آزمائش کا سبب بنے گی۔ یہ قوانین و نظریات قرآن میں حدیث میں، پیغمبرؐ کے اسوے میں، صحابہؓ کے تعامل میں، علماءؒ و مجتہدینؒ کے ارشادات اور فتاویٰ میں بکھرے ہوئے ہیں۔ پوری امت ان کا احترام اور اعزاز کرتی آئی ہے۔ لیکن آج جہیز کی مروجہ رسم نے پھر سے لڑکی کے والدین پر اسی سہم، خوف اور پریشانی کا دروازہ کھول دیا ہے جس کو اسلام نے دور کیا تھا۔ آج لڑکیاں پھر سرپرستوں پر بار بنتی جارہی ہیں۔ آج وہ مسلمان پھر اپنے آپ کو بدنصیب خیال کر رہے ہیں جنھیں اللہ نے لڑکیاں عطا فرمائیں اور ان پر خوف طاری ہے کہ انھیں بیاہنے کے لئے وہ نہ جانے کن کن مطالبات کی تکمیل پر مجبور ہوں گے جہیز دینے کا مسئلہ ان کے لئے حسب گنجائش کچھ دینے کا مسئلہ نہیں رہا۔ یہ اطمینان انھیں قطعاً میسر نہیں کہ جتنی گنجائش اللہ نے دی ہے اس کے مطابق وہ اپنی پسند اور دلی رضامندی سے لڑکی کو کچھ دے دلا کر رخصت کرسکیں گے بلکہ وہ تو ڈرے سہمے بیٹھے ہیں کہ عنقریب ان کے سامنے ایسے مطالبات کا دفتر کھلنے والا ہے جنھیں پورا کرنے کے لئے انھیں خدا جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے ہوں گے۔ کس کس کے آگے ہاتھ پھیلانا ہوگا کہاں کہاں سے قرض لینا پڑے گا۔

بچی جوں جوں جوان ہوتی ہے ان کا خون خشک ہونے کی رفتار تیز ہوتی رہتی ہے۔ خود بچیاں ——— خصوصاً باشعور اور حساس بچیاں ایک ذہنی کرب اور روحانی عذاب میں مبتلا رہتی ہیں۔ انھیں اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور آتی ہوئی جوانی سے گھٹن ہوتی ہے۔ اپنے بار ہونے کا احساس اُن کے حواس پر ہتھوڑے بجاتا ہے۔ انھیں اپنے وجود ہی سے شرم آنے لگتی ہے جب وہ دیکھتی ہیں کہ ان کے ماں باپ خود ان کی وجہ سے خوف و دہشت اور فکر و غم کی آگ میں جھلس

رہے ہیں۔ لڑکے والوں کے مطالبات ایسے تو ہوتے نہیں کہ چٹکی بجاتے پورے کر دیئے جائیں اور کسی بھی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ ایک لکھ پتی آدمی سے سائیکل اور ریڈیو مانگا جائے تو بے شک وہ آسانی سے دے دیگا۔ دس بیس ہزار نقد بھی دے ڈالنا اس کے لئے دشوار نہیں مگر واقعات گواہ ہیں کہ مطالبات تو لڑکی والے کی حیثیت دیکھ کر کئے جاتے ہیں لکھ پتی ہے تو فقط سائیکل اور ریڈیو کون سسرا مانگے گا۔ دس بیس ہزار بھی وہاں کس کی نظر میں جچیں گے۔ وہاں تو بڑھ چڑھ کر مطالبات ہوں گے اور رئیس سے رئیس لڑکی والا بھی اپنی خیریت میں فرق محسوس کئے بغیر نہ رہے گا۔ عموماً یہ مطالبات لڑکی والے کو بری طرح زیر بار کر دیتے ہیں۔

مفروضے کے طور پر ہم مانے لیتے ہیں کہ ہزار میں ایک دو ایسے بھی لڑکی والے ہوں گے جو دولت کی غیر معمولی افراط کے باعث ہر طرح کے مطالبات کو بہ آسانی پورا کر سکیں مگر شادی تو گھر گھر کا مسئلہ ہے۔ گنتی کی چند مستثنیٰ مثالوں سے کیا ہوگا۔ کثیر الوقوع اور شائع ذائع صورتِ حال یہ ہے کہ جن مسلم حلقوں میں یہ ناپاک رواج گھس گیا ہے وہاں لڑکی والے غیر معمولی پریشانیوں کا شکار ہیں۔ یہ انتہائی افسوسناک صورتِ حال ہے جس کی قباحت و شناعت کے احساس سے فقط وہی لوگ عاری ہو سکتے ہیں جن کے دل و دماغ مسخ ہو گئے ہوں۔

اسلام نے شادی کو اتنا آسان بنایا تھا کہ کوئی بھی لڑکی والا پریشانی میں مبتلا نہ ہو اور لڑکیوں کا وجود کسی بھی گھرانے پر بار نہ بنے۔ سیدھا سادھا طریقہ۔ سرپرست اپنی حیثیت اور گنجائش کے مطابق بچی کے لئے جہیز تیار کر دیں اور کچھ گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول ہو جائے۔ مہر کی رسم جو بہرحال ضروری ہے اس کے لئے بھی یہ گنجائش رکھ دی گئی کہ قرض تصور کر لی جائے۔ اس گنجائش کا منشاء یہی تھا کہ غربت کی بنا پر شادیوں میں تاخیر نہ ہو اور جنسی جذبات کو غلط راہوں پر گامزنی کی شہ نہ ملے۔

ہم نے طرح طرح مسرفانہ رسوم اور نمود و نمائش کے طریقوں سے شادی کو مشکل بنایا اور آخر کار جہیز کی وہ باطل رسم بھی اپنالی جس میں لڑکے والے باقاعدہ مانگ مانگ کر لڑکی والوں کا خلیہ خراب کرتے ہیں۔ یہ اسلامی تعلیم، شرعی مصالح، اخلاقی اقدار اور وقار و شرافت کے احساسات کی اتنی کھلی تحقیر اور پامالی ہے کہ اس کا ادراک کرنے کے لئے عالم فاضل ہونے کی ضرورت نہیں۔ عقلِ سلیم ہانکے پکارے اس کی نشاندہی کرتی ہے اور کامن سینس اس پر گواہی دیتی ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ — فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (اللہ نے نفس پر اچھائی اور برائی کے احساسات کا الہام کر دیا ہے) اسی چیز کو محاورے میں "ضمیر" کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے۔ ضمیر اگر مر نہیں گیا ہے تو سوچئے کہ ایک عفیف دوشیزہ کے جسم پر تصرف کا حق حاصل کرنے والے مرد کے لئے کیا یہی بات مناسب نہیں ہے کہ وہ کچھ مالی بوجھ اُٹھائے۔ اس کے بجائے اگر وہ یا اس کے سرپرست خود اس دوشیزہ یا اس کے سرپرستوں سے مالی نفع حاصل کرنے کی فکر میں ہیں تو انسانی ضمیر کے نزدیک یہ ظلم، طمع، ہوس اور بے انصافی کے سوا اور کیا ہوگا — اندھی سیدھی بکواس تو شرابی اور زانی بھی اپنے افعالِ شنیعہ کی وکالت میں کر ہی ڈالتے ہیں۔ اسی نوع کی بکواس ہم نے ان نادانوں سے بھی سنی ہے جو اسلام سے بے بہرہ اور حرص و آز میں مبتلا ہو کر زیر بحث رسم کی تائید و حمایت کرتے ہیں مگر معقولیت کا جہاں تک تعلق ہے ہمارے نزدیک کسی بھی شریف النفس اور سلیم الطبع انسان کو اس میں ذرہ برابر شک نہ ہونا چاہئے کہ یہ رسم باطل ہے۔ سفاکانہ ہے۔ غیر شریفانہ ہے۔ اخلاق سوز ہے۔ انسانیت کش ہے۔ گھناؤنی اور ناپاک ہے۔

آپ کا کوئی دوست لکھ پتی ہو اور آپ کی فرمائش پر بلا تکلف دو چار ہزار دے سکتا ہو تب بھی آپ یہ پسند نہ کریں گے کہ خواہ مخواہ بلا استحقاق اس کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ خودداری اور وقار بھی آخر کوئی چیز ہے۔ مان لیجئے آپ اپنے لڑکے کا نکاح ایک رئیس کی لڑکی سے کرنا چاہتے ہیں اور یہ رئیس اس پوزیشن میں ہے کہ لاکھ دو لاکھ کا

جہیز اپنی لڑکی کو دے ڈالے۔ تو کیا محض اس کی ریاست کی بنا پر آپ کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ فرمائشیں شروع کر دیں ہم تو صریحاً اسے کمینہ پن سمجھتے ہیں جو بے ضمیر اور بے حیا لالچی لوگوں ہی کو زیب دے سکتا ہے۔ شرافت اور باضمیری اس میں ہے کہ آپ کی طرف سے دستِ سوال دراز نہ ہو۔ رئیس اپنی مرضی اور صواب دید سے جو کچھ بھی اپنی لڑکی کو دیدے سر آنکھوں پر۔ آپ کی طرف سے فرمائش اور مطالبہ بھیک مانگنے کے مرادف ہوگا۔ کیونکہ مانگنے کا اور کوئی حق تو دینِ دنیا کے کسی بھی معقول آئین کی رو سے آپ کو ہے نہیں۔ نہ خودداری اور وقار و شرافت اس کی اجازت دیتے ہیں۔ پھر سوائے بھیک کے اور یہ کیا ہوگا۔ ہاں چونکہ رسم و رواج نے اس مانگنے کو "شرط" کی حیثیت دیدی ہے یعنی لڑکی والا لازماً آپ کا مطالبہ پورا کرے لہٰذا بھیک سے ترقی کر کے اس پر لوٹ اور چھین جھپٹ کا اطلاق ہوگا۔ جدید اصطلاح میں بلیک میکنگ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ظلم، جبر، دھاندلی، حرام خوری ہر لفظ اس پر چسپاں ہوتا ہے۔ حلال خوری کی جتنی صورتیں شریعت نے بتائی ہیں انہیں اس صورت کو تلاش کیجئے ہرگز نہ ملے گی ہاں آیتِ قرآنی لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل کا حکم امتناعی کھلم کھلا عائد ہوگا۔

زنا، بادہ نوشی، چوری، قتل بہت بڑے گناہ ہیں، لیکن ان کی نوعیت انفرادی ہے۔ یقین کیجئے کہ جو رسمیں اجتماعی نقصان اور عذاب کا باعث ہوں وہ اللہ اور رسولؐ کے نزدیک انفرادی نوع کے گناہوں سے کہیں بدتر اور موجب عذاب ہیں۔ یہ جہیز والی رسم پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہے۔ وسیع الاثر ہے۔ اس کو معمولی نہ سمجھئے۔ یہ تو دراصل ایک قسم کی بغاوت ہے دین و شریعت کی روح اور اسلامی تعلیم کے مقصد و مدعا سے۔ اس میں حکمتِ دین سے بیزاری اور اقدارِ اخلاق سے سرکشی اور دولت پرستی سے شغف اور فکرِ سلیم سے انحراف پایا جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ ایسی فساد انگیز اور تباہ کن رسموں کو مسلمان معاشرے میں لانے والوں اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کو آخرت میں زانیوں اور شرابیوں اور چوروں سے بڑھ کر سزا ملے۔ ہماری عاجزانہ نصیحت ہے کہ ہر مسلمان جو بھی کوشش ایسے رواجوں اور رسموں کو مٹانے کی کر سکتا ہو ضرور کرے۔ اس کا بہت بڑا اجر ہے۔

ہاں لطف کی بات یہ ہے کہ جو ذرا معقول اعتراض ہماری تحریر پر ہو سکتا تھا وہ آپ نے کیا ہی نہیں۔ ہمارے منقولہ فقرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جس طرح لڑکے والوں کا لڑکی والوں سے کچھ مانگنا حرام ہے اسی طرح لڑکی والوں کا بھی لڑکے والوں سے کوئی مالی مطالبہ کرنا حرام ہے۔

مگر یہ درست نہیں۔ لڑکی والوں کو شریعت نے حق دیا ہے کہ وہ لڑکے والوں سے بطور مہر ایک رقم طلب کریں اور ضروری سمجھیں تو بعض اور بھی ایسے شرائط عائد کریں جو لڑکی کے مفاد میں ہوں اور جن سے اس کے مستقبل کا تحفظ مقصود ہو۔ آپ کا اعتراض معقول ہوتا اگر ہمارے فقرے کی یہ کمزوری پکڑ لیتے۔ گفتگو آ ہی گئی ہے تو ہم اس غلط فہمی کو رفع کرتے ہیں جو ہمارے فقرے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

"ایمان نمبر" کا وہ جواب جس سے ہمارا فقرہ آپ نے نقل فرمایا، ایک ایسا جواب ہے جس کا سوال ہم نے شائع نہیں کیا اس سوال میں دونوں طرف کے بعض بہت ہی نامعقول اور مسرفانہ مطالبات کا تذکرہ تھا۔ ہم نے ان ہی کی مطابقت سے جواب دیا اور پھر از راہ اختصار اس جواب کا بھی جزوی حصہ شاملِ اشاعت کر سکے۔ اسی لئے اس سے غلط فہمی کا امکان ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ لڑکی والوں سے لڑکے والوں کو تو مالی مطالبات کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں۔ ہاں لڑکی والوں کو حق عطا کیا گیا ہے لیکن لڑکی والوں کو بھی اپنا یہ حق انصاف اور معقولیت کی حدود میں رہ کر استعمال

کرنا چاہیئے۔ مثلاً مہر کا مطالبہ تو برحق ہے لیکن اسے بے تحاشا نہیں ہونا چاہیئے اور یہ ضد بھی نہیں ہونی چاہیئے کہ سارا فوراً ادا کر دو۔ اسی طرح یہ حق تو ہر حال ہے کہ حالات کی مناسبت سے لڑکی کے لئے رہنے کے مکان یا کسی اور ضروری شے کا مطالبہ کر دیا جائے لیکن اس میں بھی اعتدال و توسّط ہو۔ اسراف اور تعیش کا ذہن نہ ہو۔ شریعتِ اسلامیہ چاہتی ہے کہ نکاح کا مرحلہ غریب امیر سب کے لئے بہت آسان رہے۔ کوئی بھی فریق اس آسانی کو دشواری میں بدلنے والا کوئی رویّہ اختیار کرے گا تو شریعت اسے خطا کار قرار دے گی۔

یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ شادی کی قانونی اور اصولی نوعیت تو وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا یعنی مرد خریدار ہے۔ عورت فروخت کنندہ اور بکنے والی شے جسمانی حقِ تصرف۔ لیکن مقصد کے اعتبار سے یہ تجارت اور کاروبار نہیں ہے بلکہ جسموں کے ساتھ دلوں اور روحوں کے تعلق کا معاملہ ہے۔ اللہ نے دو جنسیں اور صنفیں پیدا کیں جن کے درمیان ایک دوسرے کے لئے شدید میلان رکھا۔ پیٹ کی بھوک کے مانند جنسی بھوک ودیعت فرمائی اور ہدایت کی کہ اس بھوک کو عقدِ نکاح کے ذریعہ مٹاؤ۔ اسی کے ساتھ یہ واضح فرمایا کہ اگرچہ تکوینی اعتباً سے جنسی تعلق ایک ناگزیر بنیادی ضرورت ہے لیکن میاں بیوی کا آپس میں محبت کرنا اور ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھنا بھی انتہائی ضروری ہے۔ ان میں دلی رفاقت، روحانی اُنس اور شعوری میلان کا تعلق ہونا چاہیئے۔ مالی استحصال اور حرص و آز کی ذہنیت بیچ میں نہیں آنی چاہیئے۔

جہیز کی رسم نے اس مقصدِ شرعی کو سخت نقصان پہنچایا۔ لڑکے والوں کے لئے لڑکی کی پذیرائی کا مدار اس پر ٹھیرا کہ وہ کب اور کتنا جہیز لاتی ہے۔ صورت اور سیرت کی خوبیاں دور جا پڑیں حالانکہ یہی خوبیاں شرعاً اہم تھیں۔ مزید قباحت یہ کہ شریعت نے تو خریدار کی حیثیت سے مرد پر مالی بوجھ ڈالا تھا اور لڑکی کو مستحق قرار دیا تھا کہ اپنی ایک قیمتی متاع کے بدلے مرد سے مال وصول کرلے مگر اس ناپاک رسم نے پہیئے کو اُلٹا گھما دیا اور شادی ایک ایسا معاملہ بن گئی جس میں لڑکی کو ملنے والی رقم (مہر کی رقم) تو اُدھار رہتی ہے مگر داماد صاحب اور ان کے سرپرست لڑکی کے سرپرستوں سے ہاتھوں ہاتھ مالی نفع اُٹھا لیتے ہیں۔ ریڈیو بھی لاؤ۔ موٹر بھی لاؤ۔ اسکوٹر بھی لاؤ۔ اتنے تولے سونا بھی لاؤ۔ اتنا روپیہ نقد بھی لاؤ۔ صریح لوٹ مار اور پست کرداری۔ اسے بھی ہم اور آپ شریعتِ حقہ سے مذاق اور حسنِ اخلاق سے استہزاء اور شرافت و نجابت سے ٹھٹول اور حرص و طمع سے دل لگی نہ سمجھیں تو پھر کونسا گناہ ہوگا جسے ہم گناہ مان سکیں گے۔

غائبانہ نمازِ جنازہ

سوال ۳: از۔ غلام رسول۔ کشمیر۔

غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنا کیا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو اس کے لئے کیا طریقۂ کار ہے۔ کیا عالمِ دین کے سوا کوئی اپنے کسی رشتہ دار کو غائبانہ نماز پڑھا سکتا ہے؟ زمانۂ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا کوئی واقعہ جو اس سلسلے میں رونما ہوا ہے وہ بھی بیان فرمایا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ اور دیگر علماء کا اس بارے میں کیا مسلک ہے؟

جواب ۳:

غائبانہ نمازِ جنازہ کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ احناف اور مالکیہ کے نزدیک میّت کی موجودگی ضروری ہے۔ بغیر موجودگی کے نماز درست نہ ہوگی۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک موجودگی شرط نہیں غائبانہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔

حبش کے حکمراں نجاشی کا جب انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سمیت مدینے ہی میں اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ یہ تاریخ کا ثابت شدہ واقعہ ہے لہٰذا شوافع اور حنابلہ اسے دلیل میں لاتے ہیں۔ مگر یہ استدلال کمزور ہے۔ اگر نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ کوئی مخصوص استثنائی شے نہ ہوتی تو کیا وجہ بھی کہ حضورؐ اور ان کے اصحابؓ نے اُن

کثیر صحابہؓ کی غائبانہ نمازِ جنازہ نہ پڑھی جو دفعتاً شہید کر دیئے گئے تھے اور حضرت جبریلؑ نے حضورؐ کو انکی شہادت کی خبر دی تھی۔ شہداء میں حضرت خبیبؓ جیسے جلیل القدر صحابہ شامل تھے پھر بھی حضورؐ کا ان کے لئے غائبانہ نمازِ جنازہ نہ پڑھنا قرینہ ہے اس بات کا کہ اصولاً یہ نماز درست نہیں۔

نجاشی والے معاملے میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی میت حضورؐ کے سامنے کر دی ہو۔ یہ کورا قیاس ہی نہیں بلکہ مشہور حنفی امامِ فقہ علامہ زیلعی نے نصب الرّایۃ میں ایک روایت بھی نقل فرمائی ہے کہ صحابیِ رسولؐ حضرت عمران بن حصینؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تمہارے بھائی نجاشی وفات پا گئے ہیں، اٹھو اور ان پر نماز پڑھو۔ پھر حضورؐ کھڑے ہو گئے اور صحابہؓ نے نماز کیلئے صفیں باندھیں۔ ان کا خیال دراصل یہی تھا کہ نجاشی کا جنازہ رسول اللہؐ کے سامنے رکھا ہوا ہے۔

کسی بھی صحیح العقیدہ مسلمان کو یہ باور کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ حضورؐ کے ساتھ اللہ کا خاص معاملہ بھی تھا۔ آپ کو معجزات عطا فرمائے۔ آپ پر کتنے ہی اُمورِ غیب منکشف کئے۔ آپ کے لئے جبریلؑ جیسا معظم فرشتہ مامور فرمایا کیا بعید ہے کہ نجاشی کا جنازہ سامنے کر دیا ہو۔ حضورؐ سے غائبانہ نمازِ جنازہ کی صرف یہی ایک نظیر ملنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے امت کے لئے حجت نہیں بنا سکتے ورنہ اس کا کیا جواب ہوگا کہ آپ نے ان بے شمار صحابہؓ کی غائبانہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جو مدینے سے باہر شہادت پاتے گئے۔ ان شہید صحابہؓ سے آپؐ کو کچھ کم محبت نہ تھی۔ نجاشی کے مقابلے میں وہ زیادہ ہی محبوب تھے۔

بہرحال ہم احناف کے نزدیک غائبانہ نمازِ جنازہ درست نہیں ہے۔ جن کے نزدیک درست ہو وہ پڑھ لیں۔ ان سے لڑنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بھی ایک دلیلِ شرعی ہی کے تحت ایسا کر رہے ہیں۔

عالم یا عامی سب کا حکم اس معاملہ میں یکساں ہے۔ یعنی جس طرح کسی عام آدمی کی غائبانہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے اسی طرح عالم اور شیخ اور مرشد کی بھی غائبانہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہیئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایک حدیث کا مطلب

سوال :- از سید حسین احمد۔ گوا۔

آپ نے کتاب "کلام نبوت" کا مطالعہ کیا ہوگا اور اگر نہیں کیا تو میں کر رہا ہوں جس کے مصنف مولانا محمد فاروق صاحب ہیں۔ اس کتاب میں جو مقدمہ کے بعد "منصب نبوت" ہے اس میں ایک حدیث آنکھوں سے گذری خیال کیا کہ آپ کا ہی سہارا لوں۔ لیجئے حدیث بھی سُن لیجئے :-

اَیَحْسَبُ اَحَدُکُمْ مُتَّکِئًا الخ۔

تردد اس بات پر ہوا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن باتوں کا حکم دے رہے ہیں جو نصیحتیں کر رہے ہیں اور جن باتوں سے منع فرما رہے ہیں ان کو مثلِ قرآن کہا یعنی جس طرح قرآن منع کرتا ہے اسی طرح اس کو منع جانو۔ یہاں تک تو دل کو لگا۔ لیکن آگے زیادہ کا سوال یعنی لفظ (واکثر) حکمِ قرآن کو درجۂ کمی میں ڈال دیتا ہے اور حکمِ قرآن حکم اللہ کا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ کے حکم پر نبی کے حکم کو فضیلت ہے۔ واللہ اعلم

جواب :-

یہ ایمان کی زندگی کی علامت ہے کہ آپ نے ایسا سوال کیا۔ جو مسلمان صحیح العقیدہ ہوگا اسے ضرور ہر ایسی روایت کھٹکے گی جس سے اللہ کی شان پر حرف آتا ہو۔

لیکن تشویش میں مت پڑیئے۔ آپ کے سمجھنے میں خطا ہوئی ہے۔ روایت اپنی جگہ بے غبار ہے۔

"کلام نبوت" میں پوری روایت دے کر ترجمہ یہ کیا گیا ہے :-

"کیا تم میں سے کوئی شخص اپنی مسند پہ تکیہ لگائے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے کوئی چیز حرام نہیں کی

ہے سوائے ان چیزوں کے جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ خبردار رہو۔ خدا کی قسم میں نے جن باتوں کا حکم دیا ہے اور جو نصیحتیں کی ہیں اور جن باتوں سے منع کیا ہے وہ قرآن ہی کی طرح ہیں بلکہ کچھ زیادہ۔"

آخری فقرہ جس عربی جملے کا ترجمہ ہے وہ یہ ہے:۔

"انھا لمثل القرآن واکثر"

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حلال وحرام کے سلسلے میں قرآنی احکام واجب القبول ہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینی امور میں جو احکام صادر فرمائے ہیں وہ بھی واجب القبول ہیں۔ اور حضورؐ کے صادر فرمودہ احکام، ہدایات اور نصائح کی تعداد اور گنتی قرآنی احکام وہدایات کی تعداد اور گنتی سے زیادہ ہے۔

یہی حدیث اگر مشکوٰۃ میں پوری پڑھی جائے تو اسمیں خود حضورؐ نے تمثیلاً بعض ایسے احکام ذکر فرمائے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں مگر وہ فی الحقیقت اللہ ہی کے احکام ہیں جو حضورؐ کی زبان سے صادر ہوئے۔ جیسے قرآن میں تو یہ مذکور نہیں کہ اہلِ کتاب کے گھروں میں بلا اجازت داخل مت ہو۔ لیکن حضورؐ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اہلِ کتاب کے گھروں میں بلا اجازت داخل ہونا حرام ٹھیرایا ہے۔ اب یہ حرمت اگرچہ قرآن میں مذکور نہیں بلکہ زبانِ رسالتؐ سے ہم تک پہنچی ہے مگر دینی شریعت کے معاملے میں اللہ کے پیغمبرؐ اپنے دل سے گھڑ کر کچھ نہیں کہا کرتے بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے علم وآگہی کے تحت زبان کھولتے ہیں، اس لئے اسے ماننا اسی طرح واجب ہے جس طرح قرآنی احکام کو ماننا۔

"واکثر" کا مطلب اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس سے درجے اور مرتبے کی فضیلت مراد نہیں بلکہ گنتی مراد ہے۔ حضورؐ نے جتنے دینی احکام صادر فرمائے ان کا شمار قرآنی متن کے احکام سے زیادہ ہے۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے قرآن کے توسط سے اللہ کے جو احکام بندوں کو پہنچائے شریعت صرف ان ہی احکام میں محدود نہیں ہے بلکہ ان سے زائد بھی کچھ احکام شریعت کا لازمی جزو ہیں جنھیں حضورؐ نے قرآن کے بجائے اپنی زبان میں صادر فرمایا ہے۔

بہر حال حکم الٰہی پر نعوذ باللہ حکم رسول کی فضیلت اور فوقیت کا وہم دل سے نکال پھینکئے۔ حدیث کے الفاظ قرآن کا درجہ نہیں گھٹاتے بلکہ یہ سبق دیتے ہیں کہ تمام احکامِ شرعیہ کو قرآن میں محدود نہ سمجھو بلکہ اللہ کے آخری رسولؐ نے وحی کی روشنی میں زائد از قرآن جو احکام دیئے وہ بھی عین شریعت ہی ہیں۔ نبی کے حکم کو اللہ کے حکم پر فضیلت ملنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے جب کہ نبی تو اللہ ہی کے احکام پہنچانے والا اور اسی کی ہدایات کی شرح کرنے والا ہے۔

امید ہے اب خلجان ختم ہو گیا ہوگا۔

کذب اور نبوت

سوال:۔ از۔ یاد علی وارثی۔ ضلع بستی۔

زید کا یہ عقیدہ کہ کذب کو منافی شانِ نبوت بایں معنی سمجھنا کہ یہ معصیت ہے اور انبیاء علیہم السلام معاصی سے معصوم ہیں، غلطی سے خالی نہیں کیسا ہے؟

جواب:۔

ہمارا خیال ہے کہ عوام الناس کو ایسی بحثوں میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ ایک طرف انبیاء علیہم السلام کی عظمتِ شان دوسری طرف زبان ولغت کی باریکیاں۔ تیسری طرف تعبیرات کی رنگارنگی ان تمام پہلوؤں کی شایانِ شان رعایت اونچے درجے کے اہلِ علم ہی کر سکتے ہیں۔ عام لوگ یا قلیل علم وفہم رکھنے والے اصحاب صحیح طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

اب مثلاً ایک بحث تو یہی ہے کہ کذب کسے کہتے ہیں۔ قدیم اربابِ فن نے مختلف الفاظ میں "کذب" کی تعریف وتشریح کی ہے۔ پھر ایک بحث یہ ہے کہ کوئی خلاف واقعہ بات زبان سے نکالنا کیا ہر حال میں کذب کہلائے گا یا نیت کی تحقیق بھی کی جائے گی۔

قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے

کہ انھوں نے جب بتوں کو توڑ ڈالا تھا اور ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ یہ حرکت کس نے کی تو انھوں نے اشارہ کر دیا تھا کہ بڑے بت کی۔ یہ اشارہ یا قول ظاہر ہے کہ واقعہ کے خلاف تھا۔ توڑنے والے تو خود حضرت ابراہیم تھے نہ کہ بڑا بت پھر اسی طرح حضرت موصوف نے بت پرستوں کے ساتھ نہ جانے کے لئے یہ عذر پیش کر دیا تھا کہ میں بیمار ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں حالانکہ واقعۃً آپ بیمار نہیں تھے۔ ارادہ کچھ اور ہی تھا۔

حدیث قوی میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تین کذب بیانیوں کے مرتکب ہوئے۔ شریعت میں متعدد مواقع ایسے ذکر ہوئے ہیں جن میں کذب کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ واجب ہوتا ہے۔ کذب کی متعدد نوعیتوں کو جہاد میں حلال قرار دیا گیا ہے۔

غرض یہ ایک ذیل در ذیل اور پہلودار بحث ہے جس میں عوام کو نہیں پڑنا چاہیئے۔ اتنا ہی عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔ وہ ارادۃً گناہ نہیں کرتے تھے۔ ان سے کچھ لغزشیں بھی ہوئیں تو سہواً۔ اللہ نے ان لغزشوں پر تنبیہ فرمائی اور معاف کر دیا۔ زیادہ بڑی لغزش ہوئی تو سزا دے کر انھیں پاک کر دیا جیسے حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں قید کیا اور پھر معاف کر دیا۔

علمی و اصولی اعتبار سے یہ بات صحیح ہے کہ کذب منافیِ نبوت نہیں لیکن یہ الفاظ بغیر تشریح کے چونکہ خطرناک اور چونکا دینے والے ہیں اس لئے ان کی بحث ہی میں کیوں پڑا جائے۔

حضورؐ کی بشریت

سوال ۲۷:۔ (ایضاً)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہی جیسا بشر سمجھنے والا غلطی پر ہے یا نہیں؟

جواب ۲۷:۔

اس موضوع پر ہم بارہا لکھ چکے ہیں۔

بشر اولادِ آدم کو کہتے ہیں۔ ہر وہ ذی روح جو آدمی ہے بشر ہے۔ بشر کے جدِ امجد حضرت آدمؑ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت آدمؑ ہی کی اولاد میں لہٰذا طبعی اور سائنسی اور حقیقی لحاظ سے ہر اللہ کا بندہ یکساں طور پر بشر ہے خواہ وہ کافر ہو یا مسلم۔ نبی ہو یا غیر نبی صالح ہو یا فاجر۔

قرآن میں فرمایا گیا۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ الآیہ

اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ میں بھی تمھارے ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ میری خصوصیت بس یہ ہے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ وحی بھیجتا ہے اور مجھے اس نے اپنا پیغام پہنچانے کے لئے چن لیا ہے۔

اس ارشادِ باری کا ماحصل یہی تو ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوعی اعتبار سے فرشتے نہیں۔ جن نہیں۔ کوئی اور مافوق الفطرت مخلوق نہیں بلکہ نوعِ بشری کے ایک فرد ہیں۔ آدمؑ کے بیٹے ہیں۔ جملہ انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں۔ خمیر سب کا ایک ہے۔ مادۂ تخلیق ایک ہے نوع اور قسم ایک ہے۔ اصلاً اور بنیاداً ان میں کوئی تفاوت نہیں۔

اب رہا درجات و مقامات کا فرق اور تفاوت۔ تو اس کے لئے اللہ نے قرآن میں فرما ہی دیا ہے کہ ہم نے نہ صرف عام انسانوں اور نبیوں کے مابین مراتب و درجات کا فرق رکھا بلکہ خود انبیاء میں بھی بعض بعض سے افضل ہیں۔ محمدِ عربی سب سے ہی افضل ہیں۔ ان کی برابری کون کر سکتا ہے

یہ فرق و تفاوت اور امتیاز در اصل اوصاف کا ہے۔ نفسِ بشریت کا نہیں۔ اوصاف میں ہم غلامانِ غلام انبیاءؑ جیسے تو کیا ہوں گے صحابہؓ جیسے بھی نہیں۔ مراتب میں ہمارا درجہ اولیاء و ائمہ سے بھی کہیں نیچے ہے۔ یہی وہ تفصیل و توضیح ہے جسے یاد رکھنا چاہیئے۔ کوئی مسلمان پاگل ہوئے بغیر یہ نہیں کہہ سکتا کہ خلاصۂ کائنات، سید الابرار، خاتم الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوصاف و مراتب اور درجات و مناقب کے اعتبار سے ہمارے ہی جیسے بشر ہیں۔

ایسا تو وہم بھی کسی کے حاشیۂ خیال میں نہیں آسکتا۔ البتہ جبلّی اعتبار سے قرآن نے انھیں ہم جیسا بشر کہا ہے اس اعتبار سے وہ یقیناً اور حتماً ہم جیسے ہی بشر ہیں۔ اگر اس کا انکار کیا جائے تو قرآن کا انکار ہوگا۔

افسوس ہے ان احمق عقیدت مندوں اور کوتاہ فہم عاشقانِ رسول ﷺ پر جنھوں نے اس صاف وسادہ حقیقت کو اپنی غلو پسندیوں اور توہّم پرستیوں سے ایسا الجھایا کہ آج بشریتِ رسول ﷺ ایک مستقل موضوعِ اختلاف ہے اور کتنے ہی مسخرے تو اس سلسلے میں شریعت کی حدود سے گذر گئے ہیں۔

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو نعوذ باللہ خدا کا بیٹا بنادیا وہ بھی ایسی ہی غالی اور غیر عقلی عقیدتمندی کا شاخسانہ تھا۔ پھر دیکھ لو کہ آج بھی کروڑوں افراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ ماننے ہی چلے جارہے ہیں۔ اسی طرح گمراہ کن تصوف اور ایمان سوز طریقت کے مارے ہوئے ایک طبقے نے جو بدقسمتی سے مسلمانوں ہی کا طبقہ ہے دین میں طرح طرح کی بدعقلیاں داخل کیں۔ حضور ﷺ کے بارے میں نوع بہ نوع عقائد گھڑے اور آپ ﷺ کی بشریت تک کو معرضِ بحث میں لا ڈالا حالانکہ بحث کا کوئی سوال ہی نہ اٹھتا اگر کمزور روایات اور واہی خیالات سے دامن بچا کر قرآنِ کریم اور احادیثِ صحیحہ پر تکیہ کیا جاتا۔

آپ کے چند لفظی سوال کے جواب میں اتنا لمبا جواب ہم نے اس لئے لکھا کہ جو ذہن آپ کے سوال میں بول رہا ہے وہ وہی فاسد ذہن ہے جس نے بڑے فساد اٹھائے ہیں۔ اگر اس ذہن کا سایہ آپ پر نہ پڑا ہوتا تو اس طرح کا سوال ہی آپ کے تصور میں نہ آتا۔

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو لایعنی بحثوں سے بچائے اور توفیق دے کہ عقیدت کی افراط اور غلو اور دماغی خلل اور توہم پرستی سے پرہیز کرے۔

حقانی صاحب کی "شریعت یا جہالت"

سوال :۔ از۔ عبدالرحمٰن۔ جمشید پور۔

محمد یالن حقانی صاحب کی کتاب "شریعت یا جہالت" آپ کی نظروں سے گذری ہوگی اور اس وقت بھی یقیناً آپ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۰۰ پر سورہ بقرہ کے سترھویں رکوع کے اندر جو آیت نمبر ۱۴۳ ہے اس کا ترجمہ انھوں نے اس طرح کیا ہے :۔

"ہم نے اسی طرح تمھیں عادل (انصاف کرنے والی) امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو جائے۔"

پھر اسی سلسلے میں آگے لکھتے ہیں :۔

"سبحان اللہ یہ شان ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی جو بھلائی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکنے والے ہیں۔ اُن کی گواہی سے بعض نبیوں کا چھٹکارہ ہوگا۔"

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

"میرے پیارے بھائیو! یہ مرتبہ اور عالی شان مقام ہے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان یہ لوگ گواہ، منصف فیصل اور جج بن کر کھڑے ہوں گے۔"

(۱) کیا مولانا صاحب نے آیتِ مذکورہ کا ترجمہ صحیح فرمایا ہے؟

(۲) کیا ان کی یہ روایت صحیح ہے کہ اُمتِ محمدی ﷺ کی گواہی سے بعض نبیوں کا چھٹکارہ ہوگا؟

(۳) یہ فرمانا کہاں تک درست ہے کہ یہ امت (قیامت میں) نہ صرف گواہ ہوگی بلکہ منصف، فیصل اور جج بھی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں یہ امت کرسیٔ عدالت پر جلوہ گر ہوگی۔

جواب :۔

آپ کا یہ خط جون ۶۳ء میں ملا تھا۔ جواب کا نمبر اب آیا۔ اب تو دسمبر ۶۳ء کے تجلی سے آپ کو معلوم ہی ہوگیا ہوگا

کہ حقانی صاحب کی یہ کتاب صرف ہم نے پڑھی ہے بلکہ اسکو سراہتے بھی ہیں اور ۶۲ء میں اس پر تائیدی تبصرہ کرنے کے بعد مذکورہ شمارے میں مستقل اداریہ بھی لکھ چکے ہیں۔

خامیوں سے بالکلیہ پاک کتاب اللہ کے سوا کوئی کتاب نہیں۔ خامیاں حقانی صاحب کی کتاب میں بھی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے سوا دنیا کا بھلے سے بھلا آدمی خامی اور خطا سے بالکل مبرّا نہیں ہو سکتا۔ آپ اور ہم جب کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ بہت ہی بھلا اور قابلِ تعریف آدمی ہے تو مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ ہر طرح کی خامی اور عیب سے پاک ہے، بلکہ یہ ریمارک غالب حال کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ یعنی اس شخص کی خوبیاں اس کی خامیوں پر غالب ہیں۔ اسی طرح حقانی صاحب کی کتاب من حیث المجموع توصیف کے قابل ہے۔ عقائدِ صحیحہ پر زور دینے والی۔ شرک و بدعت اور خرافات ولغویات کا رد کرنے والی۔ دردمندی اور اخلاص پر مشتمل۔ قرآن و حدیث کے مضامینِ مبارکہ سے لبریز۔

رہیں جزوی خامیاں۔ تو بے شک ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس مقام پر آپ نے انگلی رکھی ہے وہ واقعی فصاحت و بلاغت سے کچھ ہٹا ہوا ہے۔ حقانی صاحب الفاظ کے انتخاب میں بہت زیادہ ثقاہت کا ثبوت نہیں دے سکے ہیں۔

البتہ آیت کا ترجمہ انھوں نے غلط نہیں کیا۔ ترجمہ کرنے کے تو وہ اہل بھی نہیں نہ انھیں اہلیت کا دعویٰ ہے — وہ بیچارے تو خود بھی وضاحت کرتے ہیں کہ میں فقط اردو داں ہوں۔ اُردو کتابوں ہی سے سب کچھ لیا ہے۔ آیت کا ترجمہ انھوں نے کسی مترجم قرآن سے نقل کیا ہوگا جو غلط نہیں ہے۔ البتہ خود اپنی تقریرِ کلام میں لفظ "چھٹکارا" استعمال کرکے انھوں نے معمولی سی چوک کی۔ ہمارا خیال ہے کہ نبیوں کے چھٹکارے والی بات صرف طرزِ بیان کی غلطی ہے ورنہ اس کی اصل حدیث میں موجود ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مُسند میں صحابیِ رسول حضرت ابوسعیدؓ کی روایت نقل کی ہے کہ:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن کوئی نبی تو ایسا سامنے آئے گا جس کے ساتھ بس ایک ہی آدمی ہوگا۔ کوئی ایسا آئے گا جس کے ساتھ دو آدمی ہوں گے اور کوئی ایسا جس کے ساتھ کچھ زیادہ ہوں گے وہ اپنی قوم کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ کیا میں نے تمھیں اللہ کا پیغام نہیں پہنچا دیا تھا۔ قوم جواب دے گی۔ نہیں۔ ہمیں کہاں پہنچایا تھا!۔ اس پر نبی سے پوچھا جائے گا آپ کیا کہتے ہیں کیا واقعی آپ نے پہنچا دیا تھا؟ نبی جواب دے گا جی ہاں پہنچا دیا تھا۔ پوچھا جائے گا کون گواہ ہے تمھارا۔ وہ کہے گا محمدؐ اور ان کی امت۔ اب محمدؐ اور ان کی امت کو بلایا جائیگا اور شہادت چاہی جائے گی۔ امت جواب دے گی کہ بے شک انبیاء درست کہہ رہے ہیں انھوں نے اپنی قوموں کو خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ سوال ہوگا تمھیں کیسے معلوم؟ افرادِ امت کہیں گے کہ ہمارے پاس آخری رسول محمدؐ تشریف لائے اور انھوں نے ہمیں خبر دی کہ رسولوں نے اپنی قوموں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔"

مزید ایک روایت میں ہے کہ اس کے بعد حضورؐ سے تصدیق چاہی جائے گی کہ آپ کی امت ٹھیک کہہ رہی ہے یا غلط؟ آپ تصدیق فرمائیں گے کہ اس نے غلط نہیں کہا۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۵)

یہ ہے وہ مضمون حدیث جسے حقانی صاحب نے کہیں پڑھا اور اس کی تعبیر اپنے الفاظ میں پیش کر دی ہے۔ دیکھ لیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کے مطابق انبیائے سابق کی قومیں صاف ان کے منھ پر جھوٹ بولیں گی اور اگرچہ اللہ کے علم میں ہر ایک کا جھوٹ یقیناً ہے لیکن عدالتی ضوابط کو پورا کرنے کے لئے بہرحال اس کی ضرورت پڑے گی کہ انبیاء کے صادق اور ان کی قوموں کے کاذب ہونے کی شہادت ملے۔ یہ شہادت امتِ محمدیؐ ہی دے گی۔ امتِ محمدیؐ کی تصدیق خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے اور تب انبیاء کو اس الجھیڑے سے نجات

لے گی اور وہ اطمینان کا سانس لیں گے کہ ان کی قوموں نے جھوٹ
بول کر جو فساد کھڑا کر دیا تھا وہ ختم ہوا اور وہ الزام سے بری الذمہ
ہو گئے۔

اس صورتِ حال کو اگر کوئی شخص چھٹکارا پانے سے
تعبیر کر دیتا ہے تو کوئی بڑی غلطی نہیں کرتا چھٹکارا کسی پریشانی یا
الجھن سے نجات ہی کو کہتے ہیں۔ الجھن اور پریشانی کی بات ہی ہوگی
قومیں منھ پر جھوٹ بول رہی ہیں۔ بے چارے انبیاء کیسے اُھیر
ہوں اور خود کو سچا ثابت کریں۔ عدالتِ آلٰہیہ تو شہادت طلب
کر رہی ہے۔ امتِ محمدیہ کی گواہی اگر اس موقع پر فیصلہ کن
ثابت ہو گئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ انبیاءؑ کا الزام سے چھٹکارا
اسی گواہی کی بناء پر ہوا۔

زیادہ اچھا ہوتا اگر کوئی اور اندازِ تعبیر اختیار کیا جاتا۔
مگر گناہ نہیں ہوا اگر یہ اندازِ تعبیر بھی اختیار کر لیا گیا۔

ہاں منصف، فیصل اور جج کے الفاظ جذباتی غلو کا
افسانہ ہیں۔ لیکن جب پوری کتاب میں حقانی صاحب کے
مانند صریح الفاظ و عبارات میں موجود ہیں تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ
ان الفاظ سے انھوں نے اپنے ایک غلط عقیدے کا اظہار کیا۔
ان کا عقیدہ دوسرے تمام صحیح العقیدہ مسلمانوں کی طرح یہی ہے
حشر کے دن جج تو باری تعالیٰ ہی ہوگا۔ وہی سزا و جزا کے
فیصلے دے گا۔ وہی انصاف کرے گا۔ اسی کے فیصلے نافذ ہوں گے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی اجازت سے شفاعت تو
ضرور فرمائیں گے مگر اس شفاعت کو قبول کرنا نہ کرنا اسی کے
اختیار میں ہوگا اور اس کے ایما اور مرضی کے خلاف کوئی کچھ
نہ کر سکے گا۔

جب حقانی صاحب کا یہ عقیدہ ان کی صریح عبارتوں سے
ظاہر ہے تو یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ زیرِ بحث عبارت میں
امتِ محمدیہ کو منصف اور فیصل اور جج انھوں نے قانونی
اصطلاح میں نہیں کہا بلکہ تشبیہاً اور کنایۃً کہا۔ منصف سے
ان کی مراد یہ ہے کہ دوسری قوموں کی دروغ بیانی کے بالمقابل
انھوں نے سچی گواہی دی۔ سچی گواہی دینے والا انصاف پسند ہی
کہلاتا ہے اور "منصف مزاج" کا لفظ تو بول چال میں عام
ہے۔ ظاہر ہے اس سے کچہری والا منصف مراد نہیں ہوتا۔

اسی طرح فیصل اور جج کا بھی غیر اصطلاحی مفہوم لے
لیجئے۔ نہ لے سکیں تو زبان کی غلطی مان لیجئے۔ ایک غیر عالم
تقریر کی رو میں بعض بے محل الفاظ بھی بول جائے تو یہ کوئی
سنگین جرم نہیں۔ حقانی صاحب کا یہ مطلب بہرحال نہیں
ہو سکتا کہ حشر کے دن بجائے خدا کے امتِ محمدیہ قسمتوں کے
فیصلے کرے گی۔

اصل اہمیت معانی اور عقائد کی ہے۔ الفاظ اور
اندازِ کلام کی نہیں۔ حقانی صاحب کی کتاب میں کیڑے
ڈالنے والے الفاظ و انداز کی دس اور سلوٹیں بھی نکال
دکھائیں تو اس سے کتاب کی اصل قدر و قیمت میں کچھ فرق
نہیں پڑتا۔ یہ شعر و ادب کی کتاب نہیں کہ ادب و انشاء
کی خامیوں کو مرکزی اہمیت دیدی جائے۔ یہ دینی اور
اصلاحی کتاب ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا معیار وہ تصورات
عقائد ہیں جن کو محورِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ کیا شک ہے کہ اس
کتاب نے اُس کوتاہ فکر، توہم پرست اور گم کردہ راہ طبقے
کو بڑی زک پہنچائی ہے جو کمزور روایات اور واہی علم کلام
کے چکر میں پڑ کر قبر پرست بن گیا ہے اور اولیاء و انبیاءؑ کے
بارے میں انتہائی غلو کا شکار ہے۔

وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ

سوال:۔ از۔ عبدالرشید۔ احمد نگر (مہاراشٹر)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اُن "عالم" کے بارے میں:۔
جو آیتِ شریفہ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ
وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ میں لفظ "رجال" کو
عمومیت پر محمول کرتے ہوئے کہ اس ارشادِ باری کے مخاطب مرد
اور عورتیں سب ہیں۔ اس آیت کی یہ تفسیر بیان کرتے ہیں کہ رسول
پاک صلعم باپ کے رشتہ سے، جس کو درجے کے اعتبار سے زیادہ
سے زیادہ عقیدتاً قائم کر سکتے ہو، بہت بلند اور دنیاوی
علائق (؟) سے ایسے بالاتر تھے جو "تم عامیوں کی فہم میں
نہیں آسکتا۔"

جواب:-

فساد زیادہ تر علماء ہی پھیلاتے ہیں جہلاء بے چاروں کی موشگافیوں سے متأثر کون ہوگا۔۔۔ جن عالم صاحب کا خیالِ گرامی آپ نے ذکر کیا ان کے حق میں یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں نیک توفیق دے اور قرآنی آیات سے کھیل کرنے کے شدید گناہ سے توبہ کا موقع نصیب فرمائے۔

کسی خاص لفظ کو عمومیت پر محمول اسی وقت کر سکتے ہیں جب اس کے لئے واضح قرینہ یا دلیل موجود ہو۔ یہ نہیں کہ کوئی بھی مسخرا اٹھے اور کہنے لگے کہ فلاں خاص لفظ خاص نہیں ہے عام ہے۔

رجال کا اطلاق عربی میں مردوں ہی پر ہوتا ہے الّا یہ کہ کسی موقع پر محاورۃً اسے مرد عورت سب کے لئے بول دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ ذکور بچپن ہی میں انتقال کر گئی اور اس آیت کے نزول کے وقت کوئی لڑکا موجود نہیں تھا نہ بعد میں کوئی لڑکا ایسی عمر کو پہنچا جسپر "رجال" کا اطلاق ہو سکے۔ البتہ بیٹیاں متعدد تھیں اور مسلمانوں کا بچہ بچہ ان کے نام جانتا ہے۔ کم سے کم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کے نام سے تو کوئی بھی ناواقف نہیں ہے۔ پھر کیا حضورؐ ان لڑکیوں کے باپ نہیں تھے؟ اگر تھے اور یقیناً تھے تو ان عالم صاحب کی نکتہ آفرینی کا حاصل تو یہ نکلا کہ نعوذ باللہ خدا غلط بیانی کر رہا ہے۔ حضورؐ متعدد لڑکیوں کے باپ ہیں مگر وہ کہہ رہا ہے کہ وہ کسی کے بھی باپ نہیں۔ اگر خدا کا غلط بیانی کرنا کسی کے حلق سے اتر سکتا ہے تو وہ بلا تکلف ان عالم صاحب کا مرید ہو جائے لیکن نہیں اتر سکتا تو مجبوراً یہ ماننا ہوگا کہ اس طرح کے تفسیری نکتے مالیخولیا کے قبیل سے ہیں اور انھیں اہمیت دینا وقت برباد کرنا ہے۔

لفظ اَب پر بھی غور کیجئے۔ اہلِ فن کا مسلّم اصول ہے کہ کسی لفظ کو اس کے وضعی معنی سے اسی وقت ہٹایا جا سکتا ہے جب ہٹانے کا قرینہ موجود ہو۔ مجازی مفہوم ایسے ہی وقت لیا جائے گا جب حقیقی مفہوم لینا ممکن نہ ہو۔ اَب والد کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں نہ صرف یہ کہ کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں جس کی بناء پر سوائے والد کے کوئی اور مفہوم اَب سے اخذ کیا جائے بلکہ نعوذ باللہ آیت ہی مہمل ہو جاتی ہے اگر اور کوئی مفہوم لے لیا جائے۔

آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ حضرت زیدؓ حضورؐ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ ان کا نکاح آپؐ نے اپنی پھوپی زاد بہن زینبؓ سے کرا دیا۔ بعد میں طلاق کی نوبت پہنچی۔ طلاق کے بعد خود حضورؐ نے اللہ کے حکم پر انھیں اپنی بیوی بنا لیا۔ عرب میں منہ بولے بیٹے کو ہر اعتبار سے حقیقی بیٹا جیسا تصور کرتے تھے۔ بیٹے کی مطلقہ سے باپ کا نکاح خود شریعت اسلامیہ میں بھی جائز نہیں۔ لوگوں نے طرح طرح کے اعتراضات کئے بدزبانیاں کیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اس غلط خیال کو مٹا دینا چاہتا تھا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے جیسا ہو سکتا ہے لہٰذا اس نے صرف قولی حکم پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے آخری رسولؐ سے وہ کام کرایا جس کے بعد کسی بھی صاحبِ ایمان کے لئے کوئی گنجائش یہ تصور کرنے کی باقی نہ رہ گئی کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح میں کوئی حرج ہے۔ اس مقصد کو خود اللہ تعالیٰ ان الفاظ بیان فرماتا ہے۔ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ۔ یعنی تاکہ اہلِ ایمان کے لئے اپنے منہ بولے بیٹوں کی ان بیویوں سے نکاح کر لینے میں مضائقہ باقی نہ رہ جائے جن سے ان بیٹوں نے جنسی تعلق قائم کرنے کے بعد طلاق دیدی ہو۔

اس منصوص مقصد و مدعا اور اس شانِ نزول کو ملحوظ رکھتے ہوئے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ والی آیت پر نظر ڈالی جائے تو ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہاں نہ مراتب و مدارج کی بحث ہے نہ کوئی نکتۂ تصوف بیان ہو رہا ہے۔ یہاں تو صریحاً وہ قانونِ شرعی ذہنوں میں اتارا جا رہا ہے جس سے مروّجہ تصور اور عقیدے کی تردید مقصود تھی۔ یہاں بدکلاموں کے اس اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے کہ لیجئے صاحب محمدؐ نے اپنے بیٹے کی بہو سے نکاح کر لیا۔ غلط کہتے ہو۔ محمدؐ کا کوئی بیٹا ہے ہی کہاں جو تمہارے

اعتراض کا جواز پیدا ہوسکے۔ منھ بولا (لے پالک) بیٹا فی الحقیقت بیٹا نہیں ہوا کرتا۔ اس کی مطلقہ کا وہ حکم نہیں جو بیٹے کی مطلقہ کا حکم ہے۔۔ اس غلط خیال سے باز آجاؤ کہ منھ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنا عیب ہے۔

انصاف کیا جائے۔ اس عیاں صورتِ حال اور محکم الفاظ اور واضح اسلوبِ کلام کے باوجود اگر کوئی عالم وہ نکتہ سنجی کرتا ہے جسے آپ نے نقل کیا تو اسے فضول گوئی اور آیاتِ الٰہیہ سے بے رحمانہ مذاق اور خدا کے خوف سے بے نیازی کے علاوہ کیا کہہ سکیں گے۔ نادان لوگ حضورؐ کی تعریف ومنقبت کے چکر میں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اللہ اور اس کے کلام سے وہ کتنا غلط سلوک کر رہے ہیں۔

حضورؐ فداہ امی وابی کی عظمت وعالی مقامی کے لئے اگر آیات واحادیث کیا کم ہیں؟ کون مسلمان ہے جو آپ کی ذاتِ مقدس کو اپنے ماں باپ اپنے جان ومال اپنی اولاد اور دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر محبوب ومعظم نہ مانتا ہو۔ اس مسلّم امرِ واقعہ کے ہوتے ہوئے آخر اس کی کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ بے محل طور پر نکتہ سنجی کی جائے اور یہ نمائش فرمائی جائے کہ ہم بڑے عارف باللہ اور عاشقِ رسولؐ ہیں کہ قرآن میں وہ کچھ پڑھ لیتے ہیں جو صحابہؓ اور تابعین اور مفسرین سلف بھی نہ پڑھ سکے۔

یہ فقرہ کہ ــــ "تم عامیوں کی فہم میں نہیں آسکتا" ــــ نکتہ سنج حضرات کا پیٹنٹ فقرہ ہے۔ فضولیات ہانکیں گے اور دوسروں کو بڑی شان سے بے وقوف ٹھیرادیں گے۔ آپ ان عالم صاحب سے کہہ دیجئے کہ جناب ہم عامی ہی اچھے۔ خدا ہمیں عامی ہی رکھے اور ان خواص میں شامل ہونے سے بچائے جو اللہ اور رسولؐ کے منھ میں اپنی زبان ڈالنے کی گستاخی کرتے ہیں اور خود کو صاحبِ عرفان پوز کرنے کی جدوجہد میں علم ودیانت کی حدوں سے گذر جاتے ہیں۔ بے شک ہم غلاموں کا رشتہ اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے باپ اور بیٹے والے رشتے کے مقابلے میں قوی اور بلند ہے مگر آیتِ مذکورہ سے اس نکتے کو نکالنا قرآن کی تحریف ہے نہ کہ تفسیر اور اس پر یہ اضافہ کہ حضورؐ دنیاوی علائق سے ایسے بالاتر تھے کہ تم عامی اسے نہیں سمجھ سکتے محض زبان درازی اور لغو گوئی ہے۔ پتا نہیں عالم صاحب کی مراد کیا ہے۔ حضورؐ کھاتے تھے پیتے تھے سوتے تھے۔ مریض ہوتے تھے۔ بھولتے بھی تھے۔ غصہ، رنج، خوشی، جوش، اضمحلال، امید، ناامیدی، خوف سارے ہی انسانی جذبے آپؐ پر طاری ہوتے تھے۔ آپ نے شادیاں کیں۔ خسر بھی بنے۔ اولاد کو بھی پیار کیا۔ آخر کون سے علائقِ دنیاوی ہیں جن سے آپؐ کو بالاتر کہا جارہا ہے اور لطف یہ کہ جو اس مجذوبانہ موشگافی کو نہ سمجھے وہ عامی! خدا ایسے نکتہ سنجوں پر رحم فرمائے۔

فقہ کی طرف رجوع کیجئے

سوال ۹:- (ایضاً)

یہی عالم بخاری شریف کی حدیث "عن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، قال تسحّرنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثمّ قام الی الصّلٰوۃ فقیل لہ کم کان بین الاذان والسحور قال قدر خمسین آیۃ۔" (باب فی اوقات الصلوٰۃ) سے "خاص" حکم نکال کر (کہ حدیث "سحری میں تاخیر کیا کرو" سے "عام" حکم نکلتا ہے) صبح صادق سے اتنا عرصہ پیشتر سحری ختم کردینے کو کہ جس میں پچاس آیتیں پڑھی جاسکیں، کبھی سنت اور کبھی مستحب قرار دیتے ہیں (کیونکہ خود ان کے ذہن میں بھی یہ بات صاف نہیں کہ یہ سنت ہے یا مستحب) اور صبح صادق تک کی جانے والی سحری پر رکھے ہوئے روزے کو فاسد تو نہیں مگر "سحری کو مکروہ" قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ خود اس سنت یا مستحب پر پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ اپنے گھر والوں کو بھی اس کی پابندی کا حکم دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسکی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

جواب ۹:-

اس طرح کے فقہی مسائل میں ہمہ شما کی رائے نہیں دیکھی جاتی۔ فقہ کے چار معروف اسکول موجود ہیں۔ جو جس اسکول سے تعلق

نتا ہو اس کی فقہ میں ڈھونڈے کہ فلاں مسئلے میں مفتی بہ
ل کیا ہے۔ عافیت کا یہی راستہ ہے۔ اگر ہر مجتہد وقت"
طرف التفات کیا تو وقت کی بربادی اور آخرت کے
مارے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ جو عالم صاحب علم وعقل
دہ نمونہ پیش کرتے ہوں جس کا تعارف دما کان محمدًا
لی آیت کے ذیل میں ہوا ان کے اجتہادات تو فقط عجائب گھر
متاع ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ ان کا کوئی مصرف نہیں۔ ہمیں
ن سے کوئی دلچسپی نہیں کہ عالم مذکور کیا مسالک رکھتے اور
با عمل کرتے ہیں۔ نہ آپ کو ہونی چاہیے۔

مکر کا لفظ

سوال :- (ایضاً)

ہا لنصاکا ارشاد ہے کہ سیاست میں "مکاری" جائز ہے کیوں کہ
للہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ "وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ" (پارہ سوم
بع ثانی کا آخری رکوع) نعوذ باللہ من ذالک۔

جواب :-

آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ ان بزرگوار کی صحبت سے
یئے۔ اگر یہ نصیحت قبول نہیں ہے تو کم سے کم ہمیں تو معافی
ی دیدیجئے۔

ہر زبان اپنے محاورات، اپنی روزمرہ، اپنا اسلوب
ھتی ہے۔ اور ایک ہی لفظ دو مختلف زبانوں میں الگ
لگ محل میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً لفظ "عرض" ہے۔ اس
ے معنی ہیں پیش کرنا۔ قرآن کے آغاز ہی میں دیکھ لیجئے۔ قصۂ
دمؑ میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ
پھر اللہ نے ان اسماء کو ملائکہ پر پیش کیا"

یہاں لفظ عرض کی نسبت اللہ کی طرف صاف صاف
وجود ہے لیکن کیا اردو بول چال یا تحریر میں بھی کوئی پڑھا
کھا آدمی یوں کہہ سکتا ہے کہ :-

" اللہ نے فلاں بات عرض کی "

معلوم ہے کہ اردو استعمال میں یہ لفظ تشریف وتعظیم
کے خلاف ہے اس لئے مقام ادب میں ہرگز نہیں بول
سکتے۔

یا مثلاً لفظ "غرور" عربی میں فریب کے معنی میں آتا ہے
لیکن اردو میں تکبر کے لئے بولتے ہیں۔ کسی شخص کو یوں کہئے کہ
وہ بڑا مغرور ہے تو یہ مطلب نہیں سمجھا جائے گا کہ وہ بڑا
فریب خوردہ ہے۔ کسی شخص کو ٹھگ دو چار ہزار کی چوٹ
دے جائیں تو یہ نہیں کہیں گے کہ بیچارہ غرور میں آگیا۔

یا مثلاً عربی میں خط کو رسالہ بھی کہتے ہیں اور کتاب
تو کہتے ہی کہتے ہیں پھر کیا اردو میں بھی یہ استعمال موجود ہے ؟

یا مثلاً عربی میں واحد کے لئے ضمیر واحد ہی استعمال
ہوتی ہے اور خطاب میں بھی اسی کو استعمال کیا جاتا ہے۔
اردو میں واحد حاضر کے لئے "تو" بولا جاتا ہے لیکن ادب کے
مواقع پر اس سے پرہیز ضروری ہے۔ کوئی شریف بیٹا باپ
یا استاد کو یہ نہ کہہ سکے گا کہ تو کیا کر رہا ہے۔ تو کہاں جا رہا
ہے۔ حالانکہ عربی میں ٹھیک اسی طرح خطاب ہوگا۔ تثنیہ
یا جمع کے صیغے استعمال نہ ہوں گے۔

ایسا ہی معاملہ لفظ مکر کا ہے مکر بلاشبہ دھوکے
اور فریب اور حیلے کو کہتے ہیں۔ عربی میں یہ مقام مدح اور مقام
ذم دونوں میں استعمال ہو سکتا ہے لیکن اردو میں اس کا استعمال
صرف مقام ذم میں ہے۔ آپ کسی بزرگ کی تعریف یوں
ہرگز نہ کریں گے کہ وہ بڑے فہیم اور مکار ہیں بلکہ مدبر یا باتدبیر
یا ایسا ہی اور کوئی لفظ استعمال فرمائیں گے۔ عیار و مکار کے
الفاظ ایک ساتھ بھی اور الگ الگ بھی اردو میں تقبیح وتحقیر ہی
کے لئے خاص ہیں۔ اسی لئے آپ پورے اردو لٹریچر میں کہیں
ایک جگہ یہ نہ دکھا سکیں گے کہ کسی بندۂ خدا نے خدا کی
تعریف "مکار" کے لفظ سے کی ہو۔ لہٰذا جو عالم عربی طرز
استعمال کو جوں کا توں اردو میں لاکر اس بات سے بے نیاز
ہو جائے کہ اردو محاورہ اور روزمرہ کیا ہے اس پر لاحول ہی
پڑھنا موزوں ہوگا۔

ایک اور بات۔ مکّار مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قرآن میں
کہیں بھی اللہ کو "مکار" نہیں کہا گیا۔ یہ عربی میں بھی خراب

ہی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ پھر کیا تُک ہے یہ کہنے کا کہ چونکہ "اللہ" ماکر" ہے اس لئے ہمیں بھی بلا تکلف "مکار" بن جانا چاہیئے۔

سیاست میں بے شک تدبیر، حکمت، ذکاوت، دانائی اور حیلہ سازی ناگزیر ہے۔ مگر ان اوصاف کا جائز حدوں میں استعمال مکاری نہیں کہلاتا۔ مکاری جب بھی بولینگے ایک غیر اخلاقی مذموم و قبیح روش مفہوم ہوگی۔

روزے کی نیت

سوال ۱۰:- (ایضاً)

ان ہی عالم صاحب نے کسی کے پوچھنے پر کہ روزہ رکھنے کی نیت "اللّٰھم اصوم غداً لک . . . . ." میں لفظ "غداً" (کل) کیوں استعمال کیا گیا ہے جب کہ اسلامی اعتبار سے تاریخ یا دن مغرب کے بعد بدل جاتا ہے اور یہ نیت عام طور پر سحری کے بعد قبل از زوال کسی وقت بھی کی جاسکتی ہے تشریح فرمائی کہ صحابۂ کرام رض روزہ افطار کرنے سے کچھ دیر پہلے ہی یا افطار کرتے وقت ہی آنے والی کل کے روزے کی نیت کر لیا کرتے تھے اور رسولِ پاک صلعم انھیں اس بات کی تعلیم فرمایا کرتے تھے۔

جواب ۱۰:-

یہ عالم صاحب تو عجوبۂ روزگار معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا ان سے پوچھئے تو کہ یہ نادر اطلاع انھیں آخر کہاں سے مل گئی کہ جملہ صحابۂ کرام رض اگلے دن کے روزے کی نیت افطار سے کچھ قبل یا عین افطار ہی کے وقت کر لیتے تھے۔ تاریخ افسانہ طرازی کا تو نام نہیں۔ اگر تاریخی واقعہ یوں ہی ہے تو اسکے ماخذ کا حوالہ چاہیئے۔ یہ کیا بچوں والی حرکت ہے کہ جو منہ میں آیا کہدیا اور یہ بھی پروانہ کی کہ داڑھی مونچھ رکھ کر بے پر کی اُڑانا بہت بری بات ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ روزمرّہ کی بول چال اور عام اصطلاحات سائنس یا منطق یا فلسفے کی روشنی میں نہیں لی جاتیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سورج کا کہیں بھی غروب نہ ہونا بلکہ خلا میں مسلسل گردش کرتے رہنا مسلّمہ بن چکا ہے اور اللہ کے علم میں تو ہمیشہ سے تھا کہ دنیا والوں کے لئے طلوع و غروب کی اصطلاحیں محض ان کے مشاہدے کے اعتبار سے ہیں حقیقتِ طبیعیہ کے اعتبار سے نہیں مگر اس نے اسی مشاہدے کی رعایت سے مغرب و مشرق کے الفاظ استعمال فرمائے۔ اسی طرح اور بے شمار الفاظ ہیں جو ہمارے ظاہری مشاہدے اور نظارے ہی کی رعایت سے بنے ہیں ورنہ طبیعی یا فنی حقیقت کچھ اور ہے۔

یہی معاملہ لفظ غد کا ہے۔ اصولی اعتبار سے رات پہلے ہے اور دن بعد میں، لہٰذا کوئی بھی رات جب شروع ہوتی ہے تو وہ آنے والے دن سے وابستہ ہوتی ہے لیکن کیا انسانی بول چال بھی اسی اصول پر استوار ہے۔؟

آپ کے یہاں آج عشاء کے وقت میٹنگ ہو تو کیا آپ اس کی اطلاع ان الفاظ میں دیں گے کہ کل عشاء کے وقت میرے یہاں میٹنگ ہے۔ اصولاً تو آج آنیوالا وقتِ عشاء کل کا جزو ہے مگر محاورۃً یہ آج ہی کے لئے مخصوص ہے اور اگر کل رات کے لئے آپ کسی کو مدعو کریں تو یہ نہیں کہیں گے کہ پرسوں کی رات آجانا حالانکہ کل دن کے بعد جو رات آنے والی ہے وہ اصولاً پرسوں کے دن سے مربوط ہے۔

شریعت کے متعدد احکام میں بھی اسی محاورے کا اعتبار ہے۔ ایک شخص نے بیوی سے کہا کہ اگر تو آج گھر سے نکلی تو تجھ پر طلاق۔ یہ عورت اگر آج بعد مغرب گھر سے نکلے تو طلاق پڑجائے گی حالانکہ اصولاً یہ رات اگلے دن کی شروع ہوچکی۔ اسی طرح اگر قسم کھائی کہ آج میں زید کو سو روپے دوں گا اور عشاء کے وقت دیدیئے تو حانث نہ ہوگا یعنی قسم نہ ٹوٹے گی حالانکہ اصولاً کل کی شب میں دیئے گئے ہیں۔

۱۲ محرم کو غروب آفتاب کے بعد آپ اگر قسم کھائیں کہ کل فلاں کام کروں گا اور ۱۳ کی صبح یا شام میں اسے کر گزریں تو شریعت کہے گی کہ آپ نے قسم پوری کردی۔ حتّٰی کہ اگر ۱۳ کو بوقتِ عشاء بھی کیا ہو تو یہی فتویٰ رہے گا۔ اب دیکھ لیجئے اصولاً

تو یہ ہونا چاہئیے کہ کل سے مراد ۱۳ رنہ ہو ۱۴ ر محرم ہو کیونکہ حقیقت آپ علم کھا رہے ہیں اصولاً ۱۳ ر محرم شروع ہو چکی ہے اور ۱۳ ر محرم آپ کے لئے "آج" ہے "کل" نہیں۔ ۱۳ ر میں آپ کا لفظ کل استعمال کرنا اصولاً یہ معنی رکھے گا کہ ۱۴ ر کی بات کر رہے ہیں مگر شریعت محاورے کے مطابق آپ کی قسم کو ۱۴ سے نہیں ۱۳ ر محرم سے جوڑے گی اور اسی کے اعتبار سے فیصلہ دے گی۔

غرض لفظ غداً نیت والے فقرے ہیں محاورے کے مطابق ہے نہ کہ علم ہیئت کے مطابق۔ لہٰذا رات میں کسی بھی وقت نیت کیجئے اس لفظ کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔

سامنے کی بات یہ بھی ہے کہ روزہ دن میں رکھا جاتا ہے اور اگلا دن آج کے مغرب یا عشاء کے وقت سے کافی دور ہے عمل اور نیت میں قرب تو ہونا ہی چاہئیے۔ سحری کھاتے ہوئے بے شک نیت بہت مناسب ہے کہ دن قریب آ ہی گیا ہے۔ اس مناسب وقت کی نیت میں اگر لفظ غداً شامل کیا گیا تو آپ سے آپ معلوم ہو گیا کہ بول چال کا قاعدہ اسی کے حق میں ہے۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ افطار کی دو تین دعائیں تو حضورؐ سے منقول بھی ہیں اور اسی لئے فقہ کی کتابوں میں ان دعاؤں کو مستحبات کی فہرست میں درج کیا جاتا ہے لیکن روزے کی نیت کے لئے کوئی مخصوص دعا منقول ہی نہیں۔ نیت لازمی ہے لیکن قلبی ارادہ اور مخفی نیت بالکل کافی ہے الفاظ قطعاً ضروری نہیں۔ الفاظ محض احتیاطاً بتا دئیے گئے ہیں کہ نیت کی ظاہراً بھی تصدیق ہو جائے۔ جیسے نماز کیلئے نیت کے الفاظ بتائے گئے ہیں۔ یہ ضروری بالکل نہیں۔ قلبی ارادہ یہاں بھی کافی شافی ہے۔

اب یہ انکشاف تو آپ کے عالم صاحب ہی فرما سکیں گے کہ یہ کونسی حدیثیں ہیں جن میں حضورؐ نے صحابہؓ کو یہ تعلیم دی ہو کہ کل کے روزے کی نیت آج کے وقت افطار یا اس سے بھی پہلے کر لیا کرو۔ "تعلیم فرمایا کرتے تھے" کے الفاظ تو بتا رہے ہیں کہ ایسی بہت سی حدیثیں ہونی چاہئیں۔ ہم ممنون ہوں گے اگر دو چار ہمیں بھی بتا دی جائیں۔

پچھلے ماہ صفحہ ۹ روزہ توڑنے کے کفارے پر کچھ گفتگو آئی تھی۔ اس کا بقیہ حصہ اب پڑھ لیں۔

فقیر و مسکین کی اصطلاحیں

قرآن میں مستحقین زکوٰۃ کی جو فہرست بیان ہوئی ہے اس میں فقراء اور مساکین الگ الگ درج ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ غریبوں کی دو الگ الگ قسمیں ہیں۔ لہٰذا ان کا مصداق سمجھ لیا جائے۔

فقیر اصطلاحِ شرعی میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بالکل ہی قلاّش اور خالی ہاتھ نہ ہو کہ اگلے وقت کی روٹی کا بھی سہارا نہ رکھتا ہو بلکہ تھوڑا سا پیسہ یا ساز و سامان اس کے پاس ہو۔ البتہ اتنا اور ایسا مال اس کے پاس نہ ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو۔ اصطلاح شریعت میں اس کا نام "نصاب" ہے۔ نصاب چاہے سونے چاندی کا ہو یا نقد روپے کا یا بھیڑ بکریوں کا یا غیر منقولہ جائداد کا۔ بہر حال فقیر وہ شخص ہے جو صاحب نصاب نہ ہو۔

اور مسکین وہ شخص ہے جو بالکل ہی مفلس ہو حتیٰ کہ دوسرے وقت کی روٹی کا بھی انتظام اس کے پاس نہ ہو۔

یہ ہم نے احناف کا نقطۂ نظر بیان کیا ورنہ بعض اور فقہاء کے نزدیک فقیر و مسکین میں کوئی معنوی فرق نہیں اور بعض کے نزدیک فقیر کا درجہ فقر میں مسکین سے بڑھا ہوا ہے یعنی فقیر وہ ہے جو قطعاً بے زر ہے پر ہو اور مسکین وہ جو صاحبِ نصاب نہ ہو مگر بالکل بھوکا ننگا بھی نہ ہو۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جس جگہ فقیر اور مسکین دونوں کا تذکرہ نہ ہو بلکہ صرف فقیر یا صرف مسکین کا تذکرہ ہو تو وہاں ان دونوں اصطلاحوں کا فرق ملحوظ نہیں ہوتا بلکہ مراد وہ غریب ہوتے ہیں جنھیں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے خواہ وہ بالکل ہی فاقہ کش ہوں یا اتنے مفلس نہ ہوں۔

چنانچہ قسم یا روزے وغیرہ کے کفارے میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اتنے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے تو ہم احناف کے نزدیک بھی وہ سارے ہی غرباء مراد ہوتے ہیں جو مستحق زکوٰۃ ہیں۔ ایسا نہیں کہ فقراء اس سے خارج ہوں۔ اس طرح مسکین کا مطلب یہ سمجھ لیجئے کہ وہ شخص مستحق زکوٰۃ ہو۔

اصل کفارہ

رمضان میں روزہ توڑنے کا اصلی اور مقدم کفارہ تو یہی ہے کہ متواتر ساٹھ روزے رکھے۔ لیکن یہ کفارہ چونکہ آسان نہیں اس لئے اللہ نے رعایت فرما دی کہ چلو اس کے عوض ساٹھ مسکینوں کا پیٹ بھر دو۔ اس سے ظاہر ہے کہ کھانا کھلانا دوسرے درجے میں ہے۔ اس درجہ کی نوبت اسی وقت آنی چاہئے جب ساٹھ روزے رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو۔ طاقت رکھتے ہوئے غرباء کو کھانا کھلا کر کفارہ ادا کرنا اگرچہ ضابطے کی خانہ پری کر دے گا مگر گناہ کی مکمل تلافی شاید ہی ہو سکے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جہاں بھی مسکینوں کو کھانا کھلانے کا ذکر ہوگا وہاں دو وقتہ کھانا مراد ہوگا۔ اور کھلانے کے عوض اگر نقد صدقہ کیا جائے گا تو فی مسکین دو خوراک کے دام لگانے ہوں گے۔

مزید شرط یہ ہے کہ خوب پیٹ بھر کھلائے۔ فقط ایک ایک روٹی دے کر ٹرخا دینا کافی نہ ہوگا۔ روٹی گیہوں کی ہو تو ہمارے فقہا نے لکھا ہے کہ بغیر سالن کے بھی کھلائی جا سکتی ہے لیکن ہمارے دور میں یہ کافی نہیں۔ اب ضروری ہے کہ روٹی کے ساتھ کچھ دال سالن بھی ہو۔ کم سے کم چٹنی تو ضروری ہو۔ فقراء پیٹ بھر نہیں کھا سکتے اگر خالی روٹی انھیں دی گئی۔

کھانا کھلانے کا قائم مقام

غرباء کو بٹھا کر کھانا کھلانے کے عوض بغیر پکا اناج بھی دیا جا سکتا ہے۔ فی غریب ایک صدقۂ فطر کے برابر دینا ہوگا۔

صدقۂ فطر کا وزن ایک سو ساڑھے بیالیس تولہ ہے یعنی ۸۰ کے تول سے ایک سیر ساڑھے بارہ چھٹانک۔ کلو یا کوئی بھی اصطلاحی وزن ہو اسے اسی وزن سے مطابقت دے لینی چاہئے۔ اب ہمارے یہاں کلو رائج ہے۔ اس کے اعتبار سے ایک کلو ساڑھے سات سو گرام (یعنی پونے دو کلو) سمجھنا چاہئے اگرچہ حسابا کچھ کم بیٹھتا ہے۔

فی غریب پونے دو کلو ہوا تو ساٹھ کا ایک سو پانچ کلو ہوا یعنی ایک کا ڈ تل اور پانچ کلو۔ گیہوں دیں تو اتنے ہی دیں اور بجائے گیہوں کے ان کی قیمت دیں تو یہ بھی جائز ہے لیکن قیمت وہ ہوگی جو کھلے بازار میں ہے وہ نہیں ہوگی جو راشن ڈپو میں ہے۔ ایسے امور میں کنٹرول ریٹ کا اعتبار نہیں ہوتا کیونکہ اس ریٹ پر چیز حاصل کرنا غرباء کی دسترس سے باہر ہے۔

کفارے کا اناج یا اناج کی قیمت ایک ہی غریب کو ایک ہی وقت میں نہ دینی چاہئے۔ فقط ایک غریب کو ساٹھ دن تک دو وقتہ کھانا دیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ کھانا کھلانے میں تسلسل ضروری نہیں۔ کچھ روز کھلایا پھر ناغہ ہو گیا تو اس ناغے سے پچھلا کھلایا ہوا ضائع نہیں گیا بلکہ ان دنوں کو شمار کرتے ہوئے ساٹھ دن پورے کئے جائیں۔

کفارہ کی رقم مثلاً سو روپے بنتی ہو اور آپ یہ چاہیں کہ اس میں دس روپے فلاں غریب کو پہنچ جائیں تو یک مشت دس نہ دے سکیں گے کیونکہ یہ رقم ایک مسکین کے حصے سے زیادہ ہے لہذا ایسا کر سکتے ہیں کہ ایک یا ڈیڑھ روپیہ روز اسے دیتے رہئے اور اس طرح کئی دن میں دس دے ڈالئے۔ باقی نوّے دوسرے غرباء کو اسی طرح دیں کہ کسی کو بھی ایک وقت میں اس کے حصے سے زیادہ نہ پہنچے۔ البتہ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ کسی کو اس کے حصے یعنی ایک صدقۂ فطر کی مقدار سے کم نہ پہنچے ورنہ ادائگی نہ ہو سکے گی۔

عذر شرعی

شرعی عذر کی بنا پر جو روزہ توڑا جائے اس کی بس قضاء واجب ہوتی ہے کفارہ لازم نہیں آتا۔ مثلاً رمضان میں روزہ رکھا تھا یکلخت بیمار پڑ گئے اور دوا لینی پڑی تو یہ عذر شرعی ہے۔ یا اگر رمضان میں کسی دن روزے کی نیت ہی نہیں کی تو چاہے نیت نہ کرنا معقول وجہ سے ہو یا ازراہِ غفلت و سرکشی۔ کفارہ بہر حال لازم نہ آئے گا کیونکہ روزہ جب رکھا ہی نہیں گیا تو ٹوٹے گی کیا چیز۔ کفارہ توڑنے پر ہے نہ رکھنے پر نہیں۔

عورت کو روزے کے درمیان حیض آجائے تو یہ بھی عذر شرعی ہے۔ اسے قضا کرنی ہوگی کفارہ نہیں دینا ہوگا۔

کسی بدبخت پر یہ جنوں سوار ہو کہ ایک ہی رمضان میں ایک سے زیادہ روزے بلا عذرِ شرعی توڑ ڈالے تو ان کا کفارہ ایک ہی ہو گا نہ کہ کئی۔

ساٹھ روزے مسلسل رکھنے کفارے میں ضروری ہیں لیکن ساٹھ پورے ہونے سے پہلے ہی اگر کوئی ایسا عذر پیش آجائے جس کی بنا پر روزہ رکھنا ممکن نہ ہو تو شریعت رعایت دیتی ہے کہ جب عذر رفع ہو جائے تو باقی روزے رکھ لے اور پچھلے جوڑ کر حساب پورا کرے۔ مثلاً عورت نے دس روزے رکھے تھے کہ حیض آگیا۔ اب وہ پاکی کے بعد پچاس رکھے گی۔

اسی طرح مرد نے بیس رکھے تھے کہ شدید بیمار پڑ گیا تو یہ بیس کینسل نہیں ہوں گے۔ صحت کے بعد چالیس رکھ لے۔

ہاں عذرِ شرعی کے بغیر ایک دن کی بھی چھٹی نہیں کی جا سکتی حتیٰکہ ۵۹ رکھنے کے بعد ایک دن سستایا تو پھر سے پورے ساٹھ رکھنے ہوں گے۔ تسلسل کفارے کی لازمی شرط ہے الاّ یہ کہ تسلسل کی طرف سے مجبوری لاحق کردی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو بلا عذرِ شرعی روزہ توڑنے کے سخت جرم وگناہ سے بچائے۔

●

دائرۃ المصنفین مبارک پور کی بالکل نئی اور چونکا دینے والی پیشکش

قرآن مجید کا چیلنج قیمت مجلد ڈسٹ کور ۵۰/۳ از مولانا داؤد اکبر اصلاحی ● آپ تقریر کیسے کریں۔ مجلد ڈسٹ کور ۵۰/۱ از نجم الدین احیائی۔
اسکے علاوہ ہمارے یہاں دار المصنفین اعظم گڈھ کی تمام مطبوعات نیز ہندوستان کے مشہور ناشروں کی مطبوعات بھی ملتی ہیں۔

منیجر ہلال بکڈپو۔ مبارک پور۔ اعظم گڑھ (یوپی)

بارگاہِ نبوّت میں

رئیس نعمانی

نہ آئے کیوں قلبِ مضطرب میں خیال یہ بار بار آقا!
زمانہ حاضر ہو آستاں پر، میں ہند میں بے قرار آقا!

حوادثِ روز و شب نے شاہا! کمر ہی ہمت کی توڑ دی ہے
نہ آنکھ کو خوابِ خوش میسر، نہ دل کو صبر و قرار آقا!

وہ بیتِ اقصیٰ، وہ آپ کی سیرِ آسمانی کی پہلی منزل
یہودِ ناپاک کا تسلط وہاں ہے اب پائدار آقا!

تمہارا پیرو رہا تھا جب تک، جہاں کا سرتاج و حکمراں تھا
تمہیں جو چھوڑا تو اب مسلماں زمانے بھر میں ہے خوار آقا!

بہت زمانے سے دے رہا ہے زمانہ پیہم اسے شکستیں
نہ جانے کن خوش خیالیوں میں ہے مسلمِ بے وقار آقا!

ہیں اپنے بیگانے سب کے لب پر، ہماری نالائقی کے چرچے
نہ جانے ہے کونسی گھڑی کا، ابھی ہمیں انتظار آقا!

بجا ہے جو کچھ کہے زمانہ، کہ آج اسلام ہے فسانہ
بدل چکے ہیں، بگڑ چکے ہیں، ہمارے طرز و شعار آقا!

مگر تمہاری نگاہِ رحمت، کرے گوارا یہ حالِ امت
یقیں آتا نہیں مجھے تو سنبھال ہوش و قرار آقا! [ل]

تمہاری امت کا آسرا ہے، تمہاری رحمت پہ ہے بھروسا [ع]
ہے داغِ عصیاں سے میرا دامن بری طرح داغدار آقا!

ل حضورؐ کے گوارا کرنے نہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ کارخانہ تمام و کمال اللہ کی مشیت کے تحت چل رہا ہے۔ کون ہے جو اس میں دخل اندازی کرسکے۔ (تجلی)

ع آسرا اور بھروسا صرف رحمتِ خداوندی کا ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ حضورؐ حشر کے دن شفاعت کریں گے بس یہ ہے آپ کی وہ شانِ رفیع جو قرآن سے ثابت ہے۔ اس سے زیادہ آپ کے اختیار میں کچھ نہیں۔ ایک بھی گناہ اللہ کے سوا کوئی معاف نہیں کرسکتا نہ اللہ کے سوا جنّت کا پروانہ کوئی دے سکتا ہے۔ (تجلی)

(۱)

الجھے ہوئے سانسوں کی گھٹن کیسے دکھاؤں
اندر جو ہیں زخموں کے چمن کیسے دکھاؤں
یوں شیشۂ دل سنگِ حوادث نے کیا چور
نس نس میں ہے کرچوں کی چبھن کیسے دکھاؤں

(۲)

دکھلا تو دیئے گھاؤ بھی ناسور بھی لیکن
احساس کے چھالوں کی جلن کیسے دکھاؤں
اے چارہ گرو! کھائی ہیں کچھ بند بھی چوٹیں
بتلاؤ تمھیں اُن کی دکھن کیسے دکھاؤں

(۳)

خود مجھ میں جو اک شخص کبھی قتل ہوا تھا
افسوس کہ حائل ہے بدن کیسے دکھاؤں
احساس کی دہلیز پہ مدت سے پڑا ہے
اک لاشۂ بے گور دکفن کیسے دکھاؤں

(۴)

دامن دامن داغ لہو کے، چیتھن چیتھن خون کی پیاس
چہرہ چہرہ بول رہا ہے معصوموں کا شہر ہے یہ
کوچہ کوچہ طوق و سلاسل، منزل منزل دار و صلیب
اب میں ہی کیا منھ سے بولوں، مظلوموں کا شہر ہے یہ

(۵)

اے عشق تری آن پہ ہم سادہ دلوں نے
سرمایۂ صد لعل و گہر ہار دیا ہے
ہونٹوں کی ہنسی، دل کا سکوں، روح کی مسکان
جب کچھ نہ رہا پاس تو سر ہار دیا ہے

(۶)

سزا یہ دی ہے کہ آنکھوں سے چھین لیں نیندیں
قصور یہ تھا کہ جینے کے خواب دیکھے تھے
کسی نے زیست کے طوفاں میں لاکے چھوڑ دیا
یہ جرم تھا کہ وفا کے سراب دیکھے تھے

عامر عثمانی

اب تو وہ جو بھی سزا دے وہ روا ہے یارو
میں نے صیاد کو صیاد کہا ہے یارو

اُف یہ نیرنگیِ تقدیر بھی کیا ہے یارو
آ کے ساحل پہ کوئی ڈوب رہا ہے یارو

کتنا معصوم یہ اندازِ جفا ہے یارو
کوئی مجھ سے ہی مجھے پوچھ رہا ہے یارو

دل کسی بُت کو نہ دیں گے نہ دیا ہے یارو
ایک لے دے کے یہی قبلہ نما ہے یارو

میری آواز میں کیا خاک دھرا ہے یارو
یہ تو پردے سے کوئی بول رہا ہے یارو

نہ جلی شمع مری شاخِ نشیمن تو جلی
چند لمحوں کو اندھیرا تو گھٹا ہے یارو

آج تسبیح و مصلیٰ سے بھلا کیا ہوگا
کوچۂ یار تو سر مانگ رہا ہے یارو

میری پلکوں پہ لہو رنگ چراغوں کی قطار
زندگی بھر کی وفاؤں کا صلا ہے یارو

برس رہا ہے مرے اشعار سے قطرہ قطرہ
زخم جو بھی مجھے دنیا نے دیا ہے یارو

رات کے بعد سحر آ تو گئی ہے لیکن
میرا سورج کسی مفلس کا دیا ہے یارو

رات تو رات یہاں دن میں ہے ظلمات کا راج
یہ کہاں لا کے مجھے چھوڑ دیا ہے یارو

اب یہ عالم ہے کہ خود ہے مجھے اپنی ہی تلاش
تم ہی بتلاؤ کہیں میرا پتا ہے یارو

آئینہ تک مری صورت کا شناسا نہ رہا
وقت نے مجھ سے مجھے چھین لیا ہے یارو

اب نہ پوچھو دلِ مایوسِ وفا کا عالم
دُور ہٹتے ہوئے قدموں کی صدا ہے یارو

کب سے گرداب کے پیچوں میں پھنسی ہے کشتی
یہ سنا تھا کہ ہمارا بھی خدا ہے یارو

شوق سے قتل ہوئے دھار پہ گردن رکھ دی
اہلِ دل کا یہی معیارِ وفا ہے یارو

جو گذرتی ہے گذر جائے مگر ترکِ وفا!
ہم سے یہ کام نہ ہوگا نہ ہوا ہے یارو

ظاہراً توڑ لیا ہم نے بتوں سے رشتہ
پھر بھی سینے میں صنم خانہ بسا ہے یارو

غالباً یاس کی معراج پہ آ پہنچا ہوں
نہ طلب ہے نہ توقع نہ گلا ہے یارو

آج کیا چل ہی بسا بزمِ جہاں سے عامر
کم سوادوں میں یہ کیوں جشن بپا ہے یارو

عامر عثمانی

قادیانی حضرات کی ستم ظریفیاں

حضرت مہتمم صاحب کے کچھ فرمودات

قادیانت کے بارے میں ضمناً اور ذیلاً تو بارہا ہم اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں لیکن مستقل موضوع کی حیثیت سے اس پر سر مارنا ہمیں پسند نہیں۔ علماءِ حق نے اس سلسلہ میں نقد و نظر کا حق ادا کر دیا۔ خصوصاً علامہ انور شاہ کشمیریؒ تو حرفِ آخر قسم کی تحریریں لکھ چکے۔ قرآن نے فرمایا ہے وما ذا بعد الحق الا الضلال۔ جب دلائل قویہ سے معلوم ہو جائے کہ فلاں مسئلے میں حق کیا ہے تو پھر ضرورت نہیں رہتی کہ آدمی بحثوں میں پڑے اور وقت برباد کرے۔ حق کے سوا جو کچھ ہو گا ناحق ہی ہو گا چاہے کیسا ہی ظاہر فریب ہو۔

آج بھی نفسِ قادیانت پر بحث ہمارے پیشِ نظر نہیں۔ قادیانت کا ذکر تو اس لئے آگیا ہے کہ نانا دیڑ سے ایک صاحب نے قادیان سے نکلنے والے ہفت روزہ بدر (بابت یکم نومبر ۷۳ء) کے چند اوراق بھیجے ہیں جس میں دو درج ذیل سرخیاں ہیں:-

"منصبِ نبوت سے متعلق حضرت مہدیؑ موعود کا عارفانہ علم کلام۔"

اور

"دیوبندی تحریک کے ممتاز عالم مولانا محمد طیّب صاحب کا حیرت انگیز اعترافِ حق۔"

ان سرخیوں کے تحت بڑے دو صفحوں کا مضمون لکھا گیا ہے جو دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایک جزو ہے اپنے مزعومہ مہدی موعود مرزا غلام احمد قادیانی کے خیالات و فرمودات کی تفصیل اور دوسرا جزو ہے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے متعدد ارشادات جو ان کی دو کتابوں "آفتابِ نبوت" اور "خاتم النبیین" سے لئے گئے ہیں۔ بدر کا مدعا یہ ثابت کرنا ہے کہ خاتم الانبیاءؐ کی نبوت کے بارے میں جو طرزِ فکر اور اسلوبِ تخیل مہدی موعود صاحب کا ہے ٹھیک ایسا ہی طرز و اسلوب حضرت مہتمم صاحب کا ہے اور مہدی موعود پر جن علماء نے گمراہی کے فتوے عائد کئے ہیں انھوں نے جھک ماری ہے۔

نقط مزعومہ مہدی موعود ہی کے ارشادات اگر درجِ مضمون ہوتے تو ہم کچھ نہ لکھتے کیونکہ ہمیں ان سے ذرّہ برابر دلچسپی نہیں لیکن حضرت مہتمم صاحب چونکہ ہمارے اپنے ہیں اور مسلمان بجا طور پر انھیں ایک بڑا عالم، نامور واعظ اور صلاح و تقویٰ کا حامل صحیح العقیدہ بزرگ تصور کرتے ہیں اس لئے کسی بھی مسلمان کو ازراہِ سادہ لوحی یا ازراہ کم علمی دھوکا لگ سکتا ہے کہ قادیانی مذہب برحق ہے اور حضرت مہتمم صاحب جیسا بزرگ اس کی حقانیت سے متفق ہے — خود فرستندہ تشویش و تحیر میں پڑ گئے ہیں اسی لئے انھوں نے بدر بھیجا بھی ہے۔ علاوہ ازیں حضرت مہتمم صاحب کی متذکرہ دونوں کتب مسلمانوں میں پڑھی ہی جائیں گی اور پڑھی ہی جا رہی ہوں گی اس لئے ہمیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بے لاگ نقد و نظر کی جسارت کریں اور برادرانِ اسلام کو اس الجھاؤ اور انتشارِ ذہنی سے بچائیں جو شاعرانہ قسم کے نکتے لامحالہ پیدا کرتے ہیں۔

جہاں تک بدر کے موقف کا تعلق ہے اس کی غلطی

تو اس سے یہی واضح ہے کہ حضرت مہتمم صاحب قادیانیت کو برحق نہیں سمجھتے اور ہرگز یہ خوش گمانی نہیں رکھتے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں میں کوئی صداقت اور نکتہ سنجیوں میں کوئی ثقاہت ہے۔ جس کا جی چاہے ان سے خط لکھ کر پوچھ لے کہ کیا وہ قادیانی افکار و نظریات سے اتفاق رکھتے ہیں اور مرزا غلام احمد قادیانی کے علم کلام سے مطمئن ہیں۔ ان کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ لہٰذا ان کی کسی بھی تحریر سے ایسے مطالب نکالنا جو قادیانیت کے حق میں جاتے ہوں زیادتی ہے۔ جزوی مشابہت تو آدمی اور بندر میں بھی کافی پائی جاتی ہے مگر جو ان دونوں کو ایک جنس قرار دے گا اسے "ڈارون" کہیں گے "مومن" نہیں۔ اسی طرح کچھ جزوی مشابہتیں اگر مفروضہ مہدی صاحب اور حضرت مہتمم صاحب کی بعض تحریروں میں دستیاب ہوگئی ہیں تو اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ دونوں افراد میں فکر و نظر کا بھی اتحاد ہے۔

اس بنیادی تنبیہ کے بعد ہم حضرت مہتمم صاحب کے منقولہ فرمودات پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اظہارِ خیال کے لائق تو مرزا صاحب کے بھی فرمودات تھے لیکن ان کے بارے میں ہر وسیع المطالعہ جانتا ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف قسم کی باتیں لکھتے رہے ہیں۔ کبھی نبوت کا دعویٰ کریں گے کبھی مہدویت کا۔ کبھی ظل و بروز کی دورازکار بحث اٹھائیں گے۔ کبھی صاف مکر جائیں گے کہ ہم نے تو کبھی دعوۂ نبوت نہیں کیا۔ کسی کے پاس الیاس برنی کی "قادیانی مذہب" ہو تو فقط اسی کا مطالعہ کافی ہے۔ کسی دار المطالعہ میں بھی مل سکتی ہے۔ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن جلد چہارم میں سورۂ احزاب کی تفسیر دیکھ لی جائے وہاں بھی خاصا مواد ملے گا۔ اور بھی متعدد کتابیں مارکیٹ میں ہیں ایسے متضاد و متخالف افکار پریشاں پر گفتگو کیا کی جائے۔ ان صاحب نے امتِ مسلمہ سے الگ نیا ہی راستہ نکالا۔ محض ایک نمونہ یہ ملاحظہ فرمائیے کہ موصولہ بدر کے اوراق پر تاریخ کی جگہ ہر صفحہ پر انگریزی تاریخ کے ساتھ ــــ "یکم نبوت ۱۳۵۲ ہش" چھپا ہوا ہے۔ بتائیے آپ کیا سمجھے۔ امت کا کلینڈر سنِ ہجری سے آشنا ہے اور اسی کا رواج تمام عالمِ اسلامی میں ہے مگر قادیانی حضرات کو اس سے بھی کد ہوئی اور اپنا جھنڈا الگ اٹھایا۔

خدا کے سپرد۔ ہم ٹھیکیدار نہیں ہیں کہ ہر ایک کو ٹوکیں ہاں وہ سطور ضرور نقل کریں گے جو بدر میں حضرت مہتمم صاحب کی متذکرہ کتابوں کی توصیف میں ارشاد ہوئی ہیں:

> "ان کتابوں میں مولانا محمد طیب صاحب نے حضرت بانی جماعتِ احمدیہ علیہ السلام کے ختم نبوت سے متعلق عارفانہ کلام کی بالواسطہ طور پر تشریح اور مسلسل مختلف طریق اور اسلوب اور انداز اختیار کرکے بڑی شرح و بسط کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل شان محض نبوت ہرگز نہیں ختم نبوت ہے جس کے معنی انقطاعِ نبوت کے نہیں بلکہ مصدرِ نبوت اور سرچشمۂ نبوت کے ہیں اور آپ کا فیضانِ ختم نبوت ازل سے ابد تک جاری و ساری ہے۔ دونوں کتابیں احمدی علم کلام سے بھری پڑی ہیں مگر میں بطور نمونہ صرف چند اقتباسات ہدیۂ قارئین کروں گا۔"

احمدی علم کلام سے مہتمم صاحب کے علم کلام کو کس حد تک مماثلت ہے یہ بحث ان لوگوں کو مبارک جن کے لئے احمدی علم کلام میں کوئی کشش ہے۔ ہم صرف قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھیں گے کہ حضرت مہتمم صاحب کے منقولہ فرمودات کی حیثیت کیا ہے اور کہاں تک انھیں قابلِ قبول سمجھا جا سکتا ہے۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت مہتمم صاحب بہت سے کمالات کے جامع اور فضائل کے حامل ہیں۔ دانشمند، حکیم و ذہین۔ عمدہ واعظ، خلیق و متواضع۔ وسیع المطالعہ سخن سنج و سخن فہم۔ ہمارے مشفق بزرگ ہیں اور خدا جانتا ہے کہ ہم ان سے محبت رکھتے ہیں۔

لیکن نبوت انھیں بھی نہیں ملی۔ اُسی آدم کے بیٹے وہ بھی ہیں جس کی عین سرشت میں بھول چوک اور خطائے اجتہادی اور ذہنی فریب خوردگی اللہ نے پیوست فرمادی ہے لہٰذا کوئی بعید نہیں کہ اپنے قابلِ رشک علم وفضل کے باوجود انھوں نے کسی بحث میں ٹھوکر بھی کھائی ہو۔ غلطی بھی کی ہو۔ مغالطے کا بھی شکار ہو گئے ہوں۔ غیر معصوم ہی جو ٹھہرے۔ ہم جیسے بے بضاعت کا ان کے کسی سہو وخطا کی طرف انگلی اٹھانا اگرچہ خلافِ ادب سمجھا جائے گا لیکن جب ان کے بعض نقوشِ قلم کو قادیانی فنکار چارے کے طور پر استعمال کر رہے ہوں اور اندیشہ ہو کہ کچھ سادہ لوح مخلصین کا شکار نکل ہی نہ جائیں تو ہمارا سکوت شاید مناسب نہ ہوگا۔

اقتباسِ اول

"خاتم النبیین کے معنی نبوت کو انتہا تک پہنچا دینے کے ہوئے اور کسی چیز کے انتہا تک پہنچ جانے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی آخری حد تک آجائے کہ اس کے بعد کوئی اور درجہ اور حد باقی نہ رہے۔ اور جس حد تک وہ پہنچے ...
...... اس سے واضح ہوگیا کہ نبوّت کے معنی قطع نبوّت یا انقطاعِ رسالت کے نہیں کہ اب نبوّت کی نعمت دنیا میں باقی نہ رہی۔" (خاتم النبیین۔ صفحہ ۵ و ۶)

درمیانی سطور میں جو نقطے آپ دیکھ رہے ہیں وہ غالباً علامت ہیں اس بات کی کہ ناقل نے بیچ سے کچھ الفاظ یا فقرے حذف کر دیتے ہیں۔ وہ کیا ہوں گے یہ ہم کیسے جان سکتے ہیں جب کہ اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں۔ ممکن ہے ان کے حذف سے عبارت کے مفہوم میں تغیر ہوگیا ہو۔ لہٰذا اقتباس کو مکمل طور پر قابل اعتماد نہیں کہہ سکتے لیکن تمام اقتباسات کی روشنی میں ہمیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ نبوت اور ختم نبوت کے سلسلہ میں حضرت مہتمم صاحب نے جو نکات بکھیرے ہیں وہ بہرحال مغالطہ انگیز اور غبار آلود ہیں اس لئے ہم انھیں علم و تفقہ کی کسوٹی پر کسیں گے۔

حضورؐ کے لئے خاتم النبیین کا لقب قرآن سے ماخوذ ہے۔ قرآن میں یہ فقط ایک ہی جگہ آیا ہے لہٰذا اس کا صحیح مفہوم و مصداق معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے محلِ استعمال اور سیاق وسباق کو دیکھا جائے اور ذہنی طباعی اور خیالی نکتہ آرائی سے پرہیز کرتے ہوئے اسی مصداق تک محدود رہا جائے جس کی حدبندی اللہ کا کلام کر رہا ہے۔

سورۂ احزاب کو ہمارے عام قارئین کسی مترجم قرآن میں کھول کر سامنے رکھ لیں تو انھیں یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ ہماری تنقید کس حد تک درست یا نادرست ہے۔ یہ سورۃ کوئی ایسی سورت نہیں جو اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب و محامد اور فضائل و خصائص کی تفصیل بتانے کے لئے نازل کی ہو۔ اس کا تو آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ۔ (اے نبی اللہ سے ڈر اور کفار و منافقین کا کہا نہ مان)

پھر فرمایا گیا:۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (اور پیروی کر اس وحی کی جو تیرے رب کی طرف سے آئے)

پھر فرمایا گیا:۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (اور اللہ پر بھروسہ کر)

اس آغاز ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے پیغمبرؐ کو خطاب کر رہا ہے۔ نہ کہ اس محبت کرنے والے کی حیثیت سے جو محبوب کے فقط محاسن بیان کرنے کے لئے زبان کھول رہا ہو۔

پھر فوراً بعد وہ ان احکامات کا آغاز فرما دیتا ہے جن
ا ترسیل اس سورت کا اصل مقصود ہے۔ یہ سورۃ بیک وقت
زل نہیں ہوئی بلکہ مختلف اوقات میں اس کے اجزاء نازل
وتے رہے اور یہ سب اجزاء فرامین وقوانین کا مجموعہ ہیں۔
یک خاص قانون جسے اس سورت میں شدومد سے بیان
یا گیا ہے یہ ہے کہ منھ بولے (یا۔ لے پالک) بیٹوں کی حیثیت
یٹوں جیسی ہرگز نہیں۔ یہ تصور غلط ہے کہ ان کی مطلقہ بیویوں
سے نکاح آدمی کے لئے اسی طرح حرام ہو جس طرح حقیقی بیٹو ں کی
طلقہ سے حرام ہے۔ اس قانون کی اہمیت کا اندازہ اس سے
یجئے کہ اللہ نے خود حضورؐ کو حکم فرمایا کہ اپنے منھ بولے بیٹے
ید کی مطلقہ زینب سے نکاح کرو۔ حال یہ ہے کہ اُس معاشرے
یں اسے انتہائی معیوب اور کارِ حرام تصور کیا جاتا تھا۔
ود حضورؐ ڈر رہے تھے کہ ایسا کرنے پر لوگ نہ جانے کیا کیا
ہیں گے۔ قرآن کا بیان یہ ہے:۔

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (اور تو
ڈر رہا تھا لوگوں سے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس
سے تو ڈرے)

حضورؐ کا خوف، ہچکچاہٹ، تأمل قدرتی بات تھی۔
سلام ابھی پھیلا نہیں۔ کثیر لوگ ابھی ایمان لائے نہیں۔ ہر
رف دشمنوں کا اژدحام ہے۔ گالی گفتار، سازش، مکر سبھی چل
ہا ہے۔ منھ بولے بیٹے سگے بیٹوں جیسے سمجھے جا رہے ہیں اور
ندکی ہدایت یہ ہے کہ اپنے منھ بولے بیٹے کی مطلقہ کو نکاح
یں لے لو۔ کیسی سخت آزمائش۔ مگر اللہ کہتا ہے۔ مَا كَانَ عَلَى
النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ (نبی کے لئے اُس کام
یں رکاوٹ اور ہچکچاہٹ کیسی جو اللہ نے اس کے لئے مقرر
کر دیا ہو)　　اور کہتا ہے:۔

"اللہ کا حکم تو ایک اٹل فیصلہ ہے۔"

نیز —— "جو لوگ اللہ کا پیغام پہنچانے پر مامور
اور خدا کا خوف رکھتے ہیں وہ کسی اور سے نہیں
ڈرتے اور انھیں اللہ بالکل کافی ہے۔"

پھر اسی کے متصل بعد فرماتا ہے:۔

وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔　　محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کا بھی باپ نہیں ہے، وہ تو اللہ کا رسول ہے اور خاتم النبیین ہے۔

اور اس کے بعد نصیحت کی جاتی ہے:۔

"اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور اسکی
پاکی بیان کرتے رہو صبح وشام۔ وہی ہے جو رحمت
بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے تمہارے لئے دعا
کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے نکالکر روشنی
میں لائے۔"

یہ ہے سیاق وسباق خاتم النبیین کے لفظ کا۔ دیانت داری کے ساتھ فیصلہ کیا جائے کہ اس سیاق وسباق میں اس کا منشاء اور مطلب کیا ہو سکتا ہے۔

خاتَم کے لغوی معنی کیا ہیں اور محاورات میں اس لفظ کا استعمال کس کس طرح ہے یہ ایک ایسی بحث ہے جو فی نفسہ غلط نہیں مگر اِس مقام پر اسے اٹھانا اور نکتہ آفرینیاں کرنا قرآن کے ایک صاف وسادہ بیان کو الجھانا اور محور سے ہٹانا ہے۔ سیاق وسباق قطعیت کے ساتھ بتا رہا ہے کہ یہاں اس لفظ سے کیا مراد ہے اور کیوں اسے استعمال فرمایا گیا۔

لے پالک کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کا باطل تصور چونکہ اس حد تک رچا بسا تھا کہ اگر اللہ صرف لفظاً اسکی تردید پر اکتفا کر لیتا تب بھی دل ودماغ اسے بطیب خاطر قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے لہذا اللہ نے حضورؐ سے عمل کرا کے دکھلا دیا تاکہ کراہت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی اہل ایمان کے دلوں میں نہ رہے اور قیامت تک اس پر بلا استکراہ عمل کیا جاتا رہے۔

یہ بات کہ محمدؐ تم میں سے کسی فرد کے باپ نہیں کوئی تعریف کی بات تو ہے نہیں۔ باپ نہ ہونا عیب ہے، نہ خوبی۔ بے شمار پیغمبر کثیر اولاد کے باپ رہے ہیں اور خود حضورؐ بھی لڑکیوں کے باپ تو تھے ہی۔ یہ فقرہ توصیفی نہیں بلکہ امرِ واقعہ کا ایک سادہ بیان ہے۔ حضرت زید بجائے زید بن حارثہ کے زید بن محمد کے نام سے مشہور ہوگئے

تھے۔ حضورؐ نے انھیں اپنے دہانِ مبارک سے بیٹا کہا بھی تھا۔ قرآن تنبیہ کررہا ہے کہ زبان سے کہنے اور ابنیت فرض کرلینے سے کوئی دو آدمی باپ بیٹے نہیں بن جاتے۔ باپ تو وہ ہے جس کے صُلب سے بیٹا جنم لے۔ محمدؐ کے صُلب سے پیدا شدہ کوئی بیٹا زندہ نہیں۔ صرف لڑکیاں موجود ہیں لہٰذا وہ باپ صرف ان لڑکیوں کے ہیں۔ زید بن حارثہ کے نہیں۔ کسی اور بھی مرد کے نہیں۔ تم لوگ اپنے مفروضہ خیالات اور طبع زاد عقائد سے دست بردار ہوکر امرِ واقعہ کو یکھو اور یہ طنز و طعن مت کرو کہ لیجئے صاحب محمدؐ نے اپنے بیٹے ہی کی مطلقہ کو بیوی بنالیا۔

جب یہ ایک فقرہ نعت و ثنا کا نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ جس لفظ خاتم النبیین پر اس کا عطف ہو رہا ہے وہ بھی نعت و ثنا کے لئے نہیں بلکہ بیانِ واقعہ کے لئے نازل ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محمدؐ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا۔ اگر وہی دوسرے باطل تصورات کی طرح لے پالک والے باطل تصور کو مٹا کر نہیں جائیں گے تو پھر کون مٹائے گا جب کہ ان کے بعد نبی آنے والا نہیں۔ انھوں نے اپنے لے پالک کی مطلقہ سے اگر نکاح کیا تو اسی لئے کیا کہ ایک نبی جس فعل کو کرلے اس کے جواز میں کسی صاحب ایمان کو شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ انھوں نے نبی کی حیثیت سے یہ کام کیا ہے لہٰذا اسے ہر مومن حجت اور دلیلِ قطعی سمجھے۔ یہ آخری نبی ہیں اس لئے اس فعل کا جواز قیامت تک کے لئے ہے۔ اور کوئی نبی نہیں آئے گا لہٰذا یہ جواز مستردیا منسوخ ہونے والا نہیں۔

یہ ہے یہاں خاتم النبیین کے لفظ کا مقصد، معا، مفہوم اور مصداق۔ اس کے علاوہ کوئی منشاء ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ سیاق و سباق اور موقعہ محل اور اسلوب و الفاظ اس پر ناطق ہیں۔

جب یہ واضح ہو گیا تو یہ کہنے کی ضرورت نہ رہی کہ ایک سادہ بیانِ واقعہ کے بجائے اس لفظ کو خالص نعت و ثنا کے مفہوم میں لے کر نئے نئے نکتے نکالنا اور دور دور کی کوڑیاں لانا جودتِ طبع کا مظاہرہ تو ہو سکتا ہے فہم قرآن کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ کی نعت پر دل و جان قربان۔ آپ کے محامد و محاسن کے لئے قرآن و حدیث میں نصوص کیا کم ہیں۔ خدا کے بعد سب سے بزرگ۔ انسانوں میں سب سے اعلیٰ۔ انبیاء میں سب سے افضل، تمام مخلوق کے سردار، ملائکہ سے بھی اشرف، شفیعِ محشر اور اخلاق و کردار کے پیکرِ درخشاں۔ فداہٗ ابی و اُمّی۔ مگر بے محل، غیر ضروری طور پر الفاظِ قرآنی کو ربر کی طرح کھینچنا اور کلامِ الٰہی کو اس کے محور سے ہٹانا اور سیدھی سادی بات کو نکاتِ غامضہ اور لطائفِ دقیقہ کی چاندماری سے فلسفہ بنا ڈالنا دین کی خدمت نہیں، ملت کی خیر خواہی نہیں، شریعت کی تکریم نہیں۔

اب مثلاً حضرت مہتمم صاحب کے منقولہ بالا اقتباس میں فرمایا گیا — "خاتم النبیین کے معنی نبوت کو انتہا تک پہنچا دینے کے ہوئے۔"

بنیادی غلطی یہیں سے شروع ہو گئی۔ قرآن یہاں نبوت کا نہیں نبیوں کا ذکر کررہا ہے۔ خاتم النبوۃ نہیں فرمایا گیا۔ نبوت ایک وصف ہے اور نبی موصوف۔ جب موصوف کا ذکر کیا گیا تو معلوم ہوا کہ نفسِ نبوّت کی حقیقت اور باریکیوں سے کلام کا کوئی تعلق نہیں۔ نبی کسے کہتے ہیں، یہ سب جانتے تھے۔ وہ ہستی جو خدا کی طرف سے پیغام پہنچانے کے لئے مقرر ہوئی ہو۔ اسی معروف و سادہ مفہوم میں حضورؐ کو خاتم النبیین کہا جا رہا ہے یعنی اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔ آخری پیغمبر کن اوصاف و محامد کا حامل ہوا کرتا ہے اور نبوت کی معروضی یا درجاتی یا تکنکی یا فلسفیانہ حیثیت کیا ہے اس طرح کی باتوں سے آیت کا تعلق ہی نہیں ہے۔

دوسری غلطی استنتاج (نتیجہ اخذ کرنے) میں ہے۔ صفات بغیر موصوف کے باقی نہیں رہا کرتیں۔ پانی بہتا ہے بہاؤ وصف ہوا، اور پانی موصوف۔ پانی ہی نہ ہو تو

بہاؤ الگ سے کوئی چیز نہیں۔ زید حسین ہے۔ محض الگ کھڑا نظر نہ آئے گا اگر زید قبر میں پہنچ جائے۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ اوصاف کا وجود بلکہ تصور تک ذوات و اجسام ہی کے وجود پر منحصر ہے۔ جب حضورؐ پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا اور ان کے بعد کسی نبی کی آمد کا سوال ہی باقی نہ رہا تو اب یہ ماننے کے سوا کیا چارہ ہے کہ وصفِ نبوت دنیا میں اب کہیں نہیں پایا جاتا نہ قیامت تک پایا جائے گا۔ یہ کہنا کہ ختمِ نبوت کے یہ معنیٰ نہیں کہ اب نبوت کی نعمت دنیا میں باقی نہ رہی۔ حیرت ناک ہے۔ جو استدلال حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا ہے اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا نہیں۔

نبوت ایک منصب ہے، نہ کہ کوئی وجودِ خارجی۔ وزارت، گورنری، صدارت یہ سب مناصب ہیں۔ عہدے ہیں۔ مخصوص فرائض کی ذمہ داریوں کے اصطلاحی نام ہیں۔ ایسا نہیں کہ گورنری یا صدارت مستقل بالذات کوئی وجود ہو اور اسے الگ سے دیکھا اور چھوا یا سونگھا یا چکھا جا سکے۔ کرسی پر صدر رونق افروز ہو تو یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ذاتِ صدر کے علاوہ صدارت بھی کرسی پر تشریف فرما ہے۔ ٹھیک اسی طرح نبوت ایک منصب ہے نہ کہ وجودِ خارجی۔ انبیاء کے اجسام میں کوئی ایسا عضو یا کیمیاوی مادّہ یا خلیہ نہیں پایا جاتا جس کی طرف اشارہ کر کے کہہ سکیں کہ یہ ہے نبوت۔ نہ یہ ممکن ہے کہ نبی تو موجود نہ ہو مگر اسکی نبوت ایک قابلِ مشاہدہ یا لائقِ لمس یا لائقِ ادراک شے کی حیثیت میں موجود رہ جائے۔ منطق، علمِ کلام، فلسفہ، قرآن، حدیث سب اس سے ابا کرتے ہیں۔ پھر آخر یہ کیا بات ہوئی کہ آخری نبی تو دنیا سے چلا جائے مگر نبوت نام کی کوئی چیز باقی رہ جائے۔

کہنا یوں چاہیئے کہ نبوت کے ثمرات و برکات اور اثرات و منافع ختم نہیں ہوئے ہیں۔ وہ باقی ہیں اور ان شاء اللہ باقی رہیں گے۔ حضرت مہتمم صاحب نے اگرچہ "نبوت کی نعمت" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں لیکن پھر سے پڑھ دیکھئے ان کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ نبوت کی برکات دنیا میں باقی ہیں بلکہ صاف صاف یہ مطلب نکلتا ہے کہ جس نعمتِ الٰہی کا نام "نبوت" ہے وہی باقی چلے جا رہی ہے۔ اس کا انقطاع نہیں ہوا۔

اس ادعا کو اگر قادیانی حضرات اپنے حق میں استعمال کریں تو انھیں الزام دینا مشکل ہوگا کیونکہ حضرت مہتمم صاحب کی بات واقعتہً ان کے حق میں جاتی ہے اور یہ ایک مزید ثبوت ہے اس کے غلط ہونے کا کیونکہ جو بات باطل کی تائید کرے وہ خود بھی باطل ہی ہو سکتی ہے۔

اقتباس ثانی

"یہ ایک طبعی اصول ہے کہ جو وصف کسی پر ختم ہوتا ہے اسی سے شروع ہوتا ہے جو کسی چیز کا منتہا ہوتا ہے وہی اس کا مبدا بھی ہوتا ہے اور جو کسی شے کے حق میں خاتم یعنی مکمل ہوتا ہے وہی اس کے حق میں فاتح اور سرچشمہ بھی ہوتا ہے ہم سورج کو کہیں کہ وہ خاتم الانوار ہے جس پر نور کے سارے مراتب ختم ہو جاتے ہیں تو قدرتاً اسی کو سرچشمۂ انوار بھی ماننا پڑے گا...... ٹھیک اسی طرح جبکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا دلائلِ قطعیہ سے ثابت ہوا اور اس کے معنے بھی واضح ہو گئے کہ نبوّت اور کمالاتِ نبوت آپ پر پہنچکر ختم ہو گئے اور آپ ہی کمالاتِ علم و عمل کے منتہا ہوئے تو اصولِ مذکورہ کی رُو سے آپ ہی کو ان کمالات بشری کا مبداء اور سرچشمہ بھی ماننا پڑے گا کہ آپ ہی سے ان کمالات کا افتتاح اور آغاز بھی ہوا اور جسے بھی نبوّت یا کمالاتِ نبوت کا کوئی شمہ ملا وہ آپ ہی کے واسطہ اور فیض سے ملا ہے۔" (خاتم النبیین، صفحہ ۹)

جس اصولِ طبعی کے بیان سے اس اقتباس کا آغاز ہوا ہے وہ کیا واقعی کوئی اصول ہے؟ طبیعیات کے پورے لٹریچر میں

کسی ایک مقام کا تو حوالہ معلوم ہونا چاہئیے جہاں اس اصول کا اندراج ہوا ہو۔ ہم اقرار کریں گے کہ اس اصول سے متفق ہونے کے لئے ہمیں علم و منطق کے دفتر میں کوئی بھی معقول وجہ نہیں مل سکی۔

آپ نے فلاں گھرانے کی دعوت کی۔ فرداً فرداً مدعوئین آتے گئے۔ آپ کا لڑکا نظر رکھ رہا تھا کہ کون کون آتا جا رہا ہے۔ اسے آپ نے ہدایت کی تھی کہ جب سب آجائیں تو مجھے بتانا۔ رفتہ رفتہ سبھی آگئے۔ بس ایک فرد رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آجاتا ہے تو اس وقت بیٹا آپ سے کہے گا۔ یا والدی جاء خاتَمُ القوم۔ (ابا جی مدعو گھرانے کا آخری فرد بھی آگیا)

یہ عربی کا معروف اسلوب ہے۔ یہی اسلوب اور یہی لفظ خاتَم (تا کے زبر سے) قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ اب غور کیا جائے وہ نکات کہاں ہیں جو زیر بیان سے پیدا کئے گئے ہیں۔ آمد ایک وصف تھا جو آخری فرد کی آمد پر تمام ہو گیا مگر کیا یہی فرد آمد کا مبداء بھی ہے اور کیا اسے ہم اس معنی میں مُکمِل (درجۂ کمال کو پہنچانے والا) بھی کہہ سکتے ہیں کہ "آمد" کے متعدد نیچے اونچے مراتب ہوں اور یہ آخر میں آنے والا سب سے اونچے درجے پر فائز ہو۔ ظاہر ہے اس نکتہ سنجی کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ آمد کی ابتداء مدعوئین کے پہلے فرد سے ہوئی تھی جیسے کہ نبوت کی ابتدا حضرت آدمؑ سے ہوئی۔ بعد میں جو لوگ آتے رہے وہ اس سلسلۂ آمد کا مبداء کس معنی میں ہو سکتے ہیں۔ نبوت کا وصف خدا کی تکوینی اسکیم سے نکلا ہے۔ وہی نبوت دینے والا ہے اور نبوت کا مبداء اسی کے حکم اور مرضی کو کہہ سکتے ہیں نہ کہ کسی نبی کو۔ آخری نبی کی آمد پر اگر سلسلۂ نبوت تکمیل پا گیا تو یہ تکمیل بھی آخری نبی کا اپنا کارنامہ نہیں۔ نہ اس کے ذاتی ارادے یا عمل یا مرضی سے اس کا کوئی واسطہ ہے۔ مُکمِل یعنی تکمیل کو پہنچانے والا خدا ہے نہ کہ یہ نبی۔ یہاں نبی کی حیثیت فاعل کی نہیں منفعل کی ہے۔

سورج کی مثال نفس دعویٰ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ بات تو سائنسی دریافتوں سے قبل بھی معلوم تھی کہ آسمان پر جتنے نجوم چمکتے نظر آرہے ہیں وہ سب سورج کے رہین منت نہیں ہیں بس چاند وہ سیارہ ہے جو سورج سے کسب ضیا کر رہا ہے باقی اربوں کھربوں تاروں کی ضیا ان کی اپنی ضیا ہے۔ ان کا نور اپنا نور ہے۔ سورج کے احسان سے بے نیاز۔ اپنی مستقل تابانی رکھنے والے۔ لیکن اب سائنس نے تو یہ بھی بتادیا ہے کہ آسمان میں کروڑوں سورج اور ہیں جن میں سے نہ جانے کتنے ایسے ہیں جو ہمارے سورج سے بے شمار بڑے اور بے شمار روشن ہیں۔ ہمارا سورج ان کی تابش و ضیا باری کے آگے کچھ بھی نہیں۔ پھر بھلا کیا معنی رہ جاتے ہیں اس بات کے کہ سورج ہی سرچشمہ انوار ہے۔ سورج ہی روشنی کا مکمل اور اس کے حق میں فاتح ہے۔

واحد حقیقت یہ ہے کہ نور و ضیاء کا مبدا اور سرچشمہ کائنات میں سوائے ذاتِ باری کے کوئی نہیں۔ اور اسی طرح نبوت کا سرچشمہ نہ حضرت ابراہیمؑ ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ انھیں اللہ نے اور جو بھی صفاتِ عالیہ عطا کی ہوں بجا مگر نبوت کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے بشریت کا معاملہ۔ بشریت ایک وصفِ نوعی ہے جس کا فی ذاتہ کوئی خارجی وجود نہیں۔ نہ فی ذاتہ اس کے الگ الگ مدارج مراتب ہیں۔ اسی طرح نبوت ایک وصفِ منصبی ہے جو خارج میں کوئی ذاتی وجود نہیں رکھتی اور مدارج و مراتب سے معریٰ ہے۔ فلاں نبی پہلے آیا اور فلاں بعد میں۔ یہ ترتیب تکوینی ہے اس سے فضل و مرتبت کا تعلق نہیں ہے ایسا کوئی قاعدہ شریعت نے بیان نہیں کیا کہ ہر وہ نبی جو بعد میں آئے گا پچھلے سب نبیوں سے لازماً افضل ہی ہوگا تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض (بے شک ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی) مگر اس فضیلت کی بناء آمد کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر پر نہیں بلکہ دوسرے اوصاف پر ہے۔ متعدد انبیاء ہیں جو حضرت ابراہیمؑ سے بعد میں آئے مگر انھیں حضرت موصوف سے افضل و برتر نہیں

مانا جاتا۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سابق انبیاء کی نبوت کا مبداء اور سرچشمہ ہیں۔

مبدا اور تکمیل والی شاعری سے آگے بڑھکر جب ہم اگلے فقرے پڑھتے ہیں تو مزید شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ حضرت مہتمم صاحب پر شاعرانہ عقیدت بہت زیادہ غالب آگئی ہے۔

حضورؐ کا خاتم النبیین ہونا بلاشبہ دلائل قطعیہ سے ثابت ہے اور کسی اور دلیل کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے جب قرآن نے صاف الفاظ میں بیان کر دیا۔ مگر آیت کا سیاق وسباق اور مفہوم آپ دیکھ ہی چکے کہ اس لقب کا کیا مطلب ہے۔ یہی کہ آپؐ آخری نبی ہیں اور اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ کمالات کی کوئی بحث نہیں۔ نعت کا کوئی محل نہیں۔

ابھی مثال میں آپ نے دیکھا کہ خاتم القوم اُس آخری فرد کے لئے کہا گیا جو سب سے بعد میں آیا تھا۔ یہ فرد پہلے آنے والوں سے مراتب میں کم ہے یا زیادہ۔ افضل ہے یا کم رتبہ۔ اس سے قول کو کوئی واسطہ نہیں۔ یہ شخص اپنے اوصاف و محامد کی بنا پر افضل ترین ہو تو اس کے فضل وشرف کا انکار نہ ہوگا لیکن یہ دعویٰ تو نہ کر سکیں گے کہ اس فضل وشرف کا سبب اور مبنیٰ اس کا آخر میں آنا ہے

اسی طرح یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ حضورؐ انبیاء میں افضل ترین تھے لیکن اس فضل کی بنیاد زیرِ تذکرہ آیت کے لفظ خاتم النبیین میں نہیں۔ یہ لفظ کمالات و درجات کے تعلق سے نہیں بولا گیا۔ اسے اپنے سادہ اور معلوم مصداق سے ہٹا کر نکاتِ لطیفہ کا مصدر بنانا فلسفیانہ شاعری ہے۔ قرآن میں اضافہ ہے۔ نامشکور سعی ہے۔ انصاف اور معقولیت اور منطقی دراست اسے ہرگز نہ کہہ سکیں گے۔

پھر آخری فقرے میں تو غضب ہی کر دیا گیا۔

"اور جسے بھی نبوت یا کمالاتِ نبوت کا کوئی شمہ ملا وہ آپ ہی کے واسطہ اور فیض سے ملا ہے۔"

ضرورت ہے کہ اس کا تجزیہ کیا جائے۔

جہاں تک نبوت کا تعلق ہے ایسی کوئی نص اور دلیلِ قوی موجود نہیں ہے کہ جملہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت آخری نبی کی نبوت سے مشتق یا مستفیض ہو۔ سادہ وصاف واقعہ یہ ہے کہ جتنے بھی انبیاء گذرے ان کے زمانوں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بشری وجود تھا ہی نہیں۔ کتبِ سماوی میں ایک آنے والے پیغمبر کی خبریں تو دی جاتی رہیں مگر یہ نہیں کہا گیا کہ اس پیغمبر کو ہم کہیں پیدا کر چکے ہیں اور آخر میں وہیں سے زمین پر اتاریں گے۔ تمام انبیاء کے ادوار ختم ہو گئے۔ پھر آخری نبیؐ نے اپنی ماں کے پیٹ سے اسی طرح جنم لیا جس طرح دوسرے انسان لیتے ہیں۔ یہ نبی پچھلے انبیاء کے زمانوں میں انہیں چھپا کر رکھا گیا ہو اور اس کی ذات سے نبوت کا دریا پھوٹ کر بعض انسانوں کو وقتاً فوقتاً آبِ نبوت میں غسل دیتا رہا ہو ایسا تو کسی نص اور وحی سے معلوم نہیں ہوا۔ پھر کیسے مان لیں کہ ایک ایسا وجود اپنے اثرات ڈال سکتا ہے جو فی الحقیقت موجود ہی نہ ہو۔

بعض روایات ایسی بے شک ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے حضورؐ کا نور پیدا کیا۔ لیکن ان روایات کے سلسلے میں چند باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔

ایک یہ کہ ان کی سندیں صحیح وقوی نہیں ہیں اور اسی لئے ان معروف محدثین نے انھیں اپنی کتابوں میں نہیں لیا جو صحیح وغلط اور قوی وضعیف کے معاملہ میں کافی محتاط تھے۔

دوسرے ان میں سے مضبوط تر روایت کی بھی حیثیت ائمہ فن کے نزدیک اس سے بڑھ کر نہیں کہ وہ فقط گمانِ غالب یعنی ظن کا فائدہ دے سکتی ہے جزم ویقین کا نہیں۔ اسے اسی صورت میں قبول کیا جا سکے گا جب احادیثِ قویہ اور آیاتِ قرآنیہ کے دئیے ہوئے

تصورات وعقائد اور اصول ومناہج اس سے مطابقت و موافقت کر سکتے ہوں۔ اگر تصادم و تخالف کی صورت پیدا ہو گئی تو اسے ناقابل التفات قرار دیدیا جائیگا۔

تیسرے ان روایات میں نور محمدیؐ کا ذکر ہے ذاتِ محمدیؐ کا نہیں اور نور جس چیز کا بھی نام ہو نبوت بہرحال اس سے الگ شے ہے۔ نور، روشنی، ضیا، تابانی، اُجالا کوئی لفظ استعمال کیجئے۔ یہ بہرحال محسوس ومشاہد شے کا نام ہے۔ آدمی کی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے اور دیکھتی ہے۔ لیکن کیا نبوت بھی اسی طرح کوئی الگ سے نظر آنے والی چیز ہے۔ وہ تو جیسا کہ ہم وضاحت کر آئے ایک منصب کا اصطلاحی نام ہے۔ اس کا تعلق انبیاء کی ذوات سے کم وبیش ایسا ہی ہے جیسے تمام انسانوں سے قرآنی احکام کا تعلق۔ نبوت ایک فیصلہ ہے جو اللہ نے کچھ بندوں کے بارے میں کیا اور اللہ کے فیصلے مخلوق نہیں ہوا کرتے نہ ان کو کسی بھی مفکر نے مخلوقات اور مصنوعات کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

اگر واقعی سب سے پہلے حضورؐ کا نور ہی پیدا کیا گیا ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ نور ہی کی طرح نبوت بھی کوئی روح یا روشنی جیسی خارجی وجود رکھنے والی شے تھی جسے اُوقت پیدا کیا گیا۔ بہت سے بہت یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضورؐ کا نبی بنایا جانا تو اللہ کے علم میں ہمیشہ سے تھا لہٰذا جس وقت ان کا نور پیدا کیا اُس وقت بھی وہ نبوت سے بے تعلق تو نہ ہوگا۔ لیکن اس کہنے سے کچھ حاصل نہیں۔ نبوتِ محمدیؐ کی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں کا علم بھی تو اللہ کو ہمیشہ سے تھا پھر حضورؐ کی تخصیص بار ہی اور تقدم کیسے ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں علم الٰہی مخلوقات کے قبیل سے نہیں۔ وہ تو ازلی وابدی وصفِ باری ہے۔ اسکے اعتبار سے کوئی نبوتِ محمدیؐ کو تقدم دے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ نبوتِ محمدیؐ —— بلکہ سارے ہی انبیاء کی نبوتیں ازلی ابدی ہیں۔ اوصافِ خداوندی کی طرح قدیم ہیں۔ یہ تو صریح البطلان ہیں لہٰذا بعض غیر قوی روایات کو قبول کر لینے کی صورت میں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبوتِ محمدیؐ سب سے پہلے پیدا کی گئی۔ جب یہی ثابت نہیں ہوتا تو یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ باقی سب نبیوں کی نبوتیں اسی ایک نبوت کے سرچشمہ سے نکلی ہیں۔

رہی کمالاتِ نبوت کی بات۔ تو اس مبہم کو مفصل ہونا چاہئیے۔ نبوت کے بہت سے اجزاء ہیں لیکن اجزاء کی نوعیت ایسی نہیں ہے جیسے جسم انسانی یا نباتات وجمادات کے اجسام بہت سے اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ نوعیت تو اس وقت ہوتی ہے جب نبوت کا کوئی خارجی وجود ہوتا۔ وہ کوئی جسم ہوتی۔ یا جسم نہ سہی بجلی جیسا کوئی ثبت اور قابلِ احساس وجود رکھتی۔ مگر کہاں۔ وہ تو اسی طرح ایک اعتباری اور خالص معنوی شے ہے جیسے صدارت ووزارت۔ اس لئے اسکے اجزاء اُن اوصاف وخواص ہی کو کہا جاسکے گا جو معناً اس کے لئے ضروری ہوں۔ جیسے سچ بولنا۔ انصاف کرنا۔ سچے خواب دیکھنا۔ مکروہات سے بچنا۔ حسنِ اخلاق سے وابستہ رہنا۔ یہ تمام اوصاف اجزائے نبوت ہیں مگر تو خرالذکر مفہوم میں۔ اگر یہ پہلے مفہوم میں اجزاء ہوتے تو پھر امت کا مسلم عقیدہ یہ نہ ہوتا کہ حضورؐ کے بعد کوئی خواہ کتنا ہی بڑا متقی اور نکوکار ہو وہ نبی نہیں ہو سکتا۔ اس متفقہ عقیدے ہی سے ظاہر ہے کہ نبوت فی نفسہٖ ان اجزاء سے الگ ایک چیز ہے جس طرح روح جسمانی مادوں اور گوشت پوست سے الگ ایک چیز ہے۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ روح مخلوق ہے اور ایک وجودِ خارجی رکھتی ہے مگر نبوت وجودِ خارجی یا وجودِ مستقل نہیں رکھتی وہ صرف مرضیِ رب کی ترجمانی کرنے والی ایک معنوی شے ہے۔

جب یہ بات سمجھ لی گئی تو یہ بھی صاف ہو گیا کہ نبوت کے بعض خواص واوصاف کا آج بھی پایا جانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ نفسِ نبوت بھی پائی جا رہی ہو۔ صداقت، عدل، حسنِ اخلاق آج بھی ناپید نہیں۔ سچے خواب آج بھی دیکھے جاتے ہیں۔ اولیاء اللہ سے کرامتیں آج بھی صادر ہوتی ہیں۔ ان سب پر نبوت کے اجزاء

یا خواص یا اثرات کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر نفس نبوت کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ جو کچھ لوگوں نے ظلّی اور بروزی نبوت کا فضول راگ چھیڑا ہے یہ اسی کم فہمی کا نتیجہ ہے کہ نبوت کی حقیقت اور اصلیت کو نظر انداز کیا گیا اور شاعرانہ تخیلات کے سہارے دور از کار مفروضات گھڑ لئے گئے۔

اقتباس ثالث :-

"آپ کی سیرت کا بیان محض کمال کا بیان نہیں بلکہ امتیازی کمالات اور ان کے بھی انتہائی نقاط کا بیان ہے جو اسی وقت ممکن ہے کہ آپ کی ختم نبوت کو مانا جائے کہ یہ امتیازات اور امتیازی کمالات مطلق نبوت کے آثار نہیں بلکہ ختم نبوت کے آثار ہیں کیونکہ ختم نبوت خود ہی نفس نبوت سے ممتاز اور افضل ہے کہ سرچشمۂ نبوّات ہے۔" (خاتم النبیین صفحہ ۱۸)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مہتمم صاحب قادیانی عقیدے کی تردید کر رہے ہیں نیز تائید ختم نبوت پر زور دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ مرزا غلام احمد کو نبی تصور کرنا باطل ہے خواہ ظلّ و بروز اور تاویلات کے کتنے ہی غلاف چڑھائے جائیں۔

لیکن صاحبِ مضمون نے شاید اسے قادیانیت کا مؤید اس لئے سمجھ لیا ہے کہ اس میں خصوصیت سے ختم نبوت کو سرچشمۂ نبوّات کہا گیا ہے۔ جب ختم نبوت بھی سرچشمۂ نبوات ٹھیرا تو قادیانیوں کا یہ استنباط بے جا نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی انبیاء کی گنجائش موجود ہے کیونکہ جب سرچشمہ موجود ہے تو اس سے نئی نہریں بھی نکالی جا سکتی ہیں۔ جسے موقعہ ملے اس سرچشمے سے ڈول بھرلے اور آبِ نبوت سے غسل کر کے نبی بن جائے۔

ہم دُکھ کے ساتھ عرض کریں گے کہ یہاں بھی حقائق شاعری میں گم ہو گئے ہیں۔ غور کیجئے۔ ختم ہو جانا ایک سلبی صفت ہے۔ خاتمہ گویا ایک اعتباری لکیر کو کہتے ہیں جو وجود اور عدم کے درمیان کھنچتی ہے۔ دھوپ اور سائے کی مثال لیجئے۔ جہاں یہ دونوں مل رہے ہوں وہاں آپ ایک خط کا احساس ضرور کریں گے جو ان دونوں کو جدا کر رہا ہو گا۔ لیکن تجزیہ کر کے بتائیے کیا واقعی یہاں کوئی ایسا خط موجود ہے جو دھوپ اور سائے دونوں سے الگ اپنا کوئی مستقل وجود رکھتا ہو۔ جس کی طرف انگلی اٹھا کر کہہ سکیں کہ یہ دھوپ اور سائے کے علاوہ ایک شے ہے جو ان دونوں کو جدا کر رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے آپ کا جواب نفی میں ہو گا۔ دھوپ اور سایہ دونوں ایک حد پر ختم ضرور ہوئے ہیں لیکن یہ حد ان کے نفس الامری وجود پر زائد کوئی شے نہیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کا خاتمہ امرِ واقعہ بے شک ہے لیکن خاتمہ فقط ایک سلبی مفہوم ہے اور ختم نبوت کو نفسِ نبوت سے ممتاز اور افضل قرار دے کر نبوّات کا سرچشمہ کہنا ایک ایسا قول ہے جس میں فقط الفاظ ہیں معانی نہیں۔ نکتہ آفرینی ہے۔ استدلال نہیں۔ شاعری ہے برہان نہیں۔

اقتباس رابع

"سب جانتے ہیں کہ اس ایمانی حرارت اور گرمی عشق خداوندی کے سرچشمے انبیاء علیہم السلام ہیں اور ان کی ایمان گرمی کا واحد سرچشمہ ذات بابرکات نبوی ہے کیونکہ آپ خاتم النبوۃ ہیں جس کے فیض سے انبیاء و اُمم کو روحانی حرارت ملی ہے۔ پس اور انبیاء اگر نجوم نبوت ہیں تو آپ آفتابِ نبوت ہیں۔ اس لئے اگلوں اور پچھلوں کی ایمانی آب و تاب اور روشنی کا سرچشمہ آفتابِ نبوت ہے۔"

(آفتاب نبوت۔ صفحہ ۴۸)

اس پر کچھ زیادہ کہنا غیر ضروری ہو گا کہ اوپر کی گفتگو اس کا احاطہ کر چکی۔ بے شک حرارتِ ایمانی کے زندہ پیکر اور مہبط انبیاء ہی تھے۔ ان پر لاکھوں سلام۔ لیکن یہ دعویٰ دلیل سے

محروم اور عقل و منطق کی پشت پناہی سے عاری ہے کہ پچھلے تمام انبیاء کی حرارتِ ایمانی اور گرمیِ عشق آخری نبی کی رہینِ منت ہو۔ آخری نبی کو مرتبے کے لحاظ سے آفتاب اور دوسروں کو نجوم کہہ دینا اچھی تمثیل ہے لیکن جس طرح نجوم کی ضیا ان کی اپنی نیا ہے سورج پر اس کا انحصار نہیں اسی طرح ہر ہر نبی کی بوت اس کی اپنی دولت ہے جو اللہ نے براہ راست عطا ی ہے۔ سب کو کسی بندے کا محتاج اور باج گذار بنادینے سے کہیں بہتر ہے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کا ممنون بنایا ائے جس کی بخشش وعطا اور آقائی مسلّمات میں سے ہے۔ لوئے عقیدت کسی بھی نوع کا ہو شرعاً پسندیدہ نہیں اور ر حضورؐ نے لاتطروني فرماکر تنبیہ کردی ہے کہ میرے رے میں شاعرانہ بلند پروازیاں مت کرو۔ کما اَطْرَتِ نصاریٰ عیسیٰ ابن مریمؑ (جیسے عیسائیوں نے عیسیٰ ابن یمؑ کو بڑھایا چڑھایا)

تباس خامس

"آپ کا اصل امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ نورِ نبوت میں سب انبیاء کے مربّی ہیں، اُن کے حق میں مصدرِ فیض اور ان کے انوارِ کمال کی اصل ہیں۔ اس لئے اصل میں نبی آپ ہیں اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اصل سے نہیں بلکہ آپ کے فیض سے نبی ہوئے ہیں۔" (آفتاب نبوت، ص۱۰۸)

کسی بات کو بار بار الفاظ بدل کر دہرانا دلیل کا قائم مقام یں ہوسکتا۔ جو کچھ پچھلے اقتباسات میں کہا گیا وہی یہاں لفظی اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔

یہ بات ہم نہیں چھپائیں گے کہ حضورؐ کے لئے یہ طرز ۔ اختیار کرنے والے حضرت مہتمم صاحب پہلے آدمی نہیں بلکہ بعض سلف کے یہاں بھی اس طرح کی چیزیں ملتی ہیں حتّیٰ لامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے نامور مفسرِ قرآن نے خاتم النبیین اشیہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"بعض محققین کے نزدیک تو انبیائے سابقین اپنے اپنے عہد میں بھی خاتم الانبیاء صلعم کی روحانیت عظمیٰ ہی سے مستفید ہوتے تھے۔ جیسے رات کو چاند اور ستارے سورج کے نور سے مستفید ہوتے ہیں حالانکہ سورج اس وقت دکھائی نہیں دیتا۔ اور جس طرح روشنی کے تمام مراتب عالمِ اسباب میں آفتاب پر ختم ہوجاتے ہیں اسی طرح نبوت و رسالت کے تمام مراتب و کمالات کا سلسلہ بھی روحِ محمدی صلعم پر ختم ہوتا ہے۔"

علامہ عثمانیؒ ہمارے چچا تھے اور اپنے زمانے کے بے نظیر عالم ان میں اور ہم میں علم و تبحّر کے اعتبار سے سورج اور چراغ کی نسبت ہے لیکن جن علمی اصولوں پر ان کا ایمان تھا وہ اصول شخصیات کے تابع نہیں اور ان ہی اصولوں کی روشنی میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ محققین سے جس خیال کو عمِ مکرم نے منسوب فرمایا ہے وہ مجرد ایک خیال ہے جس کیلئے مضبوط دلائل نہیں پائے جاتے۔

نجوم اور سورج کی جو تمثیل بیان کی گئی اس کو تحلیل کر کے دیکھا جائے تو اس کے پیچھے یہ مفروضہ کام کرتا نظر آتا ہے کہ نورِ محمدیؐ سب سے پہلے پیدا کیا گیا اور اس کے بعد نوعِ بشر تخلیق کی گئی۔ گویا حضورؐ ظاہراً چاہے بعد میں پیدا ہوئے ہوں مگر باطناً وہ اس وقت بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھے جب پچھلے انبیاء آتے اور جاتے رہے۔

یہ مفروضہ جیسا کہ ہم اشارہ کر آئے ہیں کمزور روایات پر قائم ہے جنھیں حجت نہیں مانا جا سکتا۔ نیز یہ بھی ہم عرض کر چکے کہ آسمان میں نظر آنے والے تمام ستارے اس سورج سے نور حاصل نہیں کرتے جو ہماری دنیا پر طلوع و غروب ہو رہا ہے۔ نہ روشنی کے تمام مراتب اس سورج پر ختم ہوگئے ہیں۔ سائنس کی آنکھ نے اسی عالمِ اسباب میں کتنے ہی سورج اس سے بڑھ کر روشن دیکھ لئے ہیں۔ لہٰذا یہ تمثیل حسنِ خیال اور جمالِ انشاء کا نمونہ تو ہوئی مگر حقائق سے ہم آہنگ نہ ہوئی۔

اور اسے بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کہ علامہ عثمانیؒ

کا ذاتی خیال وہ نہیں ہے جو بعض محققین کا ہے۔ اپنا خیال تو انھوں نے حاشیہ کی ابتدائی سطور میں بیان کیا محققین کے خیال کو وہ نہ اپنا سکے۔ اگر انھیں اس سے کامل اتفاق ہوتا تو بطور تفسیر آغاز ہی میں اسے بیان کرتے بس بعض محققین تک محدود نہ کر دیتے۔

حاشیہ کا خاتمہ جن فقروں پر علامہ عثمانیؒ نے کیا ہے انھیں بھی پڑھ لیا جائے:-

"ختم نبوت کے متعلق قرآن، حدیث، اجماع وغیرہ سے سیکڑوں دلائل جمع کر کے بعض علمائے عصر نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مطالعہ کے بعد ذرا تردد نہیں رہتا کہ اس عقیدے کا منکر قطعاً کافر اور ملتِ اسلام سے خارج ہے۔"

اب اندازہ کر لیجئے کہ جو لوگ غیر مبہم انداز میں ختم رسالت کو نہ مانیں بلکہ خوشنما الفاظ کے ہیر پھیر سے ضمنی ذیلی اور ظلی و بروزی نبوتوں کی گنجائش نکالے جائیں وہ کہاں تک مومن صادق ہو سکتے ہیں۔

ایک عجیب تر بات یہ ہے کہ حضرت مہتمم صاحب تمام انبیاء کو حضورؐ کا طفیلی نبی قرار دیتے ہوئے یہ تک دعویٰ کر رہے ہیں کہ حضورؐ کا اصل امتیازی وصف ہی ہے۔ اگر اسے مان لیں تو مجبوراً یہ بھی ماننا ہوگا کہ قرآن نے پیغمبر کے تعارف کا حق ادا نہیں کیا۔ پیغمبر کے گوناگوں اوصاف و محامد اور درجات و مراتب کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ وہی وصف وامتیاز موجود نہیں جسے اصل قرار دیا جا رہا ہے۔ کیا یہ قابلِ فہم اور قرینِ قیاس ہے؟

اقتباس سادس

"حضورؐ کی شان محض نبوّت ہی نہیں نکلتی بلکہ نبوّت بخشی بھی نکلتی ہے کہ جو بھی نبوت کی استعداد پایا ہوا فرد آپ کے سامنے آگیا نبی ہوگیا۔"

(آفتاب نبوت، صفحہ ۱۰)

مبالغے نے دو قدم اور آگے بڑھائے۔ مہتمم صاحب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی دنیا میں تشریف آوری سے قبل جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے وہ اسی نورِ محمدیؐ کے فیض و اثر اور بخشش و عطا سے نبی ہوئے جو پہلے ہی تخلیق ہو چکا تھا۔ گویا کسی بھی نبی کو اللہ کی طرف سے نبوت براہ راست نہیں ملی بلکہ نورِ محمدیؐ میں نبوت کا جو عظیم خزانہ اللہ نے رکھ دیا تھا وہی قرناً فقرناً تقسیم ہوتا رہا۔ بلکہ "نبوت بخشی" کے الفاظ تو یہ بتاتے ہیں کہ نورِ محمدیؐ اپنی ابتدائے آفرینش ہی میں ایک ایسا وجود تھا جس میں ارادہ، شعور، اختیار، قدرت اور عمل کے اوصاف پائے جاتے تھے۔ وہ یہ تمیز کر سکتا تھا کہ فلاں افراد میں نبوت کے تحمل کی استعداد ہے اور فلاں میں نہیں ہے اور تمیز کے بعد اربابِ استعداد کو نبوت عطا کرتا رہتا تھا۔ اس طرح نبی سازی کا سارا کریڈٹ صرف نبوتِ محمدیؐ کی حد تک تو اللہ کے حصے میں آتا ہے باقی بے شمار انبیاء کی نبوتوں کا کریڈٹ حضورؐ کو مل جاتا ہے۔

قادیانیوں کو اس سے یہ استدلال بھی ملا کہ روحِ محمدیؐ تو بہرحال فنا نہیں ہوئی۔ وہ آج بھی کہیں نہ کہیں موجود ہی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ پہلے اس نے ہزاروں انسانوں کو نبوت بخشی تو اب نہ بخشے۔ اب بھی ایسے بندے پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں جو استعدادِ نبوت کے حامل ہوں لہٰذا مرزا غلام احمد قادیانی ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ روحِ محمدیؐ اسے نبوت بخشنے میں بخل کرے۔ اس میں تو بلا کی استعداد موجود تھی اور وہ تو خیر سے مہدیِ موعود ٹھیرا۔

خدایا ہم پر رحم فرما۔

اللہ کے رسول فرماتے ہیں۔ لو کان بعدی نبیٌّ لکان عمر (میرے بعد اگر کوئی نبی ہو سکتا تو عمرؓ ہوتا) نیز فرماتے ہیں۔ ما طلعت الشمس علیٰ رجلٍ خیرٍ من عمرؓ (عمرؓ سے بہتر کسی شخص پر سورج طلوع نہیں ہوا) اس طرح کی متعدد احادیث ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت عمرؓ میں وہ استعداد موجود تھی جو نبوت کے لئے کافی ہوتی ہے لیکن نبوت بخشنے والے خدا ہی نے جب یہ سلسلہ ختم کر دیا تو کون کسی کو نبوت دے سکتا۔

یہیں سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ حضورؐ کی طرف "نبوت بخشی" کا انتساب کر کے مہتمم صاحب نے احتیاط کو نظر انداز کر دیا۔

"جو بھی نبوت کی استعداد پایا ہوا فرد آپ کے سامنے آگیا نبی ہوگیا۔"

یہ دعویٰ اگر صحیح ہے تو کم سے کم حضرت عمرؓ کو تو نبی ہونا ہی چاہیئے تھا کہ ان کی استعداد پر مہرِ تصدیق خود زبانِ رسالت لگا رہی ہے۔

نبوت کو نور اور ضیا سے تشبیہ دینا ہی بنیاداً غلط ہے آفتاب کے سامنے آپ آئینہ رکھیں لازماً وہ دمک اُٹھے گا۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عمرؓ بہ نفسِ نفیس حضورؐ کے سامنے ہیں لیکن نبی نہیں بن پاتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نبوت عکس وانعکاس اور فیض واستفاضہ کی تشبیہات سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اقتباس شایع

"جیسے آفتاب کے لئے محض نور ہی ہونا اصل کمال نہیں بلکہ مصدرِ نور اور اصل انوار ہونا کمال ہے ایسے ہی آفتابِ نبوت ذات بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محض نبی ہونا امتیازی کمال نہیں کہ یہ کمال سارے انبیاء میں مشترک ہے۔ بلکہ مصدرِ نبوت اور سرچشمۂ نبوت ہونا کمال ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب انبیاء کی نبوتیں آپ کی نبوّت سے ماخوذ اور اس کی تربیت یافتہ ہیں تو ولایت وامامت بہ طریقِ اولیٰ ختمِ نبوت کا فیض ہوگی ...... انبیائے سابقین کی نبوتیں جہاں آفتاب کا ظلِ محض ہیں وہیں ایک گو نہ استقلال بھی رکھتی ہیں لیکن ولایتِ اولیا وحدوث وبقا دونوں میں تابع محض ہے۔ اور آفتاب نبوت سے ہٹ کر کسی درجہ میں باقی نہیں رہ سکتی۔"

(آفتابِ نبوت، ص۱۲۲ وص۱۲۳)

وہی مفروضات وتخیلات۔

جو بنیادی مقدمات خودِ محتاجِ ثبوت ہیں انھیں مسلمات کے درجہ میں رکھ کر علم کلام کی گاڑی آگے بڑھائی جا رہی ہے مقصود نیک ہے کہ حضورؐ کا فضل وشرف ثابت ہو۔ لیکن نیک ہی مقصد سے جن صالحین نے ترغیب وترہیب اور فضائلِ اعمال کی بے شمار حدیثیں گھڑی تھیں انھیں علمائے حق نے خراجِ تحسین ادا نہیں کیا اسطرح کی شاعرانہ فلک پیمائیوں کو صداقتوں اور حقیقتوں کی بارگاہ سے خراجِ تحسین نہیں مل سکتا۔

ولایت، فیضِ نبوت ہو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ مگر ختمِ نبوّت کا فیض ہو یہ قابلِ فہم نہیں۔ ختم عدمِ محض کا عنوان ہے۔ عدمِ محض سے کسی مثبت چیز کا اخراج وترشح ہو اس کی کوئی نظیر معلوم قوانینِ کائنات میں نہیں ہے۔ لفظوں کا کھیل اور بس!

جہاں تک تشبیہات کا تعلق ہے سورج اور نجوم والی تشبیہ تو حدیثوں میں نہیں ملتی۔ ہاں ایک اور تشبیہ وتمثیل ملتی ہے جو خود زبانِ رسالت سے ادا ہوئی۔ یقیناً وہ مفید ہوگی۔ آپ بھی سنئے:۔

عن ابی هريرة قال	ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ
قال رسول الله صلى	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اور
الله عليه وسلم مثلى	جملہ انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے
ومثل الانبياء كمثلِ	ایک محل کہ جس کی عمارت بہت عمدہ
قصرٍ اُحسِنَ بُنيانُهُ	بنائی گئی ہو مگر ایک اینٹ کی جگہ
تُرِكَ منه موضعُ لَبِنَةٍ	چھوڑ دی گئی ہو۔ دیکھنے والے ارد
فطاف به النُظّار	گرد پھر کر اس کے حسن کا نظارہ کرتے
يَتَعَجَّبون من حسن	ہوں اور متعجب ہوتے ہوں لیکن
بُنيانه الا موضع تلك	انھیں احساس ہوتا ہو کہ ایک اینٹ
اللَّبِنة فكنت انا	کی جگہ خالی پڑی ہے۔ میری مثال
سددت موضع اللبنة	اس آخری اینٹ جیسی ہے جس نے یہ خلا
ختم بى البنيان وختم	پُر کر دیا اور عمارت مکمل ہوگئی۔
بى الرسل (مشكوٰة - بحواله بخاری ومسلم - باب فضائل سید ...)	گویا سلسلۂ رسالت ختم ہوگیا۔

اس تمثیل کا تجزیہ کیجئے۔ پہلی بات جو اس سے ظاہر ہے یہ ہے کہ قصرِ نبوت کا معمار کوئی اور ہی ہے حضورؐ نہیں۔ حضورؐ کا نور چاہے پہلے ہی پیدا کیا جا چکا ہو مگر دوسرے انبیاء کو نبوت بخشنے سے اس نور کا کوئی تعلق نہیں۔ ہر نبی قصرِ نبوت میں ایک اینٹ کی مانند ہے۔ حضورؐ بھی خود کو اینٹ ہی سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ اینٹیں تعمیر کے کام میں منفعل اور متأثر کا درجہ رکھتی ہیں فاعل اور مؤثر کا نہیں۔ کسی بھی اینٹ کو دوسری اینٹ کیلئے معمار اور محسن و معطی کا درجہ نہیں دے سکتے۔

دوسری بات جو ظاہر و باہر ہے یہ ہے کہ نفسِ نبوت کی حیثیت سے حضورؐ نے اپنی نبوت سمیت تمام نبوتوں کو ایک ہی نوع کا ہم وزن اور ہم رتبہ قرار دیا۔ اینٹ اینٹ اپنے اجزائے ترکیبی اور قدر و قیمت کے لحاظ سے برابر ہے۔ کسی اینٹ کا پہلے اور کسی کا بعد میں شاملِ تعمیر ہونا ان کے رتبے کا فرق واضح نہیں کرتا۔ کوئی وجہ نہیں کہ بعد میں رکھی جانے والی اینٹ کو پہلی اینٹوں کے لئے مربی اور معطی اور مصدرِ فیض اور سرچشمۂ کمال قرار دیا جائے۔ حضورؐ سے بڑھ کر یہ علم کسے ہو سکتا تھا کہ نبوت خدا کے اِس فیصلے کا نام ہے کہ فلاں بندہ میرا پیغام بندوں کو پہنچائے۔ خدا کا کوئی بھی فیصلہ اس کے دوسرے فیصلوں سے کمتر اور گھٹیا کیسے ہوگا لہذا جو نبوت آدمؑ اور یونسؑ یا کسی بھی بندے کو عطا کی گئی وہ فی نفسہٖ (من حیث ہی ہی) برابر، ہم وزن، ہم رتبہ اور ہم جنس تھی۔ کسی نبی کی نبوت کو افضل اور کسی کی نبوت کو مفضول نہیں کہہ سکتے۔ کوئی ایک دوسرے کی باج گذار اور محتاج اور ضمیمہ اور عطیہ نہیں۔ انبیاء کے مابین فرقِ مراتب دیگر وجوہ سے ہے۔ مجردِ نبوت کے معاملے میں وہ سب اسی طرح یکساں ہیں جیسے بشریت کے معاملہ میں۔

تمثیلِ نبویؐ سے عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دستِ قدرت سے نبوت کا ایک محل تعمیر فرماتے جا رہے ہیں۔ آغاز آدمؑ سے ہوا۔ قرناً فقرناً تعمیر بلند ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ حضورؐ پر مکمل ہو گئی۔ تکمیل جس آخری اینٹ پر ہوئی وہ اینٹ ہونے کی حیثیت سے بہرحال ان دوسری اینٹوں جیسی ہے جو محل میں لگ چکی ہیں۔ تکمیل کو پہنچانے والا معمار ہے نہ کہ یہ اینٹ۔ تکمیل سے ہر ہر اینٹ کو نسبت فعلیت کی نہیں انفعال کی ہے۔ تکمیل و تعمیر دونوں کا تمام کریڈٹ معمار کو جاتا ہے جبکہ یہ معمار نقشہ ساز بھی ہے اور انجینئر بھی خود۔ ہر اینٹ اس نے اپنے کارخانۂ قدرت میں ڈھالی ہے اور اس صنعتِ نادرہ ہی کو ہر ہر اینٹ کا مصدر و منبع اور سرچشمہ قرار دے سکتے ہیں۔ یہ کیا کہ جس اینٹ پر عمارت مکمل ہوئی اسے ہم تمام اینٹوں کی اصل اور ماخذ اور منبع اور مرجع کہنے لگیں۔

بہرحال تمثیل آپ کے سامنے ہے۔ اگر زبانِ رسالت کی بیان فرمودہ تمثیل ناقص و ناکارہ نہیں ہو سکتی تو پھر ماننا ہوگا کہ نقص و خامی ان تمثیلات میں ہیں جو صورتِ واقعہ کی کوئی اور تصویر پیش کرتی ہیں۔ صحیح تصویر وہی ہے جو حضورؐ نے پیش کی۔

سورج اور ستاروں کی مثال اگر اُس سادہ مشاہدہ کے اعتبار سے ہو جس سے انسان کے سر کی آنکھیں آشنا ہیں تب تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بلاشبہ آفتابِ محمدیؐ کی آب تاب اور فیض رسانی اور وسعتِ اثر دوسرے تمام انبیاء کے مقابلے میں ایسی ہی نمایاں ہے جیسے ستاروں کے مقابلے میں آفتاب کی ضیا۔ یہ مثال ایسی ہی ہوگی جیسے محبوب کو چاند سے تشبیہ دیدی جاتی ہے۔ اس تشبیہ سے فقط اُس فرحت انگیز احساس و وجدان کا اظہار ہوتا ہے جو چاند کے نظارے کا حاصل ہے۔ اور کسی بھی وصف میں مشابہت پیشِ نظر نہیں ہوتی۔ اسی طرح آفتاب والی تشبیہ میں سادہ نظارے کی کیفیت کو وجہِ شبہ بنایا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ حضورؐ تو آفتابِ عالم تاب ہیں ہی۔ لیکن چاند سورج سے روشنی لیتا ہے یہ ایک سائنسی دریافت ہے سر کی آنکھوں سے نظر آنے والی چیز نہیں۔ اور تمام نجوم ہمارے سورج سے روشنی لیتے ہوں یہ تو سائنسی اعتبار سے بھی غلط ہے۔ لہٰذا

اس طرح کے اوصاف و خواص کو بھی تشبیہ میں شامل کر لینا شاعرانہ نکتہ سنجی کے سوا اور کیا ہوگا۔ آدمی کو شیر سے تشبیہ دی جائے تو مرکب خیال کو بس شجاعت کی حدوں میں رکھیئے۔ اگر بکٹٹ دوڑائیں گے تو تشبیہ اضحوکہ بن جائے گی۔ اسی طرح جب محبوب کو چاند کہیں تو اس چکر میں مت پڑیئے کہ چاند کی طرح وہ کسی معینہ مدار پر گردش بھی کرتا ہے اور اس کی کشش سے سمندروں میں جوار بھاٹے بھی آتے ہیں اور اس کا جسم پرکار سے بنائے ہوئے دائرے کی طرح گول ہے وغیرہ۔

اللہ نے حضورؐ کو سراج منیر فرمایا۔ نور فرمایا۔ موٹی عقل اور غلو کیش عقیدت مندوں نے یہ تصور کر لیا کہ اب نور و ضیا کے سارے ہی اوصاف حضورؐ میں ثابت کرنے چاہئیں۔ ان کا سایہ نہیں۔ ان سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ ان ہی کے فیض سے کائنات میں اُجالا ہے۔ وہی عالم آب و گل کو نعمتیں تقسیم فرما رہے ہیں وغیر ذلک۔ اسی طرح اللہ نے حضورؐ کو شاہد فرمایا اور کم عقلوں نے موقعہ محل کا لحاظ رکھے بغیر طبع آزمائی شروع کر دی کہ شاہد تو وہ ہوگا جو دیکھ بھی رہا ہو لہٰذا کائنات کی ہر چیز کا حضورؐ کی نگاہ اور مشاہدے میں ہونا ثابت ہو گیا۔

یہ دراصل ایک قسم کا ذہنی مرض ہے جس نے ہر ملک و قوم اور ہر مذہب و ملت میں بڑے فتنے پیدا کئے ہیں۔ اس سے کوئی بھی چیز ثابت تو نہیں ہوتی۔ البتہ ثابت شدہ حقائق مسخ و تحریف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عقائد صحیحہ میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے اور مذہب توہمات کا پلندہ بن جاتا ہے۔

اقتباسات ختم ہو گئے لہٰذا ہماری گفتگو کو بھی ختم ہو جانا چاہیئے مگر جس بے تہہ علم کلام اور نکتہ سنجی کو ہم نے ایک قسم کا ذہنی مرض کہا ہے اس کی ایک نظیر ہم ان اقتباسات میں سے پیش کرنا چاہتے ہیں جو بدر کے زیر بحث مضمون میں صاحب مضمون نے مرزا غلام احمد قادیانی کے نقل کئے ہیں۔ عام بھائیوں کو اس سے اندازہ ہوگا کہ کیسے ہوائی قلعے بغیر کسی بنیاد کے فنکار حضرات تعمیر فرما دیتے ہیں۔

مرزا صاحب نے فرمایا:۔

"اللہ جل شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحب خاتم بنایا یعنی آپ کو افاضہ کمال کیلئے مہر دی جو کسی اور نبی کو ہرگز نہیں دی گئی۔ اسوجہ سے آپ کا نام خاتم النبیین ٹھیرا۔ یعنی آپکی پیروی کمالات نبوت بخشتی ہے اور آپ کی توجہ روحانی نبی تراش ہے اور یہ قوت قدسیہ کسی اور نبی کو نہیں ملی۔" (بحوالہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۹۷ حاشیہ)

پھر اس پر صاحب مضمون نے جو ریمارک فرمایا ہے اسے بھی دیکھ لیجئے:۔

"یہ ہے صداقت کی وہ آواز جس کو "انکار ختم نبوت" کا نام دے کر ۸۰ سال سے کفر کے فتووں میں دبانے کی ناکام کوشش کی گئی مگر اب خدا کے فضل و کرم سے وہ آواز دیوبند جیسے مخالف احمدیت مرکز سے بھی پورے زور سے بلند ہونے لگی ہے۔"

صاحب مضمون عوام الناس کو یہ فریب دینا چاہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد صاحب پر علماء نے کفر کا فتویٰ محض ایسی ہی غیر واضح اور مبہم عبارات کی بنیاد پر جڑا تھا ورنہ انھوں نے کبھی بھی اپنے نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ دروغ مبین ہے، ایک دو نہیں دسیوں عبارتیں متعدد علماء اپنی کتابوں میں مرزا صاحب کی تصنیفات سے نقل کر چکے ہیں جن میں دعوۂ نبوت صاف صاف ہے۔ اور ایک دعوۂ نبوت ہی کیا الوہ لاتعداد ایسی موشگافیاں جو اٹھائی جائیں نہ دھری جائیں۔

لیکن اسے چھوڑیئے۔ لطیفہ تو یہ ہے کہ حضرت مہتمم صاحب کی دو کتابوں میں درج شدہ نکات عالیہ ہی کو صاحب مضمون نے یہ معنی پہنا دیتے ہیں کہ مرکز دیوبند سے بہ آواز بلند احمدیت کی تائید ہونے لگی۔ حالانکہ واقعہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ حضرت مہتمم صاحب کی جن دو کتابوں سے مضمون میں اقتباسات دیئے گئے ہیں انھیں علمائے حق کے کسی بھی

حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ ہمیں یاد ہے کہ "آفتاب نبوت" کے بعض مندرجات پر ہم نے بھی تجلی میں احتجاج کیا تھا۔ یہ کتابیں پاکستان میں کسی ناشر نے چھاپ لی ہیں اور صاحب مضمون نے ان ہی کو سامنے رکھا ہے لیکن اولاً انھیں خود مہتمم صاحب کے صاحبزادے نے اپنے مکتبہ سے دیوبند ہی میں شائع کیا تھا۔ ان پر مختلف اہلِ علم کی طرف سے لے دے ہوئی اور اس کے نتیجے میں شاید حضرت مہتمم صاحب اور ان کے صاحبزادے نے بھی محسوس کر لیا کہ قلم نے کچھ گڑبڑ کر دی ہے چنانچہ انھیں تقریباً دفن ہی کر دیا گیا۔ آج یہاں ڈھونڈتے پھریئے ایک نسخہ بھی ہاتھ نہ آئے گا۔ حالانکہ یہ مقبول ہوتیں تو ناشران کی طباعت کا سلسلہ بند نہ فرما دیتے۔

واحد سچائی یہ ہے کہ ان کتابوں میں جو کچھ بھی لکھا گیا اس سے احمدیت کی تائید مقصود نہیں تھی حضرت مہتمم صاحب اور قادیانیت کی حمایت۔ یہ تو آنہونی ہے۔ تقریباً محال۔ مگر تصوف کا ذوق بہرحال ممدوح کو بھی ہے اور تصوف مزا ہی نہیں دیتا جب تک کچھ عجائبات و نوادرات اور اسرار و معارف کے تانے بانے نہ پھیلائے جائیں۔ نیت پر قطعاً حملہ نہیں۔ ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ ممدوح نہایت پاک باطن، نیک نفس، ستودہ صفات اور صحیح العقیدہ بزرگ ہیں۔ مگر ذوقِ تصوف غیر شعوری طور پر سیرِ باطن پر ابھارتا ہے اور اونچی فضاؤں میں پرواز کا شوق دلاتا ہے۔ اس شوق کی تکمیل احتیاط اور تحمل کے ساتھ ہو تو سبحان اللہ۔ شوق برا نہیں۔ بڑے بڑے اہلِ باطن اسی شوق نے پیدا کئے ہیں مگر جب شوق کا دریا زوروں سے ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے تو احتیاط و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور موتیوں کے ساتھ کوڑا کباڑ بھی سطح پر ابھر آتا ہے۔

خیر قادیانوں کے محترم مہدی موعود کے منقولہ بالا ارشادِ زریں کی طرف آئیے۔

یہ آپ نے جان ہی لیا کہ لفظ خاتم النبیین قرآن میں ایک ہی جگہ آیا ہے اور یہ بھی جان لیا کہ کس سیاق و سباق میں آیا ہے۔ جو لوگ قرآن کو واقعی سمجھنا چاہیں ان کے لئے تو گنجائش نہیں کہ امرِ واقعہ بیان کرنے والے اس سیدھے سادے لفظ کو بھول بھلیاں میں گھسیٹتے پھریں اور ردّے پر ردّے چڑھائے جائیں۔ لیکن جو حضرات نعوذ باللہ خدا کے منہ میں اپنی زبان ڈالنے کے درپے ہوں ان سے شاعری اور جدت طرازی کے سوا کیا امید ہو سکتی ہے۔

لیکن ہم بفضلہٖ تعالیٰ شاعری کے نقد سے بھی عاجز نہیں اس لئے اس میدان میں بھی ان کا تعاقب کر سکیں گے۔

لفظ خاتم کو صرف مرزا صاحب ہی نے نہیں ہمارے بعض علماء نے بھی نکاتِ بعیدہ کا مصدر و مبنیٰ بنانے کی کوشش کی ہے مگر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے سلسلے میں ہمیں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ زد کہاں کہاں پڑ رہی ہے لہذا کوئی بھی صاحب یہ تعریض نہ فرمائیں کہ فلاں عالم نے بھی تو خاتم کے تعلق سے یہ یہ کہا ہے۔ فلاں ابن فلاں کی کوئی بحث ہی علم و تحقیق کی بارگاہ میں نہیں۔

پھر سمجھانا اور ہوشیار کرنا چونکہ زیادہ تر عامۃ المسلمین ہی کو مقصود ہے اس لئے کلام شرح و بسط سے کریں گے۔ کتنے ہی امور اہلِ علم اور خواص کے لئے تو بدیہی ہوتے ہیں مگر بے چارے عوام کے لئے خفی اور مشکل۔ ان کی ذہنی اور علمی سطح کا لحاظ بہرحال ہمیں کرنا ہوگا۔

لفظ خاتم کی بحث

ایک بار مرزا صاحب کی منقولہ عبارت پھر پڑھ لیجئے اور ہماری معروضات کو بہ غور سنیئے۔

لفظ خاتم کے لغتِ عربی میں کیا کیا معنی آتے ہیں

اور کس کس موقعہ پر یا استعمال ہوتا ہے یہ بحث ہم بعد میں کریں گے پہلے تو ایک اور پہلو توجہ طلب ہے۔ یہ کہ جب کوئی لفظ کسی فقرے میں استعمال ہوا ہو تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس کے وہ تمام معانی لینے جائز ہوں جو لغت میں لکھدیئے گئے ہیں؟

مثال سے سمجھئے۔ بحث چونکہ لفظِ قرآنی سے ہو رہی ہے اس لئے ہم مثال بھی ہم قرآن ہی سے دینگے۔

سورۂ حجر میں اللہ تعالیٰ رسولؐ سے کہتا ہے:۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ۔	اور جھکا اپنے بازو ایمان والوں کے لئے۔

لفظِ جناح ملحوظ رہے۔ سورۂ شعراء میں بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے:۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ	اور اپنے بازو نیچے رکھ اپنا اتباع کرنیوالے مومنوں کیلئے۔

یہ تو آخری پیغمبرؐ سے خطاب تھا۔ حضرت موسیٰؑ سے خطاب کرتے ہوئے بھی اللہ نے فرمایا تھا:۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ (طٰہٰ)	اور ملا اپنا ہاتھ اپنی بغل سے۔

اور فرمایا تھا:۔

وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ۔ (قصص)	اور ملالے اپنی طرف اپنا بازو خوف سے۔

⁂ ⁂ ⁂

جناح کے معنی کسی بھی عربی لغت میں دیکھ لیجئے متعدد آتے ہیں۔ ہاتھ۔ پہلو۔ بغل۔ پناہ۔ کنارہ۔ اور پرندوں کے بازو جنھیں اردو میں ڈینے کہتے ہیں۔ اس آخری معنی کا ثبوت خود قرآن سے لے لیجیے:۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ (انعام)	زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور دو بازوؤں سے اڑنے والا ہر پرندہ تمھاری ہی طرح ایک امت ہے۔

جناحین لفظ جناح ہی کا تثنیہ ہے۔ اضافت کی وجہ سے نون حذف ہوگیا۔

اب اہلِ فہم بتائیں کیا یہ ممکن ہے کہ ان میں سے ہر آیت میں لفظ جناح سے ہر وہ معنی لینے جائز ہوں جو لغت میں ملتے ہیں۔ مثلاً کیا یہ جائز ہے کہ ایک شخص یوں کہے کہ جناح چونکہ پرندوں کے پردار بازوؤں کو بھی کہتے ہیں اس لئے ثابت ہوا کہ رسول اللہ اور حضرت موسیٰؑ کو بھی اللہ نے ایسے پردار بازو عطا کئے تھے جن سے وہ پرندوں کی طرح اڑ سکیں اور درختوں کی شاخ شاخ پر پھدک سکیں۔ ہمارا خیال ہے ایسا کہنے والے کو آپ دیوانہ قرار دیں گے۔

یہی نہیں۔ ان آیات میں پہلی دو آیتیں ایسی ہیں جن میں یہ بھی ممکن نہیں کہ انسانی بازو مراد لئے جائیں۔ یہ خطاب ہے رسولؐ سے اور اس خطاب کا مطلب مسلّمہ طور پر یہ ہے کہ مومنین کے ساتھ شفقت و نرمی کا برتاؤ کیجئے۔ بازو کا اطلاق جس حصۂ جسم پر ہوتا ہے اس کے جھکانے اور اٹھانے کی مطلق کوئی بحث ان آیتوں میں نہیں۔

اور اگلی دو آیتوں میں شفقت و نرمی کے بجائے واقعۃً اعضائے جسمانی مراد ہیں۔ پہلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اے موسیٰ اپنے ہاتھ اپنی بغل دے لیجئے کہ وہ سفید ہو کر نکلیں۔ اور دوسری آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اپنے دونوں بازو بھینچ لو۔ ایک دوسرے سے ملالو۔ خوف کا ازالہ ہوجائے گا۔

ایک ہی لفظ ہے مگر اربابِ فہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر جگہ اس کا الگ مفہوم متعین ہے۔ لغت کے حوالے سے اگر آپ کوئی سا بھی مطلب لے لینا جائز تصور کریں گے تو آیات کھلونا بن جائیں گی اور مفہوم خبط ہوجائے گا۔

اسی لفظ کی چند مثالیں عربی بول چال سے لیجئے۔ کہا جاتا ہے:۔

رکبوا جناحی الطائر	لوگ اپنے وطن سے چھٹ گئے۔

حالانکہ لفظی ترجمہ اس کا یہ ہے کہ لوگ پرندے کے بازوؤں پر سوار ہوگئے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے:۔

ترکب فلان جناحی النعامۃ ۔ فلاں شخص نے معاملے میں اس طرح جلد بازی کی کہ گویا عجلت کی حالانکہ لفظی معنی اس کے یہ ہیں کہ فلاں شخص شتر مرغ کے

بازوؤں پر سوار ہو گیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے:۔

زیدٌ مقصوص الجناح — زید بے بس ہے۔

حالانکہ لفظی ترجمہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ زید کے بازو پر قینچ ہو گئے۔

کیا اتنی مثالیں یہ سمجھنے کے لئے کافی نہیں کہ کوئی بھی لفظ اپنے سیاق وسباق اور محاورے کے اعتبار سے جو معنی کسی کلام میں دے رہا ہو اس کے علاوہ کوئی معنی ومفہوم لینا درست نہیں خواہ لغتاً اور بھی معانی آتے ہوں۔

ایک دو اُردو مثالیں :۔

آپ کہتے ہیں :۔

"کل وہ مردود مجھے مل گیا تھا میں نے اچھی طرح مزاج پرسی کی۔"

"مزاج پرسی" کے معنی عیادت اور خیریت دریافت کرنے کے آتے ہیں۔ لیکن کیا اُس شخص کو آپ احمق نہیں کہیں گے جو اس فقرے سے یہ سمجھ بیٹھے کہ آپ نے فلاں مردود کی عیادت فرمائی تھی۔

آپ کہتے ہیں:۔

"زید بڑا زہر اُگلتا ہے۔"

زہر لغت میں اُس مہلک شئے کو کہتے ہیں جو مار ڈالے۔ تو کیا اس فقرے سے یہ نکتہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زید سانپ کی نسل سے ہے اور اس کے خون کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو اس میں زہریلے اجزاء یقیناً نکلیں گے۔

اس طرح کی ہزار مثالیں آپ بلا تامل سوچ سکتے ہیں۔

اس تفہیم وتوضیح کا حاصل بھی اب دیکھ لیجئے :۔

قرآن نے یہ فرمایا کہ محمدؐ خاتم النبیین ہیں محلِ استعمال اور اسلوبِ کلام نے متعین کر دیا کہ یہ الفاظ صرف یہ آگاہی دینے کے لئے استعمال کئے گئے کہ محمدؐ آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کے جو فیصلے کر جائیں گے وہ آخری اور حتمی ہوں گے۔

بس۔ اس سادہ اور واضح اور قطعی مفہوم ومراد کے علاوہ مطلق گنجائش اس بات کی نہیں ہے کہ لفظ خاتم کے لغوی معنی تلاش کئے جائیں اور ان کے متضمنات کو حضورؐ پر چسپاں کیا جائے۔

حدیث پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ خود حضورؐ نے لفظ خاتم سے دور دراز اور غیر متعلق نکات اخذ نہیں کئے بلکہ اسی مفہوم تک محدود رکھا جو ظاہر و باہر بھی ہے اور سادہ وصاف بھی۔ مثلاً آپ نے فرمایا:۔

انا العاقبُ والعاقب — میں عاقب ہوں اور عاقب
الذی لیس بعدہ نبیٌّ۔ — وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ آئے۔
(بخاری ومسلم)

یا فرمایا:۔

انا محمدٌ واحمدُ — میں محمد ہوں اور احمد ہوں
والمقفّی (مسلم) — بعد میں آنے والا ہوں۔

اب یہ بھی سوچئے۔ عاقب کے ایک معنی لغت میں نائب کے بھی آتے ہیں۔ نائب کا درجہ اُس ہستی سے کم ہوتا ہے جس کی نیابت اختیار کی جائے۔ تو کیا یہ منطق بھی جائز ہو گی کہ لغتاً عاقب نائب کو بھی کہتے ہیں لہٰذا حضورؐ کا درجہ پچھلے انبیاء سے کم تھا۔

اور مقفّی کے ایک معنی قافیہ بند کے بھی ہیں۔ تقفیۃ الکلام مر قافیہ بندی کو کہا جاتا ہے۔ تو کیا یہ جائز ہے کہ یہاں یہی معنی لے کر حضورؐ کو معاذ اللہ قافیہ بند اور شاعر کہا جائے۔

نہیں ہزار بار نہیں۔ لفظ کو اس کے سیاق وسباق سے نہیں اکھاڑا جا سکتا اور لغت کے بل پر کلام کی تحریف نہیں کی جا سکتی۔ ٹھیک اسی طرح لفظ خاتم کا معاملہ ہے کہ لغت میں اس کے چاہے کتنے ہی اور کچھ بھی معانی آتے ہوں مگر محلِ استعمال نے متعین کر دیا کہ یہ اسے سلسلۂ انبیاء کے اختتام کے سادہ مفہوم میں بولا گیا ہے لہٰذا اور کسی معنی کی بحث نہیں اٹھے گی۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ اصلاً وہ مونگانی ہے

لایعنی اور غیر معقول ہے جو لفظ خاتم کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اور ایک مستقل لفظ کی حیثیت دے کر لغت کے سہارے کی جاتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھی دکھائیں گے کہ اس نامعقول حرکت کا ارتکاب کر کے بھی وہ دعوے بے بنیاد ہی رہتے ہیں جو نکتہ سنج حضرات کے علم کلام میں بکھرے ہوئے ہیں۔

آئیے لغت بھی دیکھئے۔

لغت میں ختم کے متعدد معنی آتے ہیں خَتَمَ۔ یَخْتِمُ (باب ضَرَبَ یَضْرِبُ سے) کام سے فارغ ہو جانا۔ مہر لگانا۔ برتن کا منہ بند کرنا۔ بے سمجھ کر دینا۔

اسی سے ہے خَاتَم انگوٹھی کو بھی کہتے ہیں۔ مہر کو بھی۔ انجام کو بھی۔ پیروں پر تھوڑی سی سفیدی ہو تو اسے بھی۔ کسی بھی گدی کے درمیان جو گڑھا سا ہوتا ہے اسے بھی اور آخری شخص کو بھی۔

نکتہ سنج حضرات نے جن میں مرزا صاحب بھی شامل ہیں بڑے زور شور سے اسے مہر کے معنی میں لیا (جیسا کہ آپ منقولہ اقتباس میں دیکھ رہے ہیں) حالانکہ جب تو محاورہ استعمال اور محاورۂ زبان سے ہٹ کر لغت کی بات آ گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ اسی ایک معنی کو پکڑ لیا جائے۔ باقی بھی تو ہیں۔ کیوں نہ ہر ایک ہی کا جواز مانا جائے۔

پھر ستم ظریفی یہ کہ خاتم کا اطلاق جس خاص مہر پر ہوتا ہے اسے بھی گول کر کے وہ عام مفہوم لے لیا گیا جو اردو میں اس لفظ سے لیا جاتا ہے۔ اردو میں آپ لفظ مہر "اسٹامپ" کے معنی میں بولتے ہیں۔ کھلے خط پر نام یا پتے کی مہریں لگائی جاتی ہیں۔ ڈاکخانے والے کارڈ یا لفافوں کے ٹکٹوں پر مہریں لگاتے ہیں۔ سرکاری کاغذات پر متعلقہ محکموں کی مہریں لگی ہوتی ہیں۔ ان سب کو ہی یکساں طور پر مہر بولا جاتا ہے لیکن عربی کا خاتم اتنا وسیع المصداق نہیں۔ اس کا اطلاق صرف ان مہروں پر ہوتا ہے جو کسی ملفوف یا تھیلے یا ظرف پر اس لئے لگائی جائیں کہ اب اندر کی چیز باہر نہ آئے اور باہر کی چیز اندر نہ جائے۔ جیسے بیمہ پر یا مال گاڑی کے سامان والے ڈبوں کے قفل پر یا ڈاک جانے کے ان تھیلوں پر جن میں ڈاک منتقل کی جاتی ہے۔

اس سے بھی بڑی ستم ظریفی یہ کہ اللہ تعالیٰ لفظ خاتم اگر مہر ہی کے معنی میں استعمال کر رہا ہے تب بھی اس طرح کہ خود حضورؐ کو مہر قرار دے رہا ہے نہ کہ مہر لگانے والا صاحب الخاتم کہا ہوتا تب تو یہ معنی ہو سکتے تھے کہ اللہ نے حضورؐ کو کوئی مہر عطا کی ہے جسے آپ لگا لگا کر بقول مرزا صاحب "افاضۂ کمال" کیا کریں گے۔ مگر یہاں تو صرف خاتم فرمایا گیا یعنی آپ نبیوں کی مہر ہیں۔ مہر اور مہر لگانے والا دو الگ الگ وجود ہوتے ہیں۔ مہر ایک آلہ ہے جو خود نہیں کام کرتا بلکہ زندہ ہاتھ اس سے کام لیتے ہیں۔

اس بالکل واضح اور مشاہد صورتِ حال کے باوجود اگر مرزا صاحب یہ فرماتے ہیں کہ قرآن حضورؐ کو صاحب خاتم (مہر لگانے والا) کہہ رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ اللہ نے آپ کو افاضۂ کمال کے لئے مہر دی تو اے آنکھ والو اس سے بڑی غلط بیانی اور ڈھٹائی کیا ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ واضح مثال قرآن کو بگاڑنے کی کیا ہو گی۔ یہ تو دن ہاڑے آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔

اب آپ سوچ لیجئے کہ ایک کذب صریح اور دروغ مبین کو اصل و بنیاد بنا کر جو لغت لغنی کی گردان کی گئی ہے وہ کیا قیمت رکھ سکتی ہے۔

قرآن وہ کتاب ہے جو زیر زبر اور شوشے تک کی تبدیلی کے بغیر دنیا کے چپے چپے پر دستیاب ہے۔ کھولو اور سورۂ احزاب کی خاتم النبیین والی آیت کو اعلیٰ سے اعلیٰ خوردبین لگا کر دیکھو۔ اگر ہم نے ایک حرف بھی مبالغہ آمیز یا خلاف واقعہ کہا ہو تو پھانسی تک کی سزا منظور۔ اس آیت کا نمبر ہے ۴۰۔ سورۃ کے اعتبار سے رکوع ہے پانچواں۔ پارہ ہے وَمَنْ یَّقْنُتْ اور پارے کے اعتبار سے

رکوع ہے دوسرا۔

اتنا تفصیلی حوالہ ہم نے اس لئے دیا کہ ہمارے کسی بھی کم سے کم تعلیم یافتہ بھائی کو آیت کو تلاش کرنے اور اپنی آنکھیں استعمال کرنے میں دشواری نہ ہو۔ اوندھے سیدھے نکتوں اور چرب زبانیوں میں زیادہ تر کم علم و کم فہم ہی آتے ہیں۔ شاعری کو حقیقت اور توہمات کو اسرار و معارف باور کر لینے کا اندیشہ ان کے ہی حق میں زیادہ ہے لہذا وہ کوئی بھی ترجمے والا قرآن اٹھا کر سورۂ احزاب کا مطالعہ کریں اور اندازہ فرمائیں کہ قادیانیوں کے مزعومہ مہدی موعود کس بے تکلفی سے دن کی روشنی میں قرآن پر اضافے فرما رہے ہیں۔

خلاف قاعدہ بات تو اصلاً یہی تھی کہ خاتم کو لغت کی خراد پر چڑھا دیا جائے جب کہ آیت صاف و سادہ منطوق کا اعلان کر رہی ہے۔ مگر اس خلاف قاعدہ سے دو قدم آگے بڑھ کر خاتَم کو صاحبِ خاتَم یعنی مہر کو مہر والا بنا دینا ایک سنگین جرم ہے جس کا ارتکاب اگر عامر عثمانی کا باپ دادا یا چچا ماموں بھی کرے تو اس کی سنگینی میں فرق نہیں آتا۔ یہ ہم نے اس لئے کہا کہ بعض محققین کا خیال نقل کرتے ہوئے ہمارے عمِ محترم علامہ شبیر احمد عثمانی نوّر اللہ مرقدہٗ نے یہ فقرہ بھی حوالۂ قلم فرما دیا ہے۔

"جن کو نبوّت ملی ہے آپ ہی کی مُہر لگ کر ملی ہے۔"

یہ خیال چاہے صرف بعض محققین کا ہو یا عمِ محترم بھی اس سے متفق ہو گئے ہوں ہم ہر حال میں اس سے اختلاف کریں گے اور شد و مد سے کہیں گے کہ قرآن اس سے بری الذمہ ہے۔

حضرت مہتمم صاحب نے حضورؐ کو "نبوت بخش" کہا تھا۔ مرزا صاحب "نبی تراش" کہہ رہے ہیں۔ حرفوں کا فرق ہے معنی کا نہیں۔ ایسی چیزیں پڑھ کر یہ تحیر کم ہو جاتا ہے کہ بھلا نصرانیوں کے اہلِ عقل نے بھی آخر کس طرح یہ مان لیا کہ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں۔ ہر بات مانی جا سکتی ہے جب آدمی حقائق سے کٹ کر جذبات کی فضا میں اڑانیں بھرتا چلا جائے اور جذبات کی کرشمہ سازی کو عقل و حکمت تصور کرنے لگے۔

بُت پوجنے والے بھی کھوکھلا سر تو نہیں رکھتے۔ ان میں بھی عام اعتبار سے عقلاء پائے گئے ہیں اور پائے جا رہے ہیں۔ بڑے بڑے علم و فضل والے۔ عابد و مرتاض۔ نیک دل اور نیک طینت۔ مگر جب فکر و دراست کی سمت ہی غلط ہو گئی تو بڑے سے بڑا دماغ بھی منزلِ حق و ہدایت پر نہیں پہنچ سکتا اور توہمات و مفروضات کے سوا اس کے کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا۔

آخر میں ایک اور حدیث کا خیال آ گیا۔ صحابیِ رسول حضرت جابر بن سَمُرہؓ حضورؐ کا حلیہ بیان کرتے ہوئے چہرۂ مبارک کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

کان مثل الشمس	سورج اور چاند کی
والقمر وکان مستدیرا	مانند تھا اور گول
(مسلم)	تھا۔

کیا کوئی بھی صحیح الدماغ آدمی اس تشبیہ سے یہ مطلب نکال سکتا ہے کہ حضورؐ کے چہرے میں وہ تمام اوصاف و خواص موجود تھے جو طبعی اعتبار سے سورج اور چاند میں پائے جاتے ہیں اور گولائی کی جو بات کہی گئی کیا اس کا یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ کا چہرہ اسی طرح دائرۂ پرکار کی مانند گول تھا جس طرح سورج اور چاند گول نظر آتے ہیں۔

حالانکہ لفظوں کا کھیل کھیلنے والے بزرگوں کے لئے تو کافی قرینہ موجود ہے کہ چہرۂ انور کے لئے پرکار والی گولائی کا نکتہ نکال بیٹھیں کیونکہ مستدیر کا لفظ شمس و قمر کے ساتھ بولا گیا ہے اور شمس و قمر اک دم گول ہی نظر آتے ہیں۔

اگر اس طرح کی نکتہ سنجیاں کسی متوازن دماغ کیلئے ممکن نہیں تو آخر خاتَم کے لفظ سے اس طرح کے نکتے نکالنا ذہنی توازن کی علامت کیسے ہو سکتا ہے۔ چہرے کو گول ان چہروں کے مقابلے میں کہا گیا ہے جو لمبوترے ہوتے ہیں وضاحت کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کہ ہر شخص سیاق و سباق میں خود ہی صحیح مطلب سمجھ لے گا اور ایسے موقع پر پرکار لیکر نہیں دوڑے گا۔ شمس و قمر حسن و رعنائی کے تعلق سے کہا گیا اور یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ تشبیہ فقط حسن و

ضیا ہیں سے جسامت یا جنس و نوع یا معمول و وظائف میں نہیں۔ وضاحت کیوں کرتے جب کہ محاورۃً یہ ظاہر باہر ہی تھا۔ اسی طرح اللہ نے خاتم النبیین فرما کر بس یہ بتایا کہ حضورؐ آخری نبی ہیں۔ مزید نبیوں کی آمد بند۔ خاتم سے مراد نہ انگوٹھی تھی نہ مُہر نہ کوئی اور چیز بلکہ جس طرح خاتم القوم آخری فردِ قوم کو کہتے ہیں اور اس فرد کے دیگر اوصاف و خصائل سے کلام کا تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہاں لفظ خاتم کا تعلق نہ افاضۂ کمال سے تھا نہ نبی بخشی اور نبی تراشی سے نہ کسی اور خاص نکتے سے۔ آخری نبی ہونے کی نشاندہی فرمائی گئی تھی بس۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ مگر اللہ کے بعض بندے ضرورت سے زیادہ عاقل بالغ ہونے کا مظاہرہ کرنے لگیں اور خلقِ خدا پر اپنی زرف نگاہی کا رعب ڈالنا ضروری سمجھیں تو کوئی قانون فی الحال ایسا نہیں جو ان کی زبان اور قلم کو پکڑ سکے۔ ہاں ایک عدالت ایسی آئے گی جہاں محاسبہ ہوگا۔ آیاتِ آلٰہیہ فریاد کریں گی اور قاضیٔ مطلق بے لاگ انصاف فرمائے گا۔

لگے ہاتھوں ایک اور قباحت بھی دیکھ لیجئے جو خاتم کو یہاں مُہر کے معنی میں لینے سے پیدا ہوتی ہے۔

لفافے میں نوٹ یا تھیلے میں ڈاک یا ڈبے میں سونا چاندی بھر کے اسے سر بمہر کر دیا جائے تو یہ کوئی بھی نہ کہے گا کہ جو کچھ اندر ہے مُہر بھی اسی کی جنس سے ہے۔ مُہر اپنی الگ نوعیت رکھتی ہے اور نوٹ، سونا چاندی اور دیگر اشیاء الگ نوعیتوں کی مالک ہیں۔ مُہر کو اُردو استعمال کے مطابق اگر وسیع تر معنی میں لے لیا جائے تب بھی اس حقیقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لیٹر پیڈ پر، کارڈ پر، حکمنامے پر، محضر پر آپ مُہر لگائیں تو مُہر سے جدا کاغذ نہ وجوداً و جنساً میں تغیر واقع نہ ہوگا۔ یہ نہ کہیں گے کہ مُہر بھی کاغذ ہی کا نام ہے۔

اس امرِ واقعہ کے لحاظ سے تو حضورؐ کی نبوت ہی کا انکار ہو جائے گا اگر یہ کہیں کہ آپ نبیوں کی مُہر ہیں۔ مُہر کے کیا معنی۔ آپ تو خود نبی ہیں۔ نبی بھی ایسے ویسے نہیں سب سے افضل اور اکمل۔ پھر یہ کیا بات کہ آخری نبی کہنے کے بجائے آپ انھیں نبیوں کی مُہر کہنے لگیں۔ یہ تو ایک دانستہ یا نادانستہ ترکیب ہے آپ کی نبوت سے گریز کی۔ مُہر اگر کسی شے پر لگی ہے تو وہ ہے جنسِ نبوت۔ اس مُہر کے ذریعہ اللہ نے یہ امکان ختم کر دیا کہ اور کوئی نبی اس مقفل اور سر بمہر عمارت میں داخل ہو سکے۔ حضورؐ بھی اسی جنسِ نبوت سے متصف اور اسی کے ایک فرد ہیں۔ لہٰذا آپ کی حیثیت اُس سامان کی ہے جسے محفوظ کر کے مُہر لگائی گئی ہے نہ کہ مُہر کی۔ مُہر لگانے والا اللہ ہے۔ عمارت ہے یہ خاکدانِ ہستی۔ مُہر ہے اللہ کا ارادہ اور فیصلہ۔ یہ اتنی واضح باتیں ہیں کہ ہر ہوش و حواس رکھنے والا آدمی انھیں بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ ان میں کوئی اینچ پینچ نہیں۔ دو اور دو چار کی طرح مسلّم۔ خاتم النبیین کو فقط "آخری نبی" کے معنی میں لینے کے بجائے جن لوگوں نے لغت کی آڑ لے کر مُہر کا شوشہ نکالا وہ اس کے مضمرات و نتائج کا ادراک نہ کر سکے۔ پھر ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر جنھوں نے خاتم کو صاحب الخاتم بنا دیا اور اپنے کارخانۂ وہم و خیال میں ایک مُہر تیار کر کے یہ اعلان کر دیا کہ یہ مُہر اللہ نے رسول اللہؐ کو افاضۂ کمال اور نبی سازی کے لئے دی ہے ان کو تو سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ دین کو وہ شعبدہ بازی کی سطح پر لے آئے ہیں۔ جیسے شعبدہ باز جیب میں انڈا ڈال کر کبوتر برآمد کرتا ہے اسی طرح یہ لوگ آیات و احادیث سے تماشے بازی کا کام لے رہے ہیں۔ پناہ خدایا۔ کروڑ بار تیری پناہ۔

یہ مضمون کاتب کو دیا جا چکا تھا کہ "مکاتیبِ طیب" کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ یہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے

بعض خطوط کا مجموعہ ہے۔ لیجئے اس میں بھی وہ سب کچھ مل گیا ہے جس سے ہمارے اس معروضے کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت مہتمم صاحب ہرگز ہرگز قادیانیت و احمدیت کے حامیوں میں نہیں ہیں بلکہ اس فرقے کے بارے میں ان کی وہی رائے ہے جو دوسرے علمائے امت کی ہے ان کے تین خط لفظ بہ لفظ نقل ہیں:-

مکتوب (۶)

حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم نے ۱۶ر نومبر ۱۹۶۳ء کو مکہ مسجد حیدر آباد میں یوم افضل الانبیاء کے موقعہ پر ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے قرآن و حدیث کی روشنی میں مسئلہ ختم نبوت کے اساسی اور بنیادی عقیدے کو واضح کیا۔ حیدر آباد کی قادیانی جماعت نے اس تقریر سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی کی اور پمفلٹ شائع کرکے عوام کو یہ باور کرانا چاہا کہ موصوف نے افضل الانبیاء کے جلسے کو مخاطب کرتے ہوئے ختم نبوت کے مسئلہ پر جماعت احمدی کے مسلک کی تائید اور ترجمانی کی ہے۔

حیدر آباد کے بعض مخلصین نے حضرت مہتمم صاحب کو اس بے بنیاد پروپیگنڈہ کی اطلاع دیتے ہوئے حضرت سے درخواست کی کہ آپ جلد اپنا کوئی تردیدی بیان مرحمت فرمائیں کہ ہم عقیدت مندوں کے اضطراب اور بے چینی کو دور فرمائیں۔ ذیل کے خط میں حضرت مہتمم صاحب کی تردید ملاحظہ ہو۔" (مرتب)

آج حیدر آباد (آندھرا) سے آئے ہوئے بعض دوستوں کے خطوط سے علم ہوا کہ حیدر آباد کی قادیانی جماعت نے احقر کی تقریر سے جو ۱۶ر نومبر ۱۹۶۳ء کو مکہ مسجد حیدر آباد میں یوم افضل الانبیاء کے موقعہ پر ہوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی کی ہے اس کی تصدیق قادیانیوں کے ایک مطبوعہ پمفلٹ سے ہوئی جو محمد عمر نامی مبلغ قادیانی جماعت کے نام سے بعنوان "مسلمانانِ حیدر آباد و یادگیر کے لئے ایک لمحۂ فکریہ" غیر مورخ شائع ہوا ہے۔ اس پمفلٹ میں احقر کی اس تقریر کے بارے میں انتہائی تحریف سے کام لیا گیا ہے۔

(۱) بعض جملے افترا پردازی سے اس میں خود اضافہ کئے گئے ہیں جیسے "لہذا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل النبیین کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ آپ کو دیگر انبیاء کی نسبت بعض باتوں میں فضیلت عطا ہوئی ہے صفحہ ۲"۔ یہ کذب محض ہے نہ میری تقریر کا یہ کوئی جملہ ہے نہ میرا یہ عقیدہ ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام سے علی الاطلاق افضل اور کمالاتِ نبوت میں کلیۃً فائق ہیں جس کا مدلل دعوے تمام انبیاء نے شبِ معراج میں کیا ہے۔

(۲) بعض جملوں کے مطلب بیان کرنے میں تحریف کی گئی ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں سب سے اول بھی ہوں اور سب سے آخر بھی ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء آپ کے متبع ہیں لیکن آپ کسی کے متبع نہیں۔

اولیت اور آخریت کا یہ مطلب میری طرف منسوب کرنا محض افترا پردازی اور دھوکہ دہی ہے۔ نہ یہ میرا جملہ ہے نہ میرا مفہوم نہ آخریت کے یہ معنی ہو سکتے ہیں۔ آخریت کے معنی یہ ہیں کہ آپ سب انبیاء کے آخر میں تشریف لائے اور آخری پیغمبر ہیں آپ کے بعد کوئی نبی کسی قسم کا آنے والا نہیں۔ میرا اور میرے بزرگوں کا یہی عقیدہ ہے ہمارے نزدیک جو شخص حضورؐ کے بعد کسی نبی کی بعثت مانتا ہے یا امتِ محمدیہ میں حضورؐ کے بعد وحی کا سلسلہ غیر مختتم سمجھتا ہے وہ دائرۂ اسلام سے خارج، مرتد اور کافر ہے۔ آپؐ ذاتی طور پر بھی خاتم النبیین ہیں کہ آپ تمام کمالات نبوت کا منتہی ہیں اور جس نبی میں نبوت کا جو کمال بھی آیا ہے وہ آپؐ کے فیضان

سے آیا ہے اور زمانی طور پر بھی خاتم النبیین ہیں کہ آپ ہی سب انبیاء کے بعد میں مبعوث ہوئے اور آپ کے بعد کوئی نبی، کوئی شریعت، کوئی آسمانی کتاب اور کوئی وحی آنے والی نہیں۔ میں نے صاف لفظوں میں بیان کیا تھا کہ ختم نبوت کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں جس کی تشریح یہ کی تھی کہ نبوت حضور ؐ کے ذات اقدس پر آکر تمام مراتب کے ساتھ ختم ہوگئی اور کوئی درجہ نبوت کا باقی نہیں رہا کہ اس کو دنیا میں لانے کے لئے کسی نبی کو مبعوث کیا جائے یہی کامل اور آخری نبوت قیامت تک کے لئے کافی ہوگئی ہے اور تا ابد باقی رہے گی جیسے سورج نکلنے کے بعد نور کا کوئی درجہ باقی نہیں رہتا کہ کسی ستارے کی ضرورت پڑے ایسے ہی حضور ؐ کے بعد کسی ستارۂ نبوت کی ضرورت نہیں رہی۔

(۳) بعض نتائج کذب بیانی کے ساتھ میری تقریر سے اخذ کر کے میری طرف منسوب کئے گئے۔ جیسے :-

"اب آئندہ کوئی ایسا نبی نہیں آئے گا جو ایک ایسے مرتبے کا حامل ہو جو آنحضرت صلعم کو حاصل ہوا ہے۔"

یہ جملہ نہ میری تقریر کا ہے نہ اس کے مفہوم کو میں اسلامی مفہوم جانتا ہوں جب کہ ہم لوگ اس کے قائل اور مدعی ہیں کہ حضور ؐ کے بعد کوئی نبی ہی سرے سے مبعوث ہونے والا نہیں تو ایسے ویسے کا کیا سوال یہ نتیجہ میرے کسی مفہوم کی طرف منسوب کرنا محض کذب بیانی اور افترا پردازی ہے۔ میں نے اسی لئے خاتم النبیین ؐ کی تحقیق کرتے ہوئے اس کے نیچے اولیت کے ساتھ آخریت کا درجہ بھی صاف لفظوں میں بیان کر دیا تھا اور عرض کیا کہ آپ ؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اس لئے خاتمیت کو محض منتہائے کمالات لیکر آپ کی آخریت کے مقام کو حذف کر جانا یا اس کی غلط تشریح کرنا کہ نبوت بایں معنیٰ اب بھی باقی ہے کہ حضور ؐ کے بعد نبی مبعوث ہو سکتا ہے زیادہ سے زیادہ وہ آپ کا متبع رہے گا۔ محض افترا پردازی اور دھوکہ دہی ہے۔ ہم اس شخص کو کافر اور خارج از اسلام سمجھتے ہیں جو حضور ؐ کے بعد کسی نبی کی بعثت کا قائل ہو خواہ وہ مستقل خواہ تابع غیر مستقل یا اس امت میں وحی کا سلسلہ غیر مختتم جانتا ہے اور کہتا ہے کہ نبوت کا دروازہ حضور ؐ کے بعد بند نہیں ہوا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں بند نہیں تھا اور وحی کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا اور امت موسوی میں نبی مبعوث ہوتے رہے تھے۔ میری تقریر کے کسی جملے کو قادیانی جماعت کے موقف کی تائید یا ترجمانی کہنا انتہائی بددیانتی اور دیدہ دلیری ہے اس لئے کتابچہ موسومہ (مسلمانان حیدرآباد و یادگیر کے لئے ایک لمحۂ فکریہ) کو میں ایک گمراہ کن تحریر سمجھتا ہوں نہ اسے میری تقریر کی تشریح سمجھی جائے نہ ترجمانی۔

والسلام

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۸ رجب ۱۳۸۳ھ

مکتوب (۲۰)

ذیل کا خط جناب ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب قادری (آندھرا پردیس) کے جواب میں ہے ڈاکٹر موصوف نے اپنے ایک خط کے ذریعہ حضرت مہتمم صاحب کو بتایا کہ ہمارے علاقے کے بعض مسلم نوجوان جو اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں، ان کا کہنا ہے کہ قادیانی فرقہ اسلام کا ناجی فرقہ ہے اور انھیں کے علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج اسلام یوروپین ممالک میں پھیلتا جا رہا ہے۔ مگر افسوس کہ ہندوستان کے اکثر علماء انھیں کافر کہتے ہیں موصوف کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تحریر سے ان کا مقصد مسئلے کی شرعی نوعیت معلوم کرنا تھی ـــ درج ذیل خط ان تنقیحات

پر مشتمل ہے جس سے قادیانیوں کے کفر و ایمان
کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔
(شفیق احمد اعظمی)

محترم المقام زید مجدکم۔ سلام مسنون۔
گرامی نامہ ملا جس میں آپ نے اپنے علاقہ کے بعض اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ کے بارے میں ان کے کچھ خیالات دین کے بارے میں تحریر فرمائے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا انگریزی یا کسی زبان کے سیکھنے سے یہ حق ہو سکتا ہے کہ جس فن یا علم سے وہ ناواقف ہو اس میں رائے زنی شروع کر دے۔

عامۃً تمام علماء عرب و عجم نے قادیانیوں کو مرتد اور خارج از اسلام کہا ہے کیونکہ وہ ضروریاتِ دین مثلاً نبوت وغیرہ عقائد کے منکر ہیں۔

یہ جھوٹا پروپیگنڈہ ہے کہ انھوں نے یورپ میں اسلام پھیلایا۔ آج یورپ کے لوگ خود ان سے بیزار و بدظن ہو رہے ہیں۔ لندن میں کئی مسجدیں ان سے خالی کرائی جا چکی ہیں۔ یہ جماعت البتہ پروپیگنڈا اسٹ ضرور ہے اور اس کا طریقہ تبلیغ عیسائیت سے ماخوذ ہے اسی انداز پر یہ لوگوں کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نوجوانوں کو شکوہ ہے کہ اہلِ سنت نے قادیانیوں کی تکفیر کر دی لیکن حیرت ہے کہ قادیانیوں سے انھوں نے یہ شکوہ نہیں کیا کہ انھوں نے اپنے سوا مسلمانانِ عالم کی تکفیر کر دی درانحالیکہ قادیانی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں۔ ان کی تکفیر تو دلوں میں کھٹکے اور اہلسنت جو کروڑوں کی تعداد میں ہیں ان کی تکفیر پر شکوہ نہ کیا جائے۔ بہرحال وجوہ تکفیر اہلِ سنت کے یہاں تو یہ ہیں کہ یہ لوگ ضروریاتِ دین کے منکر ہیں اور ان کے یہاں کروڑوں اہلِ سنت کی تکفیر کی بنیاد یہ ہے کہ وہ مرزا غلام احمد کے قائل نہیں ہیں۔

ان کے عقائد پر پورا لٹریچر مطبوعہ موجود ہے اسے منگایا اور دیکھا جائے۔ اس گروہ نے اسلام کی بنیاد جو ختم نبوت ہے اکھاڑ پھینکنے کی پوری پوری سعی کی ہے اور کر رہی ہے حیرت ہے کہ جس نے اسلام ہی کو خطرے میں ڈال دیا ہے وہ قابلِ شکوہ نہ ہو اور جو لوگ ان مخربین اسلام کو یہ کہدیں کہ وہ اسلام سے خارج ہیں قابلِ شکوہ و سرزنش ہو جائیں۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے اور اس شکوہ پر نظرِ ثانی فرمائیں گے۔ والسلام۔

محمد طیب۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۶/۲/۸۸ء

مکتوب (۳۷)

محمد سعید صاحب جہلمی — (مغربی پاکستان) نے حضرت مہتمم صاحب کو اپنے حالات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ — ہمارے دادا صاحب (جو آج سے تقریباً چالیس سال پہلے وفات پا چکے ہیں) جماعت مرزائیت سے تعلق رکھتے تھے مگر ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اب جب ہمیں شادی یا اس طرح کی تقریبات میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو مرزائیت کی دُم ہمارے ساتھ لگا دی جاتی ہے۔ ہم نے مولانا عبداللطیف صاحب (امام مسجد حنفیہ) سے اپنا سارا قصہ بیان کیا۔ مولانا نے تحریری طور پر تصدیق کی کہ ہمارا اس جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔ اب آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ ہمیں مشورہ دیں کہ ہم اس ناکردہ گناہ کی سزا سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں۔ حضرت مہتمم صاحب نے جواب میں درج ذیل خط تحریر فرمایا تھا۔ (مرتب)

محترم المقام زید مجدکم۔ سلام مسنون، نیاز مقرون۔
گرامی نامہ سے حالات کا علم ہوا، قادیانی جماعت کو اگر آپ باطل پسند جماعت سمجھتے ہیں جیسا کہ تمام علماءِ امت ان کے باطل پسند ہونے پر متفق ہیں آگے تو آپ ہی کا ارادہ اور اختیاری فعل رہ جاتا ہے کہ ان سے قطع تعلق

رکھیں، ان کی تقریبات یا اجتماعات میں شرکت اگر اس خطرے کا سبب ہے کہ آپ کے خیالات یا عقائد میں فرق آجائے تو آپ کیوں شرکت کریں؟ اور اس میں کسی کی رائے یا مشورہ لینا ایک بے نتیجہ سی بات ہے اپنے قلب اور عزم کو ٹٹولئے اور مضبوطی سے اس پر عملاً جم جائیے کسی کے کہنے سننے یا ملامت و نصیحت کی ہرگز پرواہ نہ کیجئے۔ ایمان کی سلامتی تمام دنیا کی نعمتوں سے بالاتر ہے اگر اس میں خلل آجائے تو یہ رسمی قسم کی رواداریاں یا مبتذل چاپلوسیاں کام نہیں آسکتیں بلکہ وبال و عذاب ہوجاتی ہیں جب اس جماعت سے آپ کا کوئی تعلق نہیں اور علماء اس کی تصدیق بھی فرمارہے ہیں جیساکہ آپ نے تحریر میں فرمایا پھر بھی ان کی تقریبات میں جانا درحقیقت ان علماء کی تکذیب کردینا ہے اس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ آپ عملاً ان کے یہاں شرکتیں تو قطعاً ترک کردیں اور ساتھ ہی اعلانیہ طور پر اسے واضح کردیں کہ میرا اس جماعت سے کوئی تعلق نہیں پھر آپ پر کوئی تہمت یا اتہام نہیں لگا دے گا ورنہ آپ ہمیشہ تہمتوں اور ملامتوں کا نشانہ بنتے رہیں گے ——— امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

بواسیر کا کامیاب علاج

حکیم یامین صاحب کے پچاس سالہ تجربات کا نچوڑ ہے جس سے ہزاروں بیمار ہر سال مستفید ہوتے ہیں۔ آپ کے پچاس سالہ تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ طب یونانی میں ایسے ایسے نادر نسخے موجود ہیں جو مرض کو دور کرنے میں آب حیات کا حکم رکھتے ہیں۔

حب بواسیر مجرب

حکیم صاحب موصوف کا ایک ایسا عطیہ ہے جس پر طب یونانی بجا طور پر ناز کرسکتی ہے۔ بواسیر بادی ہو یا خونی دونوں میں یہ گولیاں مفید ثابت ہوتی رہی ہیں اور ہورہی ہیں۔ آپ بھی اس موذی مرض سے چھٹکارا پانے لئے اس کا استعمال کریں۔ پورے کورس کی قیمت مع محصول۔ دس روپے

منگانے کا پتہ

حکیم شاہد حسین۔ دیوبند۔ ضلع سہارنپور (یو۔پی)

تفہیم القرآن پارۂ عم مولانا مودودی کی شہرۂ آفاق اور معرکۃ الآرا تفہیم القرآن کا پارہ عم۔ کسی بھی مسلمان کو اس پارے کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہیئے۔ تاکہ نمازیں عام طور پڑھی جانے والی سورتوں کے مطالب ذہن میں رہیں۔ بہترین لکھائی چھپائی۔

ہدیہ ——— پانچ روپے

جاوید نامہ مع شرح اقبالؒ کی مشہور ترین فارسی نظم "جاوید نامہ" پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی اردو شرح کے ساتھ۔ اس دقیق نظم کی شرح کرنا آسان نہ تھا مگر مترجم کی اعلیٰ قابلیت نے یہ مہم سر کر ہی لی۔ دو جلدوں میں۔

قیمت ——— پچھتر روپے ۷۵/

البدائع مولانا اشرف علی رح کی گراں قدر تالیف۔ جس میں نوع بہ نوع پیچیدہ سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ زبان اردو ہی ہے۔

قیمت مجلد ——— گیارہ روپے ۱۱/

التکشف عن مہمات التصوف یہ بھی مولانا اشرف علی رح کی معروف کتاب ہے مضامین نادرہ سے لبریز۔ مجلد ——— بیس روپے

تربیت السالک مولانا اشرف علی کی یہ بیش بہا کتاب اب دو ضخیم جلدوں میں دستیاب ہے ارباب ذوق اس تحفۂ عجیبہ سے فائدہ اٹھائیں۔

قیمت مکمل ہر دو جلد پینتیس روپے ۳۵/

معرفت الٰہیہ اسی کتاب کا معروف نام "خدا کی پہچان" بھی ہے۔ حضرت شاہ عبد الغنی رح کے نہایت دقیق اور معرفت سے لبریز فرمودات حکمت، شریعت اور حسن تربیت کا گنجینہ

قیمت مجلد ——— پندرہ روپے

البلاغ المبین شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تصنیف جو بدعت و سنت کی بہترین تشریح کرتی ہے۔ شریعت قبوری کے مقابلہ میں شریعت حقہ کی تعلیمات ضرور پڑھیئے۔ مجلد چھ روپے

امام اعظم ابو حنیفہ رح امام اعظم رح کے حالات و کوائف مفتی عزیز الرحمٰن کے قلم سے

قیمت مجلد ——— ساڑھے آٹھ روپے ۸/۵۰

ولی کامل حضرت مولانا زکریا شیخ الحدیث مظاہر العلوم (سہارنپور) کی داستانِ زندگی۔ مفتی عزیز الرحمٰن کے قلم سے۔ قیمت مجلد پانچ روپے پچھتر پیسے ۵/۷۵

فلاحِ ملت

بدعتوں کے رد اور صحیح عقائد کے اثبات میں ایک عام فہم۔ دلچسپ اور مفید کتاب۔ جس دور میں بدعتیں عام ہوں۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ ضرور کرتے رہنا چاہیئے۔

قیمت ——— ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

	پیسے	روپے
تذکرۂ شیخ الہندؒ مجلد	-	۵
کراماتِ صحابہؓ ؍؍	۵۰	۲
ایمان کیا ہے ؍؍	-	۶
سپاس نامے (مولانا محمد طیب کو پیش کئے گئے)	-	۶
اعجاز قرآنی یعنی بیماریوں کا قرآنی علاج	۵۰	۲

	پیسے	روپے
بازار رشوت قرآن و حدیث کی روشنی میں	-	۳
مفتاح عملیات یعنی عملیات کی کنجی	-	۸
مکاتیب طیب (مولانا محمد طیب کے خطوط)	-	۵
عرفان عارف (مولانا محمد طیب کا کلام منظوم)	۵۰	۶

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

کچھ نظریۂ ارتقاء کے بارے میں

یہ مضمون ہفت روزہ الجمعیۃ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس پر صاحبِ مضمون کا نام درج نہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل ایڈیٹر وحید الدین خاں صاحب کے قلم سے نکلا ہے۔ موصوف سائنس اور علوم جدیدہ پر اکثر لکھتے رہتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں بھی انھوں نے نفسِ موضوع پر جو اظہار خیال کیا ہے فکر انگیز اور بلیغ ہے لیکن مختصر اور دقیق بھی ہے۔ نظریۂ ارتقاء چونکہ خواص کے دائرے سے نکل کر عوام تک جا پہنچا ہے اور بعض مغرب زدہ مسلم دانشوروں کی ستم ظریفی سے عامۃ المسلمین بھی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ تفصیلاً بھی کلام کیا جاتا رہے۔ تجلّی کا "نظریۂ ارتقاء نمبر" الحمدللہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا لیکن اس کا محورِ بحث محدود تھا۔ اس سے زیادہ تر اہلِ ایمان ہی کی تشفی ہو سکتی ہے۔ یعقل کا گوشہ مزید بحث و نظر کا طالب ہے لہٰذا اس مضمون کے اختتام پر ہم تفصیلی گفتگو کریں گے۔ (عامر عثمانی)

عضویاتی ارتقاء جدید دنیا کے لئے ایک سائنٹفک حقیقت ہے۔ "سائنس آف لائف" کے مصنفین نے لکھا ہے۔ "عضویاتی ارتقاء کے حقیقت ہونے سے اب کسی کو انکار نہیں ہے۔ سوا ان لوگوں کے جو جاہل ہوں یا متعصب ہوں یا اوہام پرستی میں مبتلا ہوں"۔ ماڈرن پاکٹ لائبریری (نیویارک) نے MAN AND THE UNIVERSE کے نام سے کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا ہے۔ اس سلسلے کی پانچویں کتاب میں ڈارون کی کتاب "اصل الانواع" کو "تاریخ ساز تصنیف" قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے:-

"انسان اپنا شجرۂ نسب معلوم کرنے کے لئے طویل ترین مدت سے جو کوشش کر رہا ہے اس سلسلے میں کسی نظریے کو اتنی زبردست مذہبی مخالفت کا سامنا کرنا نہیں پڑا جتنا چارلس ڈارون کے انتخابِ طبیعی کو۔ اور نہ کسی دوسرے نظریے کو اتنی زیادہ سائنسی تصدیق SCIENTIFIC AFFIRMATION حاصل ہوئی ہے جتنی اس نظریے کو حاصل ہوئی ہے"

(PHILOSOPHERS OF SCIENCE P 244)

امریکا کا مشہور ارتقاء پسند عالم سمپسن G.C. SIMPSON لکھتا ہے:-

"ڈارون تاریخ کے بلند ترین لوگوں میں سے ایک تھا جس نے انسانی علم کی ترقی میں بہت نمایاں کام انجام دیا ہے۔ یہ مقام اس نے اس لئے حاصل کیا کہ اس نے نظریۂ ارتقاء کو آخری اور مکمل طور پر ایک حقیقت ثابت کر دیا۔ نہ کہ محض ایک قیاس یا متبادل مفروضہ جو سائنسی تحقیق کے لئے قائم کر لیا گیا ہو۔"

(MEANING OF EVOLUTION (N.V. 1951) P. 127

اے۔ ای۔ مینڈر لکھتا ہے:-

"یہ نظریہ کہ انسان اور دوسری ذی حیات اشیاء کے موجودہ صورت تک پہنچنے میں ارتقاء کا عمل ہوا ہے یہ اب اتنے دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کو تقریباً حقیقت APPROXIMATE CERTAINTY

کہا جا سکتا ہے۔"

لل (R.S.LULL) لکھتا ہے:-

"ڈاردن کے بعد سے نظریۂ ارتقا دن بہ دن زیادہ قبولیت حاصل کرتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب سوچنے اور جاننے والے لوگوں میں اس میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے کہ یہ واحد منطق ہے جس کے تحت عمل تخلیق کی توجیہ ہو سکتی ہے اور اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔"
(ORGANIC EVOLUTION. P 15)

وہ مزید لکھتا ہے:-

"تمام سائنس داں اور دوسرے جاننے والوں میں سے بیشتر لوگ نظریۂ ارتقا کی صداقت (TRUF) پر مطمئن ہو چکے ہیں۔ خواہ وہ جمادات سے متعلق ہو یا حیوانات سے متعلق۔ یعنی یہ کہ زمین جب اس قابل ہوئی کہ اس پر زندہ چیزیں رہ سکیں، اس وقت لمبی مدت کے عمل کے نتیجہ میں زندگی کی کچھ سادہ اقسام پیدا ہوئیں اور اس کے بعد طویل مدت کے مسلسل عمل سے نباتات اور حیوانات کی وہ تمام حیرت انگیز قسمیں وجود میں آئیں جن کو ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔" (صفحہ ۸۳)

اس نظریہ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ لل کی سات سو صفحے کی کتاب میں زندگی کے تخلیقی تصور (SPECIAL CREATION) پر صرف ایک صفحہ اور چند سطریں ہیں اور بقیہ تمام عضویاتی ارتقاء کے بارے میں ہیں۔ اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۵۸) میں تخلیق (CREATION 1958) کے نظریے کو چوتھائی صفحہ سے بھی کم دیئے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں عضویاتی ارتقاء کے عنوان کے تحت جو مقابلہ شامل کیا گیا ہے وہ باریک ٹائپ کے پورے چودہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مقالے میں بھی حیوانات میں ارتقاء کو بطور ایک حقیقت (FACT) تسلیم کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ڈاردن کے بعد اس نظریے کو سائنس دانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ کا قبول عام (GENERAL ACCEPTENCE) حاصل ہو چکا ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے حق میں وہ کون سے دلائل فراہم ہوئے ہیں جن کی وجہ سے دور جدید کے اہل علم نے اس کی صداقت تسلیم کر لی ہے۔ یہاں میں اس کے چند بنیادی پہلوؤں کا ذکر کر دوں گا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ان دلائل کی نوعیت کیا ہے۔

۱- حیوانات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان میں ادنیٰ اور اعلیٰ اقسام پائی جاتی ہیں۔ واحد الخلیہ جانوروں (SINGLE CELLUILAR ANIMAL) سے لیکر اربوں خلیات رکھنے والے جانور اور اسی طرح صلاحیتوں کے اعتبار سے حیوانات میں ادنیٰ اور اعلیٰ درجات کا فرق۔

۲- اس ابتدائی مشاہدے کو جب اس کہانی کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے جو زمین کی تہوں میں نقش ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس فرق میں باعتبار زمانہ ایک ارتقائی ترتیب ہے۔ کروڑوں برس پہلے زمین پر زندگی کی جو شکلیں آباد تھیں ان کے پتھر قدرتی عمل کے تحت پتھرائی ہوئی حالت میں اب بھی زمین کے نیچے دبے ہوئے ہیں جن کو فاسل (FOSSIL) کہا جاتا ہے۔ فاسل بتاتے ہیں کہ زمین کے زیادہ قدیم دور میں حیوانات کی جو قسمیں یہاں آباد تھیں وہ سادہ قسمیں تھیں اور اس کے بعد دھیرے دھیرے زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ قسمیں آباد ہوتی رہیں ـــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی موجودہ قسمیں سب کی سب ایک وقت وجود میں نہیں آئیں بلکہ پہلے سادہ قسمیں وجود میں آئیں اور اس کے بعد دھیرے دھیرے ترقی یافتہ بنیں۔

۳- اس کے بعد ایک اور حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ مختلف حیوانات کے درمیان نوعی اختلاف کے باوجود ان کے جسمانی نظام میں بہت سی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً مچھلی، چڑیے سے ملتی جلتی ہے اور گھوڑے کا ڈھانچہ انسان کے مشابہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ سارے ذی حیات ایک ہی خاندان کی پیداوار ہیں اور سب کے اجداد بالآخر ایک ہی تھے۔

۴۔ ایک نوع سے دوسری نوع کیسے نکلی۔ یہ اس وقت معلوم ہو جاتا ہے جب ہم ایک اور واقعہ کو دیکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک جانور کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے سب یکساں نہیں ہوتے بلکہ ان کے مختلف بچوں میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق اگلی نسلوں میں مزید ترقی کرتا ہے اور انتخاب طبیعی کے عمل کے تحت آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہ فرق لاکھوں سال کے بعد اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ ایک چھوٹی گردن والی بکری لمبے گردن والے زرافہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس نظریہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ "انسل بیالوجی" کے مصنفین (ہالڈین اور ہکسلے) نے ارتقاء کو تبدیلیوں کے انتخاب CELECTION MUTATIO کا نام دیا ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے حامیوں کے یہ دلائل جس معیار پر پورے اترتے ہیں، وہ کون سا معیار ہے۔ یہ کوئی براہ راست تجربہ یا مشاہدہ نہیں بلکہ صرف ایسے شاہدات ہیں جن سے اس کی صداقت کا قرینہ معلوم ہوتا ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے حامی ابھی تک ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی مشاہدہ یا تجربہ نہیں کرا سکے ہیں جن کے اوپر ان کے نظریہ کی بنیاد قائم ہے۔ مثلاً وہ کسی لیبارٹری میں یہ نہیں دکھا سکتے کہ بے جان مادہ سے زندگی کیسے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دعوے کی بنیاد صرف یہ ہے کہ طبیعاتی ریکارڈ بتاتا ہے کہ پہلے بے جان مادہ تھا پھر کائنات میں زندگی رینگنے لگی۔ اس سے وہ قیاس کر لیتے ہیں کہ زندگی بے جان مادہ سے اسی طرح نکل آئی جیسے ماں کے پیٹ سے بچہ نکلتا ہے۔ اسی طرح ایک نوع کا دوسری نوع میں تبدیل ہونا بذات خود کوئی تجربہ اور مشاہدہ کی چیز نہیں ایسا نہیں ہے کہ کسی چڑیا خانہ میں ایسے تجربات کئے جا سکیں جہاں بکری زرافہ ہوتی ہوئی نظر آئے بلکہ بعض خارجی مشاہدات، مثلاً مختلف انواع میں مشابہت اور ایک نسل کے کئی بچوں میں باہم فرق سے یہ قیاس کر لیا گیا ہے کہ نوعیں الگ الگ وجود میں نہیں آئیں بلکہ ہر نوع دوسری نوع سے برآمد ہوتی چلی گئی ہے۔ اسی طرح جبلت کا ذہانت کی شکل میں ترقی کرنے کا معاملہ ہے جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان بھی حیوان کی ایک اگلی نسل ہے۔ اس سلسلے میں بھی ابھی تک ایسا کوئی مشاہدہ سامنے نہیں لایا جا سکا جہاں فی الواقع جبلت ذہانت میں تبدیل ہوتی نظر آ رہی ہو۔ یہ بھی محض ایک قیاس ہے جس کی بنیاد صرف اس واقعہ پر ہے کہ ارضیاتی تحقیق میں جبلت والے جانوروں کے آثار نچلے طبقات میں ملتے ہیں اور ذہانت والے جانوروں کے آثار اوپر کے طبقات میں۔

اس قسم کے تمام دلائل کی نوعیت یہ ہے کہ دعوے اور دلیل کے درمیان جو ربط ہے وہ صرف منطقی ربط ہے نہ کہ تجرباتی یا مشاہداتی ربط۔ مگر اسی قسم کے دلائل کی بنیاد پر ارتقا کے تصور کو موجودہ زمانے میں ایک سائنٹفک حقیقت قرار دے دیا گیا ہے۔ گویا جدید ذہن کے نزدیک علمی حقائق کا دائرہ صرف انھیں واقعات تک محدود نہیں ہے۔ جو براہ راست تجربے سے معلوم ہوں، بلکہ تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر جو منطقی قرینہ حاصل ہوتا ہے وہ بھی اتنی ہی سائنٹفک حقیقت ہو سکتی ہے جتنی وہ حقیقت جس کا یا جس کے اثرات کا براہ راست تجربہ کیا جا سکتا ہو۔

یہاں مجھے نظریۂ ارتقاء کی صداقت یا عدم صداقت سے بحث نہیں ہے کیونکہ یہاں جو سوال ہے وہ اصلاً معیار استدلال سے متعلق ہے نہ کہ نظریۂ ارتقاء سے متعلق۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ خواہ کوئی بھی معیار استدلال ہو اس سے ثابت کی ہوئی چیز صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ سائنس میں آئے دن نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ عموماً ان معیاروں کے مطابق ثابت کئے جاتے ہیں جو خالص تجرباتی نوعیت سے متعلق ہیں۔ کسی معیار استدلال کو جائز اور معقول تسلیم کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے حوالے سے جو بات بھی پیش کر دی جائے وہ لازماً صحیح ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ نتیجہ غلط ہو۔ مگر معیار تسلیم شدہ ہے تو اصل معیار کی معقولیت اس کے بعد بھی باقی رہے گی۔

سر آرتھر کیتھ کے الفاظ میں ارتقاء مذہب عقلیت کا ایک بنیادی عقیدہ BASIC DOGMA OF RATIONALISM ہے۔ ایک سائنسی انسائیکلوپیڈیا میں ڈارونزم

کو ایک ایسا نظریہ کہا گیا ہے جس کی بنیاد توجیہہ بلا مشاہدہ
EXPLAMATION WITHOUT DEMONSTRATIONS
پر قائم ہے۔

پھر ایک ایسی چیز جس کا لیبارٹری میں تجربہ نہ کیا جا سکتا ہو جو صرف "عقیدہ" ہو۔ اس کو کس بنا پر علمی حقیقت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ اے۔ ای۔ ونڈر کے الفاظ میں یہ ہے:۔

۱۔ یہ نظریہ تمام معلوم حقیقتوں سے ہم آہنگ CONSISTENT ہے۔

۲۔ اس نظریے میں ان بہت سے واقعات کی توجیہہ مل جاتی ہے جو ان کے بغیر سمجھے نہیں جا سکتے۔

۳۔ دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔ (صفحہ ۱۱۲) یہ استدلال جو نظریۂ ارتقاء کو حقیقت قرار دینے کے لئے معیارِ استدلال کے اعتبار سے کافی سمجھا جاتا ہے۔ یہی استدلال بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ مذہب کے حق میں موجود ہے۔ ایسی حالت میں جدید ذہن کے پاس کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ وہ کیوں ارتقاء کو سائنسی حقیقت قرار دیتا ہے اور مذہب کو سائنسی ذہن کے لئے ناقابلِ قبول ٹھیراتا ہے۔

تجلّی

موضوع بڑا خشک ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں تری کیسے پیدا کی جائے۔ صرف اہلِ علم اور ثقہ حضرات کی مجلس ہو تو ہر طرح کی بورِیتیں گوارا کی جا سکتی ہیں لیکن عامۃ الناس کی بزم میں دقیق و غامض بحثوں کا مطلب یہ ہے کہ سامعین چلتے بنیں اور مقرر تقریر کرتا رہ جائے۔

لیکن دوستو۔ بات صرف فلسفے یا سائنس کی نہیں دین و شریعت کی ہے۔ عقائد کی ہے۔ قرآنِ حکیم کی ہے۔ "نظریہ ارتقاء نمبر" اگرچہ اللہ کے فضل سے بہت کامیاب رہا لیکن خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر بھی کچھ لوگ غلط فہمیوں سے نہیں نکل سکے ہیں اور مغربی افکار کا رعب ان پر بری طرح

طاری ہے۔ ایسوں پر ترس بھی آتا ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ کچھ تو مغربی تعلیم کے مذمیم اثرات۔ کچھ وہ زہریلے جراثیم جو ہمارے بعض مسلمان دانشور فضا میں پھیلا گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سر امیر علی اور سر سید اور علامہ مشرقی جیسے حضرات کی خطاؤں کو معاف کرے ان کی مغرب زدگی نے جہاں اور بہت سے موضوعات پر عجیب و غریب گل کھلائے وہیں نظریۂ تخلیق کے سلسلے میں مغرب کی کفش برداری کی اور آیاتِ الٰہیہ سے کھیل کھیلا۔ اس کے اثرات آج تک بھی کچھ نہ کچھ باقی ہیں اور قرآن کی غایت درجہ صراحت کے باوجود بہتیرے مسلمان بھائی خود تو یہ ماننے پر آمادہ نہیں کر سکے ہیں کہ ڈارون کا نام نہاد نظریۂ ارتقاء لغو و باطل بھی ہو سکتا ہے۔

ان کی اصلاحِ خیال اور احقاقِ حق کی خاطر ہم بوریت بھی گوارا کریں یہ ایک مجبوری ہے۔ قارئین تھوڑا سا ضبطِ نفس کریں گے تو انھیں بھی کچھ نہ کچھ علمی فائدہ پہنچ ہی جائیگا۔

محترم وحید الدین خاں صاحب نے اپنے آخری فقروں میں بات تو پتے کی کہی۔ مگر علمائے سائنس اور دانشورانِ مغرب کے یہاں نظریۂ ارتقاء کی مقبولیت کا جو حدود اربعہ انھوں نے بیان کیا ہے اس کے بالمقابل تردید و تعریض اتنی مختصر، مبہم اور مجمل ہے کہ کم لوگ اس سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ اردو جرائد کو اعلیٰ قابلیت اور باریک بیں نظر رکھنے والے قارئین بہت زیادہ میسر نہیں ہیں لہٰذا موصوف کے عالمانہ اشارے کی معنویت اور علمی قدر و قیمت سمجھنے والے بھی زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم ذرا تفصیل میں جائیں۔

سب سے پہلے "سائنس آف لائف" کے مصنفین کا وہ اقتباس لیجئے جس سے مضمون کا آغاز ہوا ہے۔ اسمیں "عضویاتی ارتقاء" کا لفظ استعمال ہوا۔ سوال یہ ہے کہ اسکی ٹھیک ٹھیک مراد کیا ہے؟

بج پودا بنتا ہے۔ پودا درخت بن جاتا ہے۔ آدمی کا بچہ بھر کا پیدا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ فٹوں تک دراز ہو جاتا ہوانات کا بھی یہی حال ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب عضویاتی ہی کی شکلیں ہیں۔ انھیں انسان ابتدائے آفرینش سے ر دیکھ رہا ہے۔ ان کے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہ ثابت ہوا کہ مذکورہ مصنفین کی مراد یہ بالیدگی اور ہی نہیں بلکہ وہ اُس ارتقار کی بات کر رہے ہیں جو ع سے دوسری نوع کی طرف ہوتا ہے اور جس کی اصطلاحی ردن کے نظریۂ ارتقار سے کی جاتی ہے۔ یعنی چھپکلی ، کر مگر مچھ بن گئی، بندر منقلب ہو کر انسان بن گیا۔ اگرچہ آج تک قطعی دلائل سے محروم اور فیصلہ کن سے تہی دامن ہے۔ اس نظریہ کی حیثیت اگرچہ آج الی موشگافیوں اور واہیاتی نکتہ سنجیوں سے آگے ھی، اس نظریہ کے حق میں سائنس کے پاس اگرچہ ہانِ ناطق نہیں ہے لیکن "سائنس آف لائف" کے صنفین کس ادعائی انداز میں فرما رہے ہیں کہ اس نظریہ ہرف جاہل اور متعصب اور وہم پرست ہی کر سکتے رکوئی نہیں۔

ثبوت تو ابھی ہم پیش کریں گے کہ ان بزرگوں کا یہ ادعا رخلافِ واقعہ ہے۔ دیکھنا یہ بھی ہے کہ جو زبان نے استعمال فرمائی کیا اسے علمی زبان کہہ سکتے ہیں اور فک طرزِ فکر کا دعویٰ کرنے والے حضرات ایسے ہی مالک ہونے چاہئیں کہ اپنی رائے سے مختلف کھنے والوں کو مجرد دلیل اور برہان سے قائل کرنے ، ان القاب و آداب سے بھی مشرف فرمائیں جنھیں ن کے لغت میں گالی کہا جاتا ہے۔

علوم واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی مذہب ڈارون کا ہمنوا نہیں ہے اور آج کی دنیا چاہے کتنی ہی ور ہو چکی ہو لیکن دنیا کی مجموعی آبادی کا اکثر و ر اور غالب تعداد آج بھی مذہب ہی کے حلقہ ہے لہٰذا جہل، تعصب اور وہم پرستی کی گالیوں کا ہدف معدودے چند لوگ نہیں بنتے بلکہ انسانیت کا سوادِ اعظم بن جاتا ہے۔ اب اندازہ کیجیے کہ جو لوگ ایک غیر ثابت نظریہ کی حمایت و وکالت میں بلا تکلف یہ اندازِ گفتگو اختیار فرمائیں کیا واقعی وہ خالص معروضی اور سائنٹفک طرزِ فکر کے حامل ہو سکتے ہیں اور کیا انکا لب و لہجہ ان کی جذباتی جانب داری اور فکری تعصب کا غماز نہیں ہے۔ خود جہل و تعصب اور توہمات و تخیلات کا شکار ہیں مگر الزام دے رہے ہیں انسانیت کے سوادِ اعظم کو۔

دوسرا قول امریکہ کے ارتقار پسند عالم سمپسن کا نقل ہوا۔ ڈارون کو وہ تاریخ کے بلند ترین لوگوں میں شمار کرتا ہے۔ ہمیں اس کی تردید کی ضرورت نہیں کہ جو لوگ خدا کے بندے مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے نہیں جھکتے کون ان کی زبان بند کر سکتا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ "ڈارون نے نظریۂ ارتقار کو آخری اور مکمل طور پر ایک حقیقت ثابت کر دیا" کم و بیش اُس دعوے کے مرادف ہے جو روس نے پہلی خلائی اُڑان کے وقت کیا تھا کہ ہمارے خلا باز خلا کو کھنگال آئے۔ وہاں خدا نہیں ہے لہٰذا مذہب کا عقیدہ غلط ثابت ہو گیا۔

ایسے دعوے اگر واقعی کوئی علمی قدر و قیمت رکھتے ہیں تو علم اور جہالت کو ہم معنی مان لینا چاہیئے۔ دعویٰ کرنا کیا مشکل ہے۔ کوئی بھی دعویٰ کر گذرئیے۔ زبان یا قلم کی جنبش کون روک سکتا ہے لیکن دلیل کے بغیر دعویٰ مسخرا پن ہے چاہے اسے کتنا ہی سجا بنا کر پیش کیا جائے۔ آج تک تو کوئی دلیل قطعی دانشورانِ مغرب نام نہاد نظریۂ ارتقار کی حقانیت پر پیش نہیں کر سکے۔ پرانی ہڈیاں اور ڈھانچے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان پر قیاس و تخمین کی عمارت کھڑی کرنا اور متعدد احتمالات میں سے کسی ایک احتمال اور ایک امکان کو واحد سچائی اور سائنٹفک دریافت قرار دے ڈالنا بے مغزوں اور مرعوبوں کے

نزدیک کوئی شاندار کارنامہ ہو تو ہو عقلِ سلیم اسے اٹکل بازی اور تیر تکّے سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتی۔

تیسرے اقتباس میں میننڈر نے خدا جانے کن لائل کی طرف اشارہ کیا۔

"۔۔۔۔ یہ اب اتنے دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کو تقریباً حقیقت کہا جا سکتا ہے۔"

یہ بھی مجرد ایک دعویٰ ہے جو تعلّی کی حدود کو چھو رہا ہے۔ اس طرح کے دعوے صرف ذاتی خوش خیالیوں اور جذباتی فریب خوردگیوں سے ظہور پذیر ہوا کرتے ہیں۔ ان سے سوائے اس کے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ دعوہ کرنے والا آنکھیں بند کر کے ایک ہی رُخ پر بہا چلا رہا ہے۔

کسی ارتقائی اسکالر کو اگر واقعی ان دلائل کا سراغ لگ سکا ہو جن کا تذکرہ مینڈر نے کیا تو وہ انھیں سامنے لائے اور ہم دیکھیں کہ ان میں کتنی جان ہے۔

لُل بھی اپنے ہمنواؤں سے پیچھے نہیں رہا۔ مگر اس کے الفاظ نے اُس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے جسے ہم بار بار دہرا چکے ہیں۔

"۔۔۔۔۔ اس میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے کہ یہ واحد منطق ہے جس کے تحت عملِ تخلیق کی توجیہہ ہو سکتی ہے اور اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔"

یہ ہیں اس کے منقولہ الفاظ۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "نظریۂ ارتقاء" کوئی ایسا نظریہ نہیں جو غیر جانب دار سائنس دانوں پر بے لاگ تحقیق و تفتیش سے منکشف ہوا ہو بلکہ وہ ایک ایسے فکر و تفحص کا ثمرہ ہے جس نے آغاز ہی میں طے کر لیا تھا کہ اس کائنات کا خالق کوئی نہیں ہے اور زندگی کسی کے پیدا کرنے سے ظہور میں نہیں آئی بلکہ وہ اسباب و علل کی کسی نہ کسی تکنک سے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اس تخیل کو بنیاد بنا کر آگے بڑھنے والا فکر و فلسفہ بے لاگ تو کسی طرح بھی نہیں کہلا سکتا۔ اس نے تفتیش و تحقیق سے پہلے ہی فرض کر لیا ہے کہ کائنات اور زندگی خود بخود پیدا ہوئی۔ خالقِ کائنات کا معروف تخیل محض جھوٹ ہے اور جس طرح بھی ہو ہمیں ایسی کوئی توجیہہ و تاویل تلاش کرنی ہے جو تصورِ خالق سے مکمل طور پر نجات دیدے۔

حالانکہ بے لاگ اور غیر جانب دارانہ ریسرچ کا تقاضا تھا کہ الحاد اور تصورِ خالق دونوں کو برابر کے امکانات تصور کر کے دادِ تحقیق دی جاتی۔ پھر واقعۃً اگر کوئی دلیلِ قطعی تصورِ خالق کی نفی اور استرداد کی مل جاتی تو یہ طرزِ عمل سائنٹفک قرار پا سکتا تھا کہ مختلف توجیہات میں سے کوئی توجیہہ منتخب کر لی جائے۔ لیکن جب شروع ہی میں یہ غیر علمی اور غیر منطقی ذہن بنا لیا گیا کہ تصورِ خالق ناقابلِ قبول ہے تو ظاہر ہے کہ ریسرچ کا ہر قدم انصاف اور صداقت سے دُور ہی دُور رہے جائے گا اور اسی طرح کے شاعرانہ فارمولے اور نظریئے دل و دماغ کو اپیل کریں گے جیسا ڈارونی نظریہ ہے۔

ایک اور بات۔ ہمارے یہاں کے ادھ کچرے اور مرعوب دانشور بلا تکلف کہہ ڈالتے ہیں کہ نظریۂ ارتقاء حقیقت بن چکا ہے۔ اس کے لئے سائنٹفک دلائل مہیا ہو چکے ہیں۔ مگر وہ ملاحظہ فرمائیں۔ لُل جیسا "ارتقاء پرست" اور "ڈارون شناس" اس نظریہ کو ایک طرح کی "منطق" ہی سے تعبیر کر رہا ہے جو فی ذاتہٖ کوئی حقیقت یا صداقت یا فیکٹ نہیں ہے بلکہ فکر و قیاس کے دائرے کی شے ہے جس سے حقائق کی توجیہہ و تاویل کا کام لے سکتے ہیں۔ نام نہاد دانشوروں کو اپنے شیوخ و مرشدین پر بازی تو نہ لے جانی چاہیئے۔ منطق فکر و قیاس کے ایک معنوی اور غیر مرئی مجموعے سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اسے مشاہدے کا نام نہیں دے سکتے۔ لیبرٹری میں اسے تجربات کے مراحل سے بھی نہیں گزارا جا سکتا۔ وہ مفروضات کی جنس سے ہے اور کوئی علمی قاعدہ اس امکان کی راہ میں حائل نہیں کہ کل اگر عملِ تخلیق کی توجیہہ کے لئے نظریۂ ارتقاء سے بہتر کوئی نظریہ مل جائے تو اسے

ن لیا جائے۔ منطقی توجیہات کو "وحی" کا مماثل تو دانشوران
رب اور بڑے بڑے سائنس داں بھی نہیں کہتے۔ کوئی
منطقی توجیہہ فکرِ انسانی کے سفر کا ایک مرحلہ تو ہو سکتی
آخری صداقت نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اسکے بالمقابل
حی" آخری صداقت کا نام ہے اور مذہب اسی آخری
اقت پر تکیہ کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نظریۂ ارتقاء فقط ایک تاویل و
نہہ ہے ایسے ذہن کی اختراع کی ہوئی جو ابتداء ہی میں
د کو بنیادی صداقت مان چکا ہے اور اس کے دیئے
ہ کہ خواہ کتنی ہی دور از کار اور واہی قیاس آرائیاں
نی پڑیں مگر یہ نہیں ماننا کہ خدا اور خالق بھی کوئی شے ہے۔
اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان دانشور نظریۂ ارتقاء
ریچھا ہوا ہے تو اس کے سوا ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ وہ
ب میں مبتلا ہے۔

ل کے دوسرے اقتباس پر بھی نظر ڈال لیجئے:۔
وہ خوش خبری سناتا ہے کہ نظریۂ ارتقاء کی صداقت
ام سائنس داں اور دوسرے اہلِ علم میں سے بیشتر لوگ
ن ہو چکے ہیں۔ یہ خوش خبری اول تو واقعات کے
بق نہیں۔ مجرد خوش فہمی اور تعلّی ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو
تو کیا خود سائنس کے دفتر میں ایسی بے شمار نظیریں موجود
ہیں کہ سالہا سال تک ایک نظریہ کو مسلّمات میں سمجھا
رہا پھر فکر و تحقیق کی مزید پیش رفت نے اس خوش فہمی
وہ چاک کر دیا اور مسلّمہ دھواں دھواں ہو گیا۔
ابھی تازہ اور انقلاب انگیز نظیر وہ جدید ترین نظریہ
جسے قانون عدم تعین سے تعبیر کرتے ہیں یعنی
PRINCIPLE OF INDETERMINACY)
انیسویں صدی کے آخر تک یہ نظریہ مسلّمات میں افضل
کائنات میں علت و معلول کے سلسلے فولادی تسلسل
اتھ کار فرما ہیں۔ ایک علت جس معلوم کو ظہور دیتی
ہ معلول اس علت کے ذریعے ایک کروڑ سال پہلے

بھی اسی طرح ظہور میں آیا تھا جس طرح آج آیا ہے اور دس کروڑ
سال بعد بھی اسی طرح ظہور میں آئے گا۔ اس نظریہ کے تحت
سائنس دانوں کو یہ یقین تھا کہ اسباب و علل کی منطق کا سہارا
لے کر ہم سو فی صدی صحت کے ساتھ مستقبل کی بہت سی
پیشین گوئیاں کر سکتے ہیں۔ یہی نظریہ قبل از تاریخ کے ماضی کی
ریسرچ میں زور شور کے ساتھ کام میں لایا جاتا رہا۔ اسی نظریہ
کی مدد سے فلکیاتی سائنس کے دفتر تیار کئے گئے۔ بیشمار ایجادات
کے ڈھیر بھی اسی کے رہینِ منت ہیں۔

مگر بیسویں صدی میں ترقی یافتہ تفکر اور تجربات کا حاصل
اونچے درجے کے مفکرینِ مغرب اور ماہرینِ سائنس کے یہاں
یہ نکلا ہے کہ پچھلا نظریہ درست نہیں تھا اور علت و معلول یا
سبب و مسبّب کا باہمی رابطہ اٹل نہیں ہے۔ کوئی بھی علت لاکھوں
سال سے اگر ایک ہی معلول پر منتج ہو رہی ہے تب بھی یہ دعویٰ
کرنے کے لئے کوئی ٹھوس علمی بنیاد موجود نہیں کہ آئندہ بھی یہ
علّت اسی معلوم تک پہنچائے گی تسلسل خواہ کتنا ہی طویل ہو
اسے بس ایک واقعہ مانا جا سکتا ہے اور یہ بھی ممکن سمجھا جا سکتا ہے
کہ آئندہ بھی نامعلوم عرصے تک یہ اپنے حال پر قائم رہے مگر
امکان یہ بھی ہے کہ ایسا نہ ہو اور تبدیلیاں ظہور میں آ جائیں۔
مثلاً فلاں فلاں عناصر مل کر "پانی" بناتے ہیں۔ یہ
واقعہ نامعلوم زمانے سے چلا آ رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ مستقبل
بعید تک چلے جائے لیکن اس امکان اور احتمال کو رد کرنے کی
کوئی سائنٹفک وجہ موجود نہیں ہے کہ کسی موقعہ پر یہ عناصر
پانی نہ بنائیں کوئی اور چیز بنا دیں۔ کیونکہ سائنس یہ دریافت
نہیں کر سکی ہے کہ یہ کیوں پانی بناتے ہیں۔ وہ صرف واقعے
کا مشاہدہ کرنے تک محدود ہیں اس کی لِم اور علّتِ حقیقی کو
نہیں معلوم کر سکے ہیں۔

پانی گرمی پا کر بھاپ بن جاتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے
جو تجربہ میں آیا۔ روئی کم وزن اور لوہا وزنی ہوتا ہے یہ بھی
فقط واقعہ ہے۔ سائنس تجزیہ و تحلیل کی کتنی ہی گہرائیوں میں چلی
جائے وہ صرف واقعات کی فہرست میں اضافہ کر سکتی ہے۔
حتیٰ کہ جب اس نے ایٹم کی بے پناہ طاقت دریافت کی تو یہ

بھی ایک واقعے ہی کی دریافت تھی۔ کیوں کا سوال برابر قائم رہا اور یہ حقیقت گرفت میں نہ آسکی کہ اتنی توانائی ایٹم میں کیوں ہے اور کیوں اتنے ننھے سے ذرے میں ایک مستقل کہ نائی نظام انتہائی صحت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

جب علم و آگہی کا حال یہ ہے تو اونچے درجے کے ارباب فکر نے ٹھیک ہی فیصلہ دیا کہ تسلسل اور امتداد کوئی غیر متبدل قانون نہیں ہے۔ اسباب و علل اپنے اثرات بدل بھی سکتے ہیں۔ سورج اور چاند کی گردشوں، سیاروں کی رفتاروں، اور کروڑوں قوانین طبیعیہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسکے ناقابل تغیر اور دائمی طور پر اٹل ہونے کی کوئی قطعی دلیل موجود ہو۔ حالانکہ یہ قوانین مدت دراز سے کارفرما چلے آرہے ہیں۔

انسان عورت اور مرد کے نطفے کے اختلاط سے پیدا ہوتا ہے۔ آغازِ عالم سے اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہوتا آرہا ہے۔ اور توقع یہی ہے کہ آگے کو بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا لیکن یہی کوئی سائنٹفک دلیل انسان دریافت نہیں کر سکا ہے یہ قطعی فیصلہ کردے کہ انسانی پیدائش کا کوئی اور طریقہ ممکن نہیں ہے۔ اس طرح کی دلیل میسر بھی کیسے آسکتی ہے جبکہ عقل آخر کار اس پر مجبور ہے کہ ابتدا میں ایک انسان مانے جو مذکورہ طریقے پر پیدا نہ ہوا ہو۔ دنیا کی عمر چاہے کھربوں سال کی تسلیم کرلی جائے اور بشر کی پیدائش کا آغاز کبھی بھی ہوا ہو بہرحال انسانِ اول کے تصور سے مفر نہیں۔ اولاً جب ایک بھی فردِ بشر مرد و زن کے نطفوں کی آمیزش کے بغیر کسی اور طرح پیدا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ ایسے واقعے اور واردات کو محال قرار دیدیا جائے۔ مسلمان اسی لئے پورے ذہنی و قلبی اطمینان کے ساتھ یہ مانتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کا کوئی باپ نہیں تھا اور ان کی صدیقہ ماں مریم علیہا السلام کے بطن سے وہ اگرچہ تولد ہوئے مگر انکی صدیقہ ماں کے نطفے میں کسی مرد کے نطفے کی آمیزش نہیں ہوئی تھی اور یہ ماننے میں بھی مسلمانوں کو کوئی تامل نہیں کہ حضرت حوا علیہا السلام کی اونٹنی ماں اور باپ کے بغیر پیدا ہوئی اور نوعِ بشر کا فردِ اول آدمؑ بھی ماں اور باپ کے بغیر ہی پیدا ہوا۔

خیر سے مسلمانوں میں بھی ایسے کج فکر پائے جاتے ہیں جنھیں یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوگئے۔ وہ نہایت رکیک اور جہل قسم کی تاویلات گھڑتے ہیں اور تمنّا کرتے ہیں کہ دوسرے مسلمان بھی انکی تاویلات قبول کرکے مغرب کے سامنے سرخ رو ہوجائیں۔ اس کج فکری کے پیچھے بھی دراصل وہی قانونِ تسلسل کارفرما ہے جو مسترد ہوچکا۔ جس کی کوئی سائنٹفک حقیقت نہیں تھی۔۔ آنکھ والے مسلمانوں نے تو اس استرداد کو بے شمار مرتبہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں اور اولیائے کرام کی کرامات میں سر کی آنکھوں سے دیکھا اور مانا۔ معراج جیسے عجیب واقعے کو وہ اسی لئے تہہ دل سے مانتے بلکہ اس پر ایمانِ کامل رکھتے ہیں کہ یہ خلافِ عقل نہیں ہے۔ خلافِ امکان نہیں ہے۔ سائنس کا کوئی بھی سائنٹفک نظریہ اسکی نفی نہیں کر سکتا۔ علّت اور معلول یا سبب اور مسبب کے درمیان جو بھی رشتہ ہے وہ ایک بالاتر ہستی کا ایجاد کردہ ہے۔ وضع کردہ ہے۔ اختراع کردہ ہے۔ وہی ہستی ہردم اس پر بھی یقیناً قادر ہے ـــــ اور لازماً ہونی چاہیئے کہ اس رشتے کو معطل یا منقلب کرکے دوسرا کوئی رشتہ پیدا کردے۔ آگ جلاتی ہے۔ یہ آگ اور جلنے کا رشتہ یقیناً ایک قانونِ مسلسل کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے لیکن یہی آگ ایک معلوم و معروف انسان ابراہیمؑ کو نہیں جلاتی رشتہ معطل ہوجاتا ہے۔ قانون بدل جاتا ہے۔ اسمیں خلافِ عقل کیا ہے۔ آگ کو جلانے کی خاصیت جس نے دی وہ کیوں قادر نہ ہوگا کہ اس خاصیت کو معطل کردے۔ سائنس کے پاس سوائے طویل تجربے اور مشاہدے کے اس کی کوئی قطعی دلیل نہیں کہ آگ کو بہرحال جلانا ہی چاہیئے۔ دلیل اسلئے نہیں کہ اس کا علم صرف اس واقعے کی اطلاع تک محدود ہے کہ فلاں فلاں کیمیاوی عناصر شعلہ پیدا کردیتے ہیں۔ لیکن کیوں کردیتے ہیں۔ ان میں یہ خاصیت کس لئے ہے۔

اس کا کوئی جواب وہ نہ پاسکی۔ نہ پاسکے گی الّا یہ کہ ایک بالاتر ذہن اور قوتِ قاہرہ کو تسلیم کرلے جو خالق بھی ہے۔ منصرم بھی۔ بدیع بھی۔ آمرِ مطلق بھی۔ قادرِ کُل بھی۔ یہی وہ واحد حقیقت ہے جسے مان کر لایعنی توجیہات اور بے یقینی اور گمان وو سواس کی دلدل سے نکلا جاسکتا ہے ورنہ الحاد کے نصیب میں بھٹکنے کے سوا کچھ نہیں۔

کُل کی عبارت کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ وہ زندگی کو دو بنیادی قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ سادہ اور پیچ دار۔ اس کا خیال ہے کہ پہلے سادہ اقسام پیدا ہوئیں پھر حیرت انگیز جو آج نظر آرہی ہیں۔

یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو زندگی کو ایک مستقل بالذات شے نہ مانتا ہو بلکہ اسے محض ایک ایسی چیز سمجھتا ہو جو مفردات کی خاص ترکیب و ترتیب سے ظہور میں آجاتی ہے۔ اسی فہم ناقص کا ترجمان ہماری زبان کا ایک مشہور شعر ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا

ظاہر ہے کہ ایک شاعر غریب کے نقصِ فہم پر کیا حیرت کی جائے جب کُل اور تھمپسن اور مینڈر جیسے ماہرین فن اور ائمہ فکر غلط فہمی کے اس بھنور سے نہ نکل سکے کہ زندگی فقط ایک ٹیکنیکل شے ہے جسے کسی قسم کے میکنزم ہی کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔

غنیمت ہے کہ ترقی یافتہ سائنس نے تجزیہ و تحلیل کے ذریعہ وہ خلیے بھی دریافت کرلئے جو کسی جاندار وجود کی بنیادی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور وہ تمام کیمیاوی اور مادّی اجزا بھی معلوم کرلئے جن سے ہر جاندار کا ڈھانچا تیار ہوتا ہے۔ پھر یہ کوشش بھی کرکے دیکھ لی کہ خارج سے ان اجزاء کو سمیٹ کر اسی ترتیب سے جمع کردے جس ترتیب سے وہ جاندار جسموں میں پائے جارہے ہیں۔ لیکن زندگی پیدا نہ ہوئی۔ حالانکہ زندگی اگر واقعی تکنیکی شے ہوتی اور جسموں سے ہٹ کر کوئی مستقل وجود نہ رکھتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ سائنس کی یہ کارگذاری ناکامی کا منہ دیکھتی۔ اس ناکامی سے آخر اس کے سوا کیا ثابت ہوتا ہے کہ زندگی نہ عناصر کی ترتیب سے نکلتی ہے نہ کسی مشینی میکانکی سے۔ وہ تو اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے جسے پیدا کرنا سائنس کے بس کا روگ نہیں۔

جب امر واقعہ یہ ہے تو یہ تخیل آپ سے آپ مسترد ہوجاتا ہے کہ پہلے زندگی کی سادہ اقسام ظہور میں آئیں پھر پیچدار اور حیرت ناک۔ یہ فرق و امتیاز اور یہ تقسیم درحقیقت زندگی کی نہیں بلکہ مظاہر کی ہے۔ بہت کم اعضا والے ننھے جرثومے اگر سادگی کی مثال مان لئے جائیں اور کثیر اعضاء والے یا کثیر صلاحیتوں والے جاندار (مثلاً انسان۔ درندے وغیرہ) پیچیدگی کی مثال قرار دیئے جائیں تو یہ فرق جسمانی مشینری کا ہوگا نہ کہ اُس زندگی کا جو ان مشینریوں میں جاری وساری ہے۔ موٹر بھی پٹرول سے چلتا ہے جسکی مشینری نسبتاً سادہ ہے اور جیٹ طیارے بھی پٹرول ہی سے چلتے ہیں جن کی ساخت بے حد پیچدار ہے۔ یہ فرق مشینری اور میکنزم کا ہوا نہ کہ پٹرول کا۔ پھر پٹرول کو بھی آپ بہت سی قسموں میں تقسیم کردیں تو یہ ایک مادّی شے کی تقسیم ہوگی نہ کہ اُس قوت محرّکہ اور توانائی کی جو ہر طرح کے ایندھن میں جاری وساری ہے۔

اسی طرح زندگی ایک قوتِ محرکہ ہے جو سادہ اور پیچیدہ اجسام میں یکساں طور پر کام کررہی ہے۔ اجسام کی کارکردگی اور افعال کی نوعیت اور جنبش و حرکت کے دوائر کا تعلق کل پرزوں کے فرق سے ہے نہ کہ زندگی سے۔ ایک مشین صرف کپڑا سیتی ہے اور دوسری کپڑا بُنتی ہے۔ دونوں کا پہیہ برقی طاقت سے چل رہا ہے۔ دونوں مشینوں کا فرق جسمانی بناوٹ پر مبنی ہے نہ کہ برقی طاقت کے فرق پر۔

اسی طرح آج کے حیرت ناک زندہ جسموں میں اور ابتدائے آفرینش کے مفروضہ سادہ جانداروں میں نفسِ زندگی کے اعتبار سے کوئی ایسا فرق نہیں جسے ارتقا کی تمثیل میں پیش کیا جاسکے۔

زندگی کا ارتقائی شے ہونا اٹکل کا تیر ہے جس کے حق میں معمولی سی دلیل بھی نہیں پائی جاتی۔ نظریۂ ارتقاء کی بہت بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ جسمانی ارتقاء کے ذریعے فلسفۂ حیات کی توجیہہ کرنا چاہتا ہے حالانکہ حیات جسموں کے تابع نہیں نہ اجزاء و عناصر کی ترتیب یا الٹ پلٹ کا ثمرہ ہے بلکہ اسی طرح ایک مستقل بالذات شے ہے جس طرح بے جان مشینوں میں برقی رو دوڑائی جاتی ہے۔ یہ رو مشینوں سے الگ ایک شے ہے اور اس شے کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے مختلف قسم کی مشینوں کے کل پرزوں پر مغز زنی کرنا صریحاً ایک بے نتیجہ شغل ہوگا۔

محترم وحید الدین خاں صاحب نے نظریۂ ارتقاء والوں کے دلائل شرح و بسط سے بیان کرنے کے بعد ان پر جو ریمارک دیا ہے وہ بھی بہت جاندار ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کچھ مفروضات کچھ قیاسات و قرائن اور کچھ منطقی دراست کے مجموعے کو حامیانِ ارتقاء نے دلائل و حقائق کا نام دیدیا ہے ورنہ کوئی مشاہدہ یا حسی تجربہ یا تجزیاتی برہان سائنس کے پاس ڈارونی نظریہ کے حق میں موجود نہیں ہے۔ وہ ایسا بھی کوئی استدلال ابھی تک مہیا نہیں کر سکی جیسا کشش اور قوتِ جاذبہ کے حق میں مہیا ہو سکا ہے حالانکہ یہ استدلال بھی کافی شافی نہیں ہے۔ کشش کیا ہے؟ ایک ذہنی مفروضہ۔ ایک اسم جس کا کوئی حسی مسمیٰ خارج میں موجود نہیں۔ زمین ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ پھل پک کر آپ سے آپ زمین پر آ رہتے ہیں۔ اچھالا ہوا پتھر نیچے ہی لوٹ آتا ہے۔ یہ محض واقعات ہیں جن کا مشاہدہ چشمِ انسانی کر رہی ہے۔ ایسے دس ارب واقعات بھی کشش اور قوتِ جاذبہ کی حقیقت سے نقاب نہیں اٹھاتے بلکہ محض ایک تصور، ایک معنی و مفہوم اور ایک خیال دیتے ہیں جسے بے جان الفاظ میں ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ کیوں کا سوال اپنی جگہ قائم ہے۔ کوئی بھی آلہ کشش کو جملہ متعلقات سے الگ کر کے ایک مستقل بالذات شے کی صورت میں نہیں دکھلا سکا۔ یہی حال انرجی اور قوت کا ہے۔ اس کے صرف مظاہر تجربات کی گرفت میں آسکے ہیں اور تمام ایجادات مظاہر ہی کے قبیل سے ہیں۔ یہ دعویٰ کرنا ابھی تک خارج از بحث ہی ہے کہ سائنس نے کشش یا انرجی کی حقیقت کو پالیا۔

پھر بھلا زندگی کی حقیقت کو پالینے کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ ہر دوسری شے سے زیادہ لطیف اور پہلودار ہے۔ احساس، شعور، ادراک، اخذ و استنباط کی صلاحیت، اختیار و قدرت اور ارادہ و نیت، یہ اوصاف بھلا کشش یا انرجی میں کہاں۔ یہ اوصاف زندگی ہی سے مخصوص ہیں لہٰذا خالی قیاسات و مفروضات سے اس کی حقیقت تک پہنچنا خارج از بحث ہے۔

اب آیئے ایک اور رُخ سے تفکر کریں۔

جتنے اقتباسات مضمون میں پیش ہوئے ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نظریۂ ارتقاء ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکا ہے، تمام معقولیت پسند مفکرین اور سائنٹسٹ اس کے اثباتی دلائل سے مطمئن ہو چکے ہیں اور اب ایسے کسی نظریہ کی گنجائش نہیں رہی جو اس سے متصادم اور مختلف ہو۔

لیکن الجمعیۃ ہی سے ہم ایک طویل "خبر" نقل کرتے ہیں جس کی تمہید میں لکھا گیا ہے۔

> "حال میں بعض اول درجے کے سائنس دانوں نے کہا ہے کہ زندہ اجسام کی ترکیب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمینی اجزاء کا انعکاس نہیں پایا جاتا۔ مثلاً مولب ڈینم جو انتہائی کمیاب دھات ہے وہ زندہ اجسام کی ترکیب کے لئے انتہائی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ زندگی زمین پر پیدا نہیں ہوئی بلکہ بیرونی خلا کی کسی ترقی یافتہ تہذیب نے اس کو یہاں بھیجا ہے۔"

اصل خبر درج ذیل ہے جس کا انگریزی متن بھی ساتھ ساتھ شائع کیا گیا ہے:-

ترجمہ

"زمین پر زندگی کیسے شروع ہوئی۔ اس کے بارے میں حال ہی میں ایک چونکا دینے والا نظریہ سامنے آیا ہے۔ اس نظریہ کو پیش کرنے والے دو ممتاز مالیکولر بیالوجسٹ ہیں۔ ایک نوبل انعام یافتہ فرانسس کریک (FRANCIS CRICK) دوسرے لزلی آرگل (LESLIE ORGEL) اس نظریہ کے مطابق زمین پر زندگی کا آغاز نہ تو خود بخود ہوا اور نہ اس طرح کہ کچھ ملین سال پہلے ایک ابتدائی مادہ سے ایک جسم حیوانی (ORGANISM) بنا اور اس سے تدریجی ارتقاء کے ذریعہ زندگی کی انواع وجود میں آئیں۔ بلکہ زندگی ایک ایسے تجربہ کا نتیجہ تھی جو کچھ غیر ارضی ہستیوں نے کئی جگہ پہلے منظم کیا تھا۔

کریک اور آرگل، یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہمارے کہکشانی نظام کے دوسرے سیاروں میں ترقی یافتہ تہذیبیں موجود ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ اس قسم کے کسی سیارے کے باشندوں نے کچھ ہزار ملین سال پہلے طے کیا کہ وہ اس بات کا تجربہ کریں کہ کیا ان کے پڑوسی سیاروں میں زندگی کے لئے نیا ماحول پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ہماری کہکشاں کے کچھ سیاروں پر زندگی کے جراثیم ڈالے۔ اسی قدیم تجربہ کا نتیجہ ہماری موجودہ تہذیب ہے۔

انیسویں صدی میں ڈارون کے نظریہ کے بعد بائبل کا مخصوص تخلیق کا نظریہ اہلِ علم کے درمیان ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سائنس داں اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں سرگرداں تھے کہ زندگی شروع کس طرح ہوئی۔ اس بحث کے دوران سویڈن کے کیمسٹ ارینیس (S. ARRHENIUS) نے انیسویں صدی کے آخر میں یہ تخیل پیش کیا کہ کچھ بیکٹیریائی اجزا جو کسی ایسے سیارے سے جہاں پہلے سے زندگی موجود تھی زمین پر آگئے اور پھر تدریجی ارتقاء کے ذریعے اقسامِ حیات کو وجود میں لانے کا سبب بنے۔ ارینیس نے اس طریقِ عمل کو "پینس پرمیا" کا نام دیا۔ اس نظریہ کو اس تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ بیکٹیریا بین سیاراتی سفر میں خطرناک ریڈائیشن کے مقابلے میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ لارڈ کلوین (KELVIN) نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ بیکٹیریا شہابیے سے چپک گیا ہو اور اس پر سوار ہو کر زمین پر آیا ہو۔

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ بیکٹیریائی اجزا اور شہابئے پر سوار بین سیاراتی سفر کریں۔ تاہم پینس پرمیا کا نظریہ کبھی سائنس دانوں کے لئے قابلِ قبول نہ ہو سکا تھا۔ اس نظریہ کا اساسی مقدمہ یہ ہے کہ زندگی اس سے پہلے کہیں موجود تھی جبکہ اس نظریہ میں اس کا جواب نہیں ملتا کہ دوسرے سیارے پر زندگی کیسے وجود میں آئی۔

کریک اور آرگل، یہ مانتے ہوئے کہ بیکٹیریائی اجزاء کی ارتقائی ہجرت ناممکن ہے۔ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں یہ قابلِ قیاس ہے جب کہ یہ مانا جائے کہ کسی نے بالقصد زندگی کے جراثیم کو زمین پر بھیجا ہو۔ وہ اس عمل کو (DIRECTED PANSPERMIA) کہتے ہیں۔

اس نئے نظریہ کے ثبوت میں کریک اور آرگل دو حیاتی مسئلوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک جینیٹک کوڈ ہے ہر ایک موجودہ زمانے میں تسلیم کرتا ہے کہ زمین پر زندگی کی تمام قسموں کے لئے صرف ایک کوڈ ہے کوئی حیاتی عالم اس عالمگیریت کی توجیہہ نہیں کر سکتا کہ سب کے لئے ایک ہی کوڈ کیوں ہے۔ آرگل اور کریک کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیات کا ایک ہی بیج تھا جس سے زندگی شروع ہوئی اس لئے فطری طور پر اس بیج کا جینٹک کوڈ، جو کئی جگہ پہلے کسی دوسرے سیارے کے باشندوں نے زمین پر بھیجا تھا اپنا اعادہ ایک ہی جینٹک کوڈ کی شکل میں کرتا رہا۔

دوسری چیز مولب ڈینم (MOLYBDENUM) نامی دھات کا رول ہے جو حیاتیاتی نظام میں پایا جاتا ہے اکثر انزائم سسٹم اپنی کارکردگی کے لئے اس کے اور صرف اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ مولب ڈینم اتنا غیر معمولی طور پر اہم ہونے کے باوجود زمین میں پائی جانے والی کل دھاتوں

کا صرف ۰٫۰۲ فی صد (دس ہزار میں دو) ہے۔ دوسری طرف بعض اور دھاتیں مثلاً کرومیم اور نکل، جو کہ اپنی خاصیت میں مولب ڈینم سے بہت مشابہ ہوتی ہیں اور زمینی دھاتوں کا ۰٫۲ فیصد اور ۰٫۱۶ر۳ فی صد ہیں حیاتیاتی نظام میں بالکل ہی کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ کریک اور آرگل کہتے ہیں کہ زمین کی جو کیمیائی ترکیب ہے، وہ زمین پر وجود میں آنے والی زندگیوں کی بناوٹ میں منعکس ہونی چاہئے تھی۔ اور چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے ماننا پڑیگا کہ زندگی کچھ ملین سال پہلے زمین پر باہر سے بھیجی گئی تھی۔

اگر "ڈائرکٹڈ پینس پرمیا" کا نظریہ مان لیا جائے تو اس سے دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) کیا کائناتی وقت اتنا کافی ہے کہ اس کے اندر دو تہذیبیں ایک کے بعد ایک ترقی کر سکیں۔ ایک زمین پر اور دوسری کسی اور سیارہ میں (۲) کیا حیاتیاتی جرثومہ بین سیاراتی فاصلوں کو عبور کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ زندہ حالت میں پہنچایا جا سکتا ہے۔

کریک اور آرگل کا خیال ہے کہ ان کا نظریہ قبولیت حاصل کرے گا، اگر یہ دکھایا جا سکے کہ وہ عناصر جو زمینی زندگی کے اجزاء ترکیبی ہیں وہ وہی ہیں جو بعض قسم کے ستاروں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔" (اقتباس ختم ہوا)

اب فرمائیے۔ کہاں گیا وہ دعویٰ کہ ڈاروِنی نظریۂ ارتقاء حقیقتِ ثابتہ ہے۔ فیکٹ ہے۔ سائنسی صداقت ہے ارباب فکر و فن اس پر متفق ہو چکے ہیں۔ اس کا منکر جاہل متعصب اور وہم پرست ہے۔

اگر واقعۃً فیصلہ کن دلائل مہیا ہو چکے ہوتے تو اس کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا تھا کہ سائنس داں پھر بھی مغز پاشی کئے جائیں اور برابر ریسرچ جاری رہے کہ زندگی کیسے، کب کہاں پیدا ہوئی۔ یہ ریسرچ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ عضویاتی ارتقاء کے نام نہاد فلسفے کو حرفِ آخر نہیں مانا گیا اور ڈاروِنی نظریۂ ارتقاء کو مسلّمات میں جگہ نہیں دی گئی۔

پھر ملاحظہ فرمایئے کہ اس خبر میں دو ماہرین فن کی طرف سے جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ کس صفائی کے ساتھ نام نہاد نظریۂ ارتقاء کی تکذیب و تردید کرتا ہے۔ یہ نیا نظریہ کس حد تک قابلِ قبول ہے اس سے بحث نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی قیاس و تخمین ہی کے قبیل سے ہے تاہم اس سے یہ تو واضح ہو ہی گیا کہ ڈاروِنی نظریۂ ارتقاء کی تحسین و تائید میں جتنے بھی قصیدے پڑھے گئے ہیں وہ درباری قصائد سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ صرف پروازِ تخیل کے نمونے ہیں حقائق کے ترجمان نہیں۔ انھیں سائنس کی بارگاہ میں کوئی قدر و قیمت میسر نہیں ہو سکی۔

ویسے جو بنیادی خامی نظریۂ ارتقاء میں تھی وہی اس تازہ نظریہ میں بھی جوں کی توں موجود ہے۔ وہی تصور یہ خالق کی نفی اور کسی مافوق ہستی کی تسلیم سے گریز۔ غنیمت ہے یہ نظریہ زمین کے خاکدان سے نکل کر آسمان تک تو پہنچا۔ وحی کی اطلاع یہی ہے کہ زندگی کا تعلق صرف زمین سے نہیں اوپر سے بھی ہے۔ کم سے کم انسان کو تو اوپر ہی پیدا کیا گیا۔ مگر وحی اور اس نظریہ کی یہ مشابہت کچھ زیادہ وسیع نہیں کیونکہ جو اعتراضات نظریۂ ارتقاء پر واقع ہوتے تھے وہی اس نئے نظریہ پر بھی واقع ہو سکتے ہیں۔ کوئی بھی نظریہ تشفی عطا نہیں کر سکتا جب تک کہ ایک قادرِ مطلق صانع، مدبر، مخترع، بدیع اور حکمراں کا وجود نہ مان لیا جائے۔ زندگی اگر زمین پر کسی اور سیارے سے بھی آئی ہو تو یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ وہاں کیوں اور کیونکر وجود پذیر ہوئی۔ غیر ارضی ہستیاں فرض کر لینا تو آسان ہے۔ انسان قرنوں سے دیوی دیوتا اور نہ جانے کیا کیا فرض کرتا آیا ہے لیکن اس طرح کے مفروضے حیات و کائنات کی توجیہہ نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود توجیہہ طلب ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ مسلمانوں میں اگر اب بھی کچھ مفکرین ایسے پائے جاتے ہیں جو سنجیدگی کے ساتھ ڈاروِنی نظریۂ ارتقاء کے مؤید ہیں اور اسے ایک سائنسی صداقت تصور کرتے ہیں تو انھیں پہلی فرصت میں لاحول پڑھنی چاہئے۔ قرآن اپنی جگہ

اٹل ہے۔ پہاڑوں سے زیادہ قوی النبیان اور کائنات کے مجموعی وزن سے زیادہ وزن دار۔ اس میں جو کچھ محکم اور صریح الفاظ میں کہہ دیا گیا وہ آخری سچائی اور واحد حقیقت ہے۔ سائنس اس کی شارح ہے نہ کہ اس پر قاضی۔ قرآن اور سائنس میں کوئی ٹکر نہیں۔ تخالف اور منافاۃ نہیں۔ جھگڑا نہیں۔ عداوت نہیں۔ مگر سائنس اور سائنس دانوں کے اندازِ فکر کو ایک نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ سائنس اپنی مجرد حیثیت میں محترم بھی ہے۔ عظیم بالشان بھی۔ قابلِ قدر بھی کیونکہ وہ اسی خالق و مالک کے تکوینی اسرار اور تخلیقی کارناموں کی نقاب کشائی کرتی ہے جس کے کلامِ پاک کو قرآنِ حکیم اور فرقانِ مجید کہا جاتا ہے — دو صداقتیں کبھی ایک دوسرے کی ضد اور نقیض نہیں ہوا کرتیں سائنس صداقت ہی کا ایک فنی مظہر ہے بشرطیکہ اس میں انسانی عقل کا فتور اور بشری کمزوریوں کا دست شامل نہ ہو جائے۔ بشرطیکہ آدمی کا ذاتی میلان ورجحان اسے غلط سمت میں کھینچ لے جائے اور قرآن تو عینِ صداقت ہے ہی۔ ایسی صداقت جو دنیا کی مختصر زندگی ہی کے لئے نہیں موت کے بعد والی طویل ولامحدود زندگی کے لئے بھی مشعلِ راہ ہے۔ بدنصیب ہیں وہ مسلمان جو تھوڑی سی سائنس، تھوڑا سا فلسفہ اور تھوڑی سی منطق پڑھ کر خود کو سقراطِ زماں تصور کرنے لگتے ہیں اور بلاتکلف ان کا دستِ گستاخ قرآن کے بیان تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ انھیں بڑا ناگوار ہوتا ہے کہ قرآن میں اللہ میاں ایک مٹی کا پتلا بنا رہا ہے اور اس میں جان ڈالی جارہی ہے۔ انھیں کوفت ہوتی ہے کہ لو عیسٰی بغیر باپ ہی کے پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ کڑھتے ہیں کہ ابراہیم آگ میں پڑے اور جلے نہیں، ان میں انقباض پیدا ہوتا ہے کہ رسولؐ کو بغیر ہوائی جہاز ہی کے مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ پہنچایا جا رہا ہے۔ اپنی کیفیات کا اظہار وہ کھلا تو کر نہیں سکتے کہ قرآن کی تکذیب انھیں ملت سے خارج کردے گی مگر تاویلاتِ رکیکہ اور توجیہاتِ فاسدہ سے باز نہیں چھوڑتے۔ یہ تک ان کے حلق سے نہیں اترتا کہ خدا کسی بندے کو زندہ آسمان پر اٹھا سکتا ہے اور کسی بندے کو پل کے پل میں آسمانوں کی سیر کرا سکتا ہے۔

کاش وہ مادہ پرستی کے بھنور سے نکلیں —— اور ائمہ سائنس کے ذاتی میلانات ونظریات کی تقلیدِ جامد سے پرہیز کریں۔

اچھی کتابیں

نفاق کیا ہے؟ علامہ ابن قیمؒ	۷۵/-
روحِ توحید حسن البنا شہید	۹۰/-
عبقات اردو اسمٰعیل شہیدؒ	۱۵/-
راہِ عمل (انتخاب حدیث)	۹/۴۰
فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔	۱۰/-
الترغیب والترہیب اردو۔	۱۲/۰
تاریخ ادبیات ایران	۱۱/۰
تاریخ گجرات	۹/-
تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر	۱۰/-
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	۵/-
حیات ڈاکٹر ذاکر حسینؒ	۸/-
خلافتِ راشدہ اور ہندوستان	۸/-
دینِ الٰہی کا تاریخی پس منظر	۷/-
شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات	۸/-
قرآن اور تصوف	۴/-
قصص القرآن مکمل غیر مجلد ۳۷/- مجلد	۴۷/-
لغات القرآن مکمل " ۴۶/- مجلد	۵۸/-
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں	۷/-

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

مولانا مودودی اور تصوف کہا جاتا ہے کہ مولانا مودودی تصوف کے دشمن ہیں اس الزام کی پوست کندہ حقیقت خود مولانا کی تحریروں کے آئینہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ مولانا کس تصوف کے دشمن اور کس کے حامی ہیں۔ مجلد ڈھائی روپے ۲/۵۰

روح تصوف مولانا اشرف علیؒ کی مشہور کتاب جس کا ترجمہ مفتی محمد شفیع صاحب نے کیا ہے۔ تصوف سے متعلق تمام گوشوں پر محققانہ گفتگو، اخلاقی تعلیمات، آداب وغیرہ اصلی اور جاہلانہ تصوف کا فرق۔

قیمت مجلد تین روپے ۷۵ پیسے۔

تاریخ الفخری تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب جس کا ترجمہ اردو، فارسی اور فرنچ زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اردو ترجمہ حاضر ہے۔ قیمت ـــــ گیارہ روپے

سفر مصر و حجاز امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کے قلم سے ایک بصیرت افروز معلومات افزا سفرنامہ۔ قیمت ـــــ ڈھائی روپے ۲/۵۰

جائزہ تراجم قرآنی دنیا میں کب اور کس زبان میں قرآن کے تراجم ہوئے۔ اس کی تحقیق و تفصیل مترجمین اور شارحین کے نام۔ بہت عمدہ اور معلومات افزا کتاب ہے۔

قیمت مجلد ـــــ چھ روپے ۶/-

آنکھوں کی ٹھنڈک اللہ کے سوا کوئی حاضر و ناظر نہیں جو مسلمان اس غلط خیال کا شکار ہیں کہ رسول اللہ بھی حاضر و ناظر ہیں۔ ان کے خیال کی مدلل تردید قرآن و حدیث کے روشن دلائل۔ فقہاء و مجتہدین کے مستند حوالے

قیمت مجلد ـــــ سات روپے

مناجات مقبول (کوچی) عکسی مولانا اشرف علیؒ کی مقبول عام اور مفید ترین کتاب پرانے اور نئے اضافوں کے ساتھ۔ قیمت مجلد چھ روپے ۶/-

رمضان کیا ہے؟ مولفہ محمد عبد اللہ دہلویؒ کے رشحات قلم۔ رمضان کے موضوع پر خوب تر کتاب

قیمت مجلد ـــــ تین روپے ۳/-

تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی میں دین کی تبلیغ و تعلیم کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسجدیں، راستے، مکانات، بازار کہیں بھی ہوں مسلمان بنے رہے۔ دنیا کے کاروبار نے انھیں دین سے غافل نہیں کیا۔ از۔ قاضی اطہر مبارک پوری۔

قیمت ـــــ ڈیڑھ روپیہ

تلاش راہ حق خطوط کی زبان میں ایک روداد۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ مولانا اشرف علیؒ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا منظور نعمانی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، میاں طفیل احمد اور چودھری علی احمد

قیمت ـــــ ڈھائی روپے

التشرف احادیث تصوف کی معرفت مولانا اشرف علیؒ کی معروف کتاب۔ قیمت۔ پندرہ روپے

مکتوبات خواجہ معصوم سرہندیؒ معارف و اسرار ہدایت و نصائح اور نکات و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ کی بہترین چیز۔ قیمت ـــــ پانچ روپے پچاس پیسے

آپ حج کیسے کریں؟ مولانا منظور نعمانی کی معروف کتاب۔

قیمت ـــــ دو روپے ۲/-

امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات میں مولانا تقی امینی کی ایک تازہ تصنیف انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں حضرت عمرؓ کے اصلاحی فرمودات و اقدامات، دوررس حکمتوں سے لبریز

قیمت ـــــ دو روپے

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یوپی)

"جوابِ تبصرہ" پر ایک نظر

دسمبر ۷۳ء کے ڈاک نمبر میں "زلزلہ" نامی کتاب پر
رہ کیا گیا تھا۔ یہ کتاب بریلوی مکتبِ فکر کے ایک ممتاز
ن جناب ارشد القادری صاحب کی تصنیف ہے۔ اس میں
ہوں نے یہ دکھلایا ہے کہ جن امور و عقائد کو دیوبندی
ہرات عام طور پر شرک و بدعت قرار دیتے آئے ہیں
خود ان کے یہاں بکثرت موجود ہیں۔ اپنی روش کے
ابق اس پر ہم نے بے لاگ تبصرہ کیا اور بحیثیتِ مجموعی
ا کی تحسین و تائید ہوئی۔ یہ روش فاضل مصنف اور
ر دوسرے بریلوی حضرات کے لئے تحیر آمیز مسرت
باعث ہونی ہی چاہیئے تھی۔ تحیر اس لئے کہ ہم بھی
حلقۂ دیوبند ہی میں شامل ہیں اور آج کل ایسی صدق
ی اور انصاف پروری کا وجود عنقا ہے جو اپنے ہی خلاف
ے۔ لوگ ہر حال میں اپنے فرقے اور حلقے کا پارٹ
ہیں چاہے ان کے دامن پر خونِ انصاف کے کتنے ہی چھینٹے
ل نہ آ جائیں۔

تبصرہ پڑھ کر موصوف نے ہمیں ایک طویل گرامی نامہ
لکھا۔ اس کے چند ابتدائی فقرے یہ تھے:۔

"جس فراخ دلی کے ساتھ آپ نے میری کتاب کے
ساتھ اعتناء فرمایا ہے اس کے لئے میری طرف سے
پُر خلوص شکریہ قبول فرمائیے۔"

اور — "اپنی جماعت کے "محفوظ مفادات" کے خلاف
قلم اٹھا کر آپ نے انتہائی جرأتمندانہ کردار کا
مظاہرہ کیا ہے۔"

اس حوصلہ افزائی کے بعد انھوں نے ہمارے تبصرے کے
بعض ان حصوں پر تنقید فرمائی تھی جو انھیں پسند نہیں آئے۔
یہ بھی یقین دلایا تھا کہ میں کسی قلمی پیکار کا آغاز نہیں کر رہا
ہوں بلکہ یہ صرف تأثرات ہیں جنھیں نیک نیتی کے ساتھ
سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

پورا مکتوب ہم نے دلچسپی سے پڑھا مگر دلچسپی کے پہلو
بہ پہلو کچھ انقباض بھی چلتا گیا جس کی وجہ اپنے اندازے کی
غلطی کا احساس تھا۔ اندازہ ہم نے یہ لگایا تھا کہ محترم قادری
صاحب سنجیدہ و فہیم اور ذی علم آدمی ہیں لیکن مکتوب سے اس

اندازے کی صحت کا ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ مجبوراً یہ تاویل کرلی کہ مکتوب شاید بھاگ دوڑ میں یا پھر کسی پریشانی کے عالم میں لکھ دیا گیا ہے۔

اخلاقاً جواب تو دے ہی دیا مگر بہت مختصر۔ سمجھے کہ چلو قصہ ختم ہوا۔ مگر بڑا تعجب ہوا یہ دیکھ کر کہ "زلزلہ" کے تازہ ایڈیشن میں موصوف نے نہ صرف ہمارا تبصرہ شامل کردیا بلکہ "جواب تبصرہ" کے عنوان سے اپنا وہی مکتوب بھی شائع فرمادیا ہے جس کے بارے میں ہم یہ گمان بھی نہیں کرسکتے تھے کہ یہ شائع ہونے کے قابل تحریر ہے۔ پھر اس تازہ ایڈیشن کی ایک کاپی ہمیں بھی اس نوٹ کے ساتھ ارسال فرمادی گئی کہ — جواب تبصرہ ملاحظہ کرلیں۔

اس طرز عمل سے تو یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مکتوب ہمارے بھائی نے پوری توجہ کے ساتھ تحریر فرمایا تھا اور ان کی دانست میں یہ وقیع اور عالمانہ نکات و معارف کا گنجینہ ہے۔ ہم اب بھی اس کا نوٹس نہ لیتے اگر یہ خیال محرک نہ بنتا کہ ہمارے تبصرے کی بنا پر "زلزلہ" حلقۂ تجلی میں خاصی متعارف ہوئی اور موصوف کا "جواب تبصرہ" بھی اس حلقے میں پڑھا ہی جائے گا۔ اس میں جو تعریضات ہم پر کی گئی ہیں وہ اگرچہ ایسی نہیں جن کی کمزوری اور بے اساسی کو سوجھ بوجھ والے قارئین خود ہی محسوس نہ کرپائیں لیکن سوجھ بوجھ کی نعمت چونکہ عام نہیں ہے اور برادر موصوف کا اسلوب تحریر بھی ظاہراً خاصا مغالطہ انگیز ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "جواب تبصرہ" کا جائزہ لے ہی لیا جائے اور سادہ لوح بھائیوں کو بتا دیا جائے کہ اس میں جو منطق استعمال کی گئی ہے وہ فی الحقیقت منطق نہیں ہے بلکہ مناظرانہ نوع کا علم کلام ہے جس کی جڑیں علم و منطق میں نہیں بلکہ الفاظ کی الٹ پھیر میں ہیں۔

ہماری عادت قارئین تجلی کو معلوم ہی ہے کہ اشاروں کنایوں میں مجمل باتیں ہمیں پسند نہیں بلکہ شرح و بسط ضروری سمجھتے ہیں تاکہ بات معمولی علم و فہم والے بھی سمجھ لیں۔ اب کا بھی ہونا ہے۔ خدا کرے آپ بدمزا نہ ہوں۔

پہلی بحث

ہم نے لکھا تھا:-

"تصوف کتنا ہی محتاط ہو وہ اپنے ساتھ کشف و کرامت اور تحیرات و تصرفات کے طلسم خانے ضرور لاتا ہے۔"

اس کے سلسلہ میں محترم بھائی نے تجلی مئی ۱۹۶۳ء کا حوالہ دیا ہے — یہ سہو ہے۔ اعتراضاً نہیں اطلاعاً عرض ہے کہ یہ دسمبر ۱۹۶۲ء کی عبارت ہے۔

بہرحال یہ فقرہ شاید سنسکرت یا عبرانی زبان میں تو نہیں کہ اس کی مراد سمجھنے میں ان لوگوں کو دشواری پیش آئے جن کی مادری زبان اُردو ہو، اور تھوڑا سا وہ پڑھ لکھ بھی ہوں۔ اس میں تین لفظ ایسے ہیں جو صاف بتا رہے ہیں کہ [illegible] والا کشف و کرامت کی افراط و بہتات کی طرف اشارہ کر[illegible] ہے۔ تحیرات۔ تصرفات۔ طلسم خانے۔ یہ تینوں غلو او[ر] مبالغہ ظاہر کرنے والے الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ط[نز] تعریض کا نشانہ مجرد کشف و کرامت نہیں بلکہ وہ دفتر دراز ہے جو بازار میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں صداقتیں مشکل سے پانچ فی صد ہوں گی اور باقی پچانوے فی صد طبع زاد کہانیاں۔

مگر فاضل دوست نے ہمارے فقرے کا یہ مطلب [illegible] کہ ہم سرے سے کشف و کرامت ہی کے منکر ہیں اور اس مطلب کو عین ہمارا مطلب قرار دے کر ایک اور عبارت تجلی سے یہ دکھلانے کے لئے نقل کی کہ ہم متضاد باتیں کہنے والے ہیں۔

ہماری وہ عبارت یہ ہے:-

"ہم نہ تو انبیاء علیہم السلام کی لغوی غیب دانی کے انکاری ہیں نہ اولیاء اللہ کے کشف و کرامت کو خالص افسانہ تصور کرتے ہیں بلاشبہ اولیاء اللہ کو صفائے قلب کے نتیجے میں بے شمار مغیبات کا ایسا علم ہوتا ہے جسے شہود کہا جائے تو غلط نہیں اور

ان کی روحانی قوتیں کسی نہ کسی حد تک تصرف کی استعداد بھی رکھتی ہیں۔"

اس عبارت سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب عامر عثمانی اولیاء کے کشف وکرامت کو امرِ واقعہ مانتا ہے اور اُن کے لئے بے شمار مغیبات کا علم اور صلاحیتِ تصرف بھی تسلیم کرتا ہے تو شریعت کا اصل دشمن تو دہی ہوا کیونکہ اس نے اپنی پہلی عبارت میں کشف وکرامت کو خالی افسانہ کہا ہے۔

مزید زور انھوں نے یہ جتلا کر پیدا کیا کہ عامر عثمانی قرآن وسنت کو معیار مانتا ہے تو کشف وکرامت اور تصرفات وغیرہ کو تسلیم کرنا یقیناً قرآن وسنت کے مطابق ہی ہوگا لہذا کشف وکرامت والا تصوف عین مطلوب شریعت ہوا اور تصوف کی تحقیر وتنقیص کرکے اس نالائق نے شریعت کی توہین وتخفیف کی۔

یہ ہے ہمارے محترم کرم فرما کا علم کلام۔ ایک ہی سانس میں دشمنِ شریعت بھی ثابت کر دیا اور یہ بھی دکھلا دیا کہ ہم تضاد بیانی کا شکار ہو۔

ہم اس نوازشِ عالمانہ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بڑی محبت سے عرض کریں گے کہ اے محترم بھائی! آپ نے بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ الفاظ کا یہ گورکھ دھندا پھیلانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ہماری دونوں عبارتوں میں مطلق تضاد واختلاف نہیں ہے۔ دونوں کی مرادیں اپنی اپنی جگہ بے غبار اور ایک دوسرے سے غیر متصادم ہیں۔

پہلی عبارت مروّجہ تصوف کی نفسیات اور خارج میں موجود صورتِ حال کی طرف مشیر ہے جب کہ دوسری عبارت میں فقط اصولی نقطۂ نظر کا اظہار کیا گیا ہے۔

مروّجہ تصوف کی نفسیات یہ ہے کہ وہ کسی طرح بھی اسلامی شریعت کی سادگی اور معقولیت کے دائرے میں محدود رہنا نہیں چاہتا۔ صوفیاء کو ان کی ریاضتوں کے نتیجے میں کشف وکرامت اور بعض تصرفات کی جو استعداد حاصل ہوتی ہے اسے راز رکھنے کے عوض نمایاں طور پر منکشف کر دیا جاتا ہے اور دانستہ یا نادانستہ تصور یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ اصل ولایت اور خدارسیدگی اور بزرگی کا انحصار حیران کن اوصاف میں ہے نہ کہ شریعت کی سیدھی سادھی پابندی میں۔ چنانچہ کوئی بھی صاحب نظر دیانتداری کے ساتھ تصوف زدہ حلقوں کا سروے کرکے دیکھ لے یہی پائے گا کہ شریعت کی پیروی کی کوئی بڑی قدر وقیمت دلوں میں نہیں بلکہ عجائبات وکرامات ہی کو دلیلِ ولایت اور برہانِ عظمت تصور کر لیا گیا ہے۔ وہ بزرگ ہی کیا جو عجوبے نہ دکھا سکے اور وہ ولی ہی کیا جو مرنے کے بعد اپنی قبر سے فیوض وبرکات کی نہریں نہ بہا سکے۔ پھر چونکہ عقیدت عموماً افسانہ ساز ہوتی ہے اس لئے عقیدت مند حلقے ہر کرامت پر حواشی ضرور چڑھاتے ہیں۔ اضافے ضرور کرتے ہیں لامحالہ یہ کا کبوتر اور رائی کا پہاڑ بنتا چلا جاتا ہے۔

یہی وہ معلوم واقعہ ہے جو ہماری پہلی عبارت کے بین السطور میں صاف نظر آ رہا ہے اور الفاظ اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہاں کشف وکرامت سے بالکلیہ انکار وہی بے راہ کر سکتا ہے جس نے بہر حال تہیہ کر لیا ہو کہ کچھ نہ کچھ پیدا کرکے چھوڑے گا۔

تضاد کا الزام تو صریحاً لغو ہے اور یہ صغریٰ کبریٰ بھی کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ہم اگر کشف وکرامت کے وجود کا اصولی اقرار کریں تو اس سے ثابت ہو کہ یہی چیز شریعت کا مطلوب بھی ہے۔ مطلوبِ شریعت اللہ کی کامل بندگی ہے نہ کہ کرامات وتصرفات کی گرم بازاری۔

دوسری بحث

دوسری عبارت میں ہمارا جو یہ فقرہ ہے:۔

"جزوی معنیٰ میں ہم سب بفرقِ مراتب عالم الغیب ہیں۔"

اس پہ ہمارے محترم بھائی نے اعتراض کیا:۔

"جو لوگ انبیاء واولیاء کے حق میں علم غیب کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی لفظ عالم الغیب کے اطلاق کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں اور غیر خدا پر

اس لفظ کا اطلاق حرام قرار دیتے ہیں لیکن آپ نے مذکورہ بالا عبارت میں نہ صرف یہ کہ بے قید علم غیب کا عقیدہ جملہ مخلوقات کے حق میں تسلیم کر لیا ہے بلکہ لفظ "عالم الغیب" کے اطلاق کی خصوصیت بھی خدا کے ساتھ باقی نہیں رہنے دی۔"

اس اعتراض کی نوعیت سمجھانے کے لئے ہمیں ایک دلچسپ واقعہ سنانا پڑے گا۔ کہیں بریلویوں اور دیوبندیوں میں مناظرہ ہو رہا تھا۔ بچارے دیوبندی مولوی مناظرے کے پینتروں سے واقف نہ تھے مگر دوسرے مولانا اس اکھاڑے کے پرانے پہلوان تھے۔ جب دیوبندی مولوی صاحب اسٹیج پر تشریف لائے تو دوسرے مولانا فوراً کھڑے ہوئے کہ "بھائیو! تقریر تو ان کی بعد میں سننا پہلے میں ایک ایسا سوال ان سے کرنا چاہتا ہوں جس کے جواب سے پتہ چل جائے گا کہ یہ مسلمان بھی ہیں یا نہیں" مجمع بولا واہ واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ دراصل مجمع میں مختلف گوشوں پر دوسرے مولانا صاحب کے ایجنٹ موجود تھے اور واہ واہ اسکیم کے مطابق ہوئی تھی۔ بےچارے دیوبندی مولوی صاحب اس اچانک دخل اندازی سے خاصے پریشان ہوئے۔ خیر۔ دوسرے مولانا نے اب قرأت اور تجوید کے ساتھ کلمۂ طیبہ بلند آواز سے پڑھا۔ لا الٰہ الا اللّٰہ۔ محمد رسول اللّٰہ۔ اور پھر دیوبندی مولوی صاحب سے پوچھا۔۔۔ بتائیے جناب۔ یہ جو میں نے پڑھا کلمہ ہے یا کلام؟

یہ ایک مناظرانہ حربہ تھا۔

دراصل علم النحو میں کلمہ کہتے ہیں فقط ایک لفظ کو جو مفرد ہو۔ جیسے زید۔ لکھنا۔ قلم۔ کتاب۔ یہ ہر لفظ "کلمہ" ہے۔ کئی الفاظ مل کر ایک بامعنی فقرہ بنائیں تو اسے کہتے ہیں کلام۔ جیسے زید آیا۔ قلم کھو گیا۔ کتاب عمدہ ہے۔ اس نحوی اصطلاح کے اعتبار سے ظاہر ہے کلمۂ طیبہ کلام ہے نہ کہ کلمہ مگر آپ جانتے ہی ہیں کہ عام اصطلاح میں اسے "کلمہ" کہا جاتا ہے۔

استعمال کے اس فرق کو بریلوی مولانا صاحب نے جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ دیوبندی مولوی صاحب اگر کلام کہیں گے تو ہم فوراً تالی پیٹ دیں گے کہ دیکھو بھائیو یہ کلمہ کا منکر ہے کلمہ کو کلام کہہ رہا ہے۔ اور اگر کلمہ کہیں گے تو فوراً مذکورہ نحوی قاعدہ بیان کر کے حاضرین کو باور کرائیں گے کہ یہ مولوی صاحب عربی کا ابتدائی قاعدہ تک نہیں جانتے پھر قرآن و حدیث کیا خاک سمجھ سکتے ہیں۔

بچارے دیوبندی مولوی صاحب واقعی شش و پنج میں پڑ گئے۔ ذہن مختل سا ہو گیا۔ بمشکل اس فیصلے پر پہنچے کہ مجھے اپنی علمیت کا ثبوت تو دینا ہی چاہئے۔ فوراً کہا کلام ہے جناب۔ یہ تو کلام ہے۔

بس پھر کیا تھا۔ ہلڑ مچ گیا۔ لینا پکڑنا یہ شیطان تو کلمے تک کا منکر ہے۔ وہابی۔ بدعقیدہ۔ ایمان بگاڑ۔ پھر اگلے روز شاندار خبر چھپی:۔

دیوبندی مناظر کی شکست فاش۔ کلمے تک کا گستاخانہ انکار۔ وغیرہ

تو کم و بیش یہی تکنک ہمارے محترم بھائی نے ہمارے خلاف بھی استعمال کر ڈالی ہے۔ شاید ایسے ہی مواقع کے لئے اقبال نے کہا تھا:۔

الفاظ کے پھندے میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

کسے نہیں معلوم کہ بے شمار الفاظ کا لغوی مفہوم کچھ اور ہوتا ہے اور اصطلاحی کچھ اور۔ آپ کا بیٹا کوئی صریح غلطی کر رہا ہو تو آپ کہتے ہیں "ارے میاں کیا غضب کر رہے ہو" غضب کے معنی لغت میں غصّے کے ملیں گے مگر یہاں آپ جانتے ہی ہیں کہ غصّے کے نہیں بلکہ صریح غلطی کے مفہوم میں استعمال ہو رہا ہے۔

"کریم" اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ہے۔ مگر لغت میں اس کے معنی فیّاض و سخی کے ہیں اور کسی بھی سخی انسان

کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ حتّٰی کہ رزقِ کریم اور کتابِ کریم اور وجہ کریم بھی مستعمل ہے۔ پھر دیکھئے نبی کریم بولا جائے تو آپ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ اللہ کے آخری رسول ؐ کا ذکر ہے حالانکہ بولنے والے نے تصریح نہیں کی اور کریم معنی کے حاظ سے اور بھی ہزاروں انسان ہوئے اور ہوسکتے ہیں۔

اب لفظ عالم الغیب پر توجہ فرمائیے۔ جب بولا جائے کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں تو اصطلاحاً اس کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ غیب کی تمام باتوں کا جاننے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ حالانکہ لفظِ غیب کے لغوی معنی ہیں کوئی بھی ایک چیز جو ہم سے غائب ہو۔ یہ جمع نہیں واحد ہے مگر بھی مذکورہ جملے سے کوئی صحیح الدماغ یہ مطلب نہیں لیتا کہ اللہ کے سوا کوئی کسی ایک بھی غائب چیز کا جاننے والا نہیں ہے۔ عالم الغیب کو علاّمُ الغیوب کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے اور اسی کے اعتبار سے بحث ہوتی ہے۔

اب آپ دیکھئے کہ ہماری منقولہ عبارت میں ابتداءً "لغوی غیب دانی" کے الفاظ موجود ہیں جن سے واضح ہوگیا کہ لفظِ غیب اُس اصلاحی مفہوم میں نہیں بولا جارہا جو "عالم الغیب" سے مخصوص ہیں۔

لطف یہ ہے کہ ہمارے محترم بھائی نے یہاں بھی تلطیف فرمایا:-

"لغوی غیب دانی سے آپ کی کیا مراد ہے اسے
تو آپ ہی بتائیں گے۔"

کیا ہم موصوفِ محترم سے پوچھ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ جاپانی یا عبرانی زبان کا فقرہ ہے جس کا مطلب ہمیں ہی بتانا پڑے گا۔ "لغوی" کا مفہوم تو پرائمری کے بچے بھی سمجھتے ہیں۔ ہمارے محترم دوست اور دینی بھائی کو ضرور معلوم ہوگا کہ لفظِ غیب کے ڈکشنری میں کیا معنی ہیں۔ "دانی" بھی کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا مطلب دریافت کرنے ایران جانا پڑے۔ "دانستن" ذہن سے نکل گیا ہو تب بھی اردو میں نادانی کا لفظ تو عام ہے ہی۔ آخر کون سے ... نے ہماری مراد موصوف کی فہم رسا کے لئے دشوار بنا دی ہے۔

سیدھا سا مطلب تھا جسے ہر شخص ہماری عبارت سے سمجھ سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بعض مغیبات کا جاننے والا تسلیم کیا جارہا ہے نہ کہ تمام مغیبات کا "لغوی" کی قید کا اور کوئی مفہوم ہی نہیں۔ کوئی بھی شخص غیب کی ایک دو باتیں بھی جانے تو لغتہً وہ غیب داں یا عالم الغیب ہے۔

بات سمجھنے ہی کی نہیں دیکھنے کی بھی ہے۔ جس کے منھ پر آنکھیں ہوں وہ بہرحال اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ ہماری عبارت میں غیب دانی کے ساتھ "لغوی" کی اور عالم الغیب کے ساتھ "جزوی معنی" کی قید موجود ہے لیکن پھر بھی ہمارے دوست کس اطمینان سے ارشاد فرمارہے ہیں کہ تم نے بے قید علم غیب کا عقیدہ جملہ مخلوقات کے حق میں تسلیم کرلیا ہے۔

فرمائیے اسے کیا کہیں!

آپ ہی اپنی عنایت پہ نظر فرمائیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

اب ذرا اس اعترض پر بھی نظر فرمالیجئے کہ عامر نالائق نے لفظ عالم الغیب کا اطلاق غیر خدا پر کردیا حالانکہ ایسا کرنا حرام ہے۔

اس کا جواب ہماری اُوپر کی معروضات میں موجود ہے۔ بلا قید و شرط یہ اطلاق نہیں کیا گیا بلکہ جزدی کی قید اور "بفرقِ مراتب" کی تصریح کے ساتھ کیا گیا۔ فرقِ مراتب کا سوال ہی علم غیب کے اُس مفہوم میں پیدا نہیں ہوتا جو اللہ سے مخصوص اور غیر اللہ سے غیر متعلق ہے۔ جملہ مغیبات کا علم جس سے کسی چیز کا استثناء نہیں۔ یہ ہے وہ مفہوم جو ذاتِ باری تک محدود ہے۔ اس مفہوم میں مختلف مرتبے اور درجے کہاں۔ نہ اسے جزدی کہہ سکتے ہیں۔ پھر اعتراض کیسا۔

جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے ایک ہی لفظ مختلف مواقع پر مختلف مفاہیم دیتا ہے۔ مثالیں تو ہزاروں ہیں۔ ہم دو قرآنی مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

اللہ نے فرمایا ــــ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (مزمل)

(اللہ کو قرض حسنہ دو)

اور فرمایا ـــــ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ۔ قتال (اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمھاری مدد کرے گا)

قرض کسے کہتے ہیں آپ بھی جانتے ہیں۔ قرض وہ شخص لیتا ہے جو ضرورت مند ہو اور اس کے اپنے پاس لامحدود رقم نہ ہو۔ اسی طرح مدد اسکی کی جاتی ہے جو مدد کا محتاج ہو۔ ان دونوں لفظوں کے مفہوم میں احتیاج اور بے مائگی اور کمزوری شامل ہے۔ تو کیا اللہ کے معاملے میں بھی معاذاللہ مفہوم کے اِن اجزاء کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس کے خزانے میں بھی کسی شئے کی کمی ہے جو وہ بندوں سے قرض مانگے گا یا وہ بھی کسی دشمن کے مقابلے میں کمزور ہے کہ مدد کا طالب ہو۔

معلوم ہوا کہ ان الفاظ کو سیاق وسباق کے مطابق ایک خاص محمل پر اتارا جائے گا اور مفہوم عام ہرگز مراد نہیں لیا جائے گا۔ یہ قرآن کی مثالیں ہیں۔ کیا قرآن سے بڑھ کر بھی کسی کی پیروی احسن ہوسکتی ہے۔ عالم الغیب کا اطلاق جب ہم نے غیراللہ پر کیا تو خود ہی ظاہر ہوگیا کہ یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے جس میں اللہ کے لئے ہوتا ہے اور لغوی وجزوی وغیرہ کے الفاظ سے ہم نے رہا سہا ابہام بھی ختم کردیا۔ اللہ اگر اپنے لئے ایسے الفاظ استعمال فرما سکتا ہے جو عام انسانی اصطلاح کے لحاظ سے شایانِ شان نہ ہوں تو ہمارے طرزِ استعمال میں کیڑے ڈالنا کیا معنی۔ عالم الغیب کا لفظ بے شک غیراللہ کے شایانِ شان نہیں۔ اللہ ہی کو زیب دیتا ہے مگر ہماری عبارت میں یہ کسی قسم کا مغالطہ یا ابہام پیدا نہیں کررہا ہے اسلئے ہمارے محترم بھائی کی تعریض محض ہوا میں گھونسہ چلانے کے مرادف ہے۔

پھر لطیفہ یہ ہے کہ الفاظ کے معاملے میں تو یہ ناز ک طبعی مگر معنی کے لحاظ سے ہمارے بھائی کے مکتبِ فکر کا یہ عالم ہے کہ رسولِ کریمؐ کو جملہ مَاکَانَ وَمَایَکُون یعنی تمام اگلی پچھلی ظاہر وغائب اشیاء و اُمور کا عالم کہا جاتا ہے گویا گڑ ضرور کھائیں گے مگر میٹھے کا نام لینا حرام قرار دیں گے۔ اللہ کے سوا کسی پر لفظ عالم الغیب کا اطلاق تو اتنا گراں کہ قید وشرط کو نظر انداز کرکے فردِ جرم بھی عائد فرمادی۔ مگر معناً حضورؐ کو عالم الغیب مانے چلے جائیں گے تو اس سے نہ توحید گئی نہ شرک لازم آیا۔

اسے مذاق کہیں، نادانی کا نام دیں، غائب دماغی سے تعبیر کریں یہ فیصلہ اربابِ فہم پر چھوڑا۔

تیسری بحث

فرمایا گیا:۔

"چند جاہل اور مکار صوفیوں کے غلط کردار کی بنیاد پر تصوف کو شریعت کا دشمن کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے چند عیار وبداطوار علماء کے غلط کردار کی بنیاد پر کوئی علم دین ہی کو شریعت کا دشمن کہنے لگے۔"

مثال بری نہیں بشرطیکہ واقعات اس کی تصدیق کرتے۔ واقعہ یہ نہیں ہے کہ جاہل ومکار صوفی معدودے چند ہوں اور باقی صوفیاء اتباعِ شریعت کے مجسمے نظر آرہے ہوں۔ اپنے دَور کو لیجئے۔ اِدھر سے اُدھر تک قبروں کے میلوں، عرسوں، قوالیوں اور واہی رسموں کی ریل پیل ہے۔ تصوف کے نمائندے سمجھے جانے والے سجادے اور مجاور اور زائرین اکثر وبیشتر علم شریعت سے ناآشنا اور جاہلانہ عقائد میں اسیر ہیں۔ فرائض وواجبات تک کی پابندی نہیں۔ ذہن تاریک۔ اخلاق دھواں دھواں۔

اور بحث صرف اس موجودہ صورتِ حال میں نہیں بحث اصلاً اس میں ہے کہ قبروں اور درگاہوں کو مرجعیت اور بے پناہ اہمیت جس فلسفے نے دی ہے وہ تصوف کا فلسفہ ہے۔ کشف وکرامت اور تصرفاتِ اولیاء کو حد سے متجاوز قیمت اور توہم پرستانہ نوعیت جس ذہن نے دی ہے وہ مروّجہ تصوف کا ذہن ہے۔ مسلمان کو جہادِ زندگی کی رزم گاہ سے کرخانقاہوں

ی چار دیواری میں جو طرزِ فکر لے گیا ہے وہ تصوف کا رہینِ منت ہے۔ چار دیواری ضروری نہیں کہ اینٹ پتھر ہی کی ہو۔ رہبانی تصورِ حیات بجائے خود چار دیواری ہے، خانقاہیں اور مزار فقط خارج ہی میں نہیں کاسۂ سر کے اندر بھی بنتے ہیں بلکہ اصلاً یہ اندر ہی بنا کرتے ہیں۔ خارج میں تو ان کا عکس ہوتا ہے۔

عام قسم کی بدکرداریاں اور بداعمالیاں کسی ذہنی فلسفی یا روحانی عقیدے کا ثمرہ نہیں ہوا کرتیں۔ عالم دین شراب پئے۔ گالی بکے۔ دھوکا دے تو اس بد اطواری کو علمِ دین کا ثمرہ نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی طرح صوفی یہ سب گناہ کرے تو تصوف کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھیرائیں گے۔ یہ تو نفسِ امارہ کے ننگے کھیل ہیں۔ عملی کمزوریاں ہیں۔ لیکن جن بدعات، رسومات اور طرزِ فکر ومشاغل و معمولات اور عقائد و افکار پر ہم معترض ہوتے ہیں وہ صرف وہ ہیں جن کا دروازہ مروجہ تصوف نے کھولا ہے۔ مسلمان شرک کرتا ہے مگر تصوف کا فلسفہ اسے مطمئن رکھتا ہے کہ تم موحد ہو بڑا نیک کام کر رہے ہو۔ وہ انبیاء و اولیاء کی شان میں بے تکی مبالغہ آرائیوں میں مست رہتا ہے اور متصوفانہ ذہن اسے تھپکی دیتا ہے کہ شاباش تم ہو انبیاء و اولیاء کے سچے عاشق۔ وہ روحانی تصرفات اور کشف و کرامات اور ختم خواجگان م کی چیزوں سے دل کی دنیا آباد رکھتا ہے اور دین ق کے عملی تقاضے پکارتے رہ جاتے ہیں۔ وہ خدا سے کٹ گیا ہے کیونکہ اسے تصوف نے باور کرا دیا ہے کہ فلاں مزار والے یا فلاں زندہ بزرگ تمہاری ہر طرح کی مراد پوری کرنے پر قادر ہیں۔ نہ سہی ذاتی مگر عطائی قدرت انھیں یقیناً حاصل ہے۔ لہٰذا کیوں ان دیکھے خدا کے آگے ناک رگڑتے رہو۔

اگر ہم غلط کہہ رہے ہیں تو چلو کلیر یا اجمیر یا کہیں اور درس میں چل کر دیکھو۔ ایک خلقت توہمات کو حقائق بنا کر گلے میں لٹکائے ملے گی اور صالحین قسم کے صوفیاء تک کو تم اہلِ قبور کی غالی اور مفرط عقیدت میں پابست پاؤ گے۔

یہ ہے وہ اصل خرابی جس پر ہم نکیر کرتے ہیں اور علماً والی مثال اس پر صادق نہیں آتی کیونکہ یہ تو عین تصوف کا آوردہ ہے۔

ہمارے محترم بھائی تنبیہ کرتے ہیں کہ تصوف کو علی الاطلاق برا کہہ کر تم نے امام الطائفہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہؒ تک کو مجروح کر دیا۔

حاشا ثم حاشا۔ یہ بزرگ ہستیاں ہماری سنگ باری کے حیطۂ عمل سے قطعاً باہر ہیں۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے بارے میں جو کچھ قابلِ وثوق ذرائع سے پہنچا ہے اس کا بدعات و خرافات اور فسادِ عقائد سے کوئی تعلق نہیں اور جو قابلِ اعتراض باتیں منسوب ہیں ان کی سند ہمارے نزدیک لائقِ اعتبار نہیں۔ ویسے نبی وہ بھی نہیں تھے فکر و عمل کی غلطیاں ان سے بھی سرزد ہو سکتی تھیں۔ ان کی عظمت و مرتبت بحیثیت مجموعی ہے نہ یہ کہ ان کا ہر فعل و قول حجت ہو۔

شاہ ولی اللہؒ عام معنی میں بزرگ ہی نہیں تھے عالم بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ علم کا دریا بہانے پر آتے ہیں تو شد و مد سے کتنی ہی ایسی باتوں کی تردید و مذمت کرتے چلے جاتے ہیں جو مروجہ تصوف کی فہرست محاسن میں درج ہیں۔ خود ممدوح کی کتاب "الانتباہ فی سلاسل اولیاء" میں طوافِ قبر تک کی تلقین موجود ہے مگر ان کی البلاغ المبین یا دیگر تصانیفِ علمی دیکھئے تو نظر آئے گا کہ طوافِ قبر ان کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے عین ممکن ہے الانتباہ کلاً یا جزواً ان کی طرف غلط منسوب ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ عمر کے مختلف ادوار اور ذہنی سفر کے مختلف مراحل میں وہ بعض مغالطوں کا ہدف بن گئے ہوں۔ آخر انسان ہی تھے۔ جدِ امجد حضرت آدمؑ شیطان کے بہکائے میں آسکتے ہیں تو بیٹے معصوم

الخطا کیسے ہوں گے۔ یہ وصف تو بس ان برگزیدہ
روں کا ہے جنھیں نبوّت عطا کی گئی۔ حضرت آدمؑ شجر
و عہ کھانے کے وقت اصطلاحاً نبی نہیں تھے۔
شاہ ولی اللہؒ کا تصوف بحیثیت مجموعی محتاط تصوف
ا۔ ان کے علم و تفقہ سے امت کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔
ان کی بڑائی کو کافی ہے لیکن ایسے اجزاء سے ان کا
وف بھی خالی نہیں تھا جو پاپائی کار ذہنی رہبانیت اور
دگی سے فرار کا راستہ ہموار کرنے کا ذریعہ بنے۔ وہ
نیت تھے اور اپنی حد تک تصوف کو قیود شریعت
جکڑ سکتے تھے لیکن نفسیاتِ انسانی کے عمل کو روک دینا
کے بس میں بھی کہاں تھا چنانچہ قیدیں ڈھیلی ہوتی گئیں
اصد ماند پڑتے گئے۔ اسباب ہی کو عینِ مقصد تصو
یا جانے لگا اور قیاسات کے ذریعے ردّے پر ردّا
ڑھایا گیا۔ آج شریعتِ قبوری کا پورا ایوان سب
آنکھوں کے سامنے ہے جو زبانِ حال سے شریعت کے
دہ مکان پر قہقہے لگا رہا ہے۔ درگاہوں کے گنبدوں
ہونے کے کلس اور دیواروں پر سونے چاندی کی گلکاریا
یا اور یہ فتنہ مسجدوں تک میں داخل ہوگیا ہے۔ تعزیہ
امساجد جہاں چاہے دیکھ لیجئے۔ بزرگوں کے مزارات
گ و خشت سے سجائے گئے ہیں۔ کیا کیا آرائش ہے
بھولے لوگ پھر بھی یہ فرماتے ہیں کہ مروّجہ تصوف
ریعت کا حریف نہیں۔ گویا مزارات کو پختہ کرنے کی
نت ممانعت اور قبروں پر میلے لگانے کی مذمت
ان کے علم ہی میں نہ ہو۔

تھی بحث

یہ بحث ذرا زیادہ دلچسپ ہے۔ ہمارے دوست ہماری
"عدالت" میں ایک مقدمہ پیش کرکے انصاف چاہتے
ں۔ چلئے منظور۔ خدا علیم ہے ہمیں اگر یقین ہو جائے کہ
م سے ارتکاب جرم ہوا ہے تو اپنی ذات پر بھی فردِ جرم
ند کرنے اور سزا دینے میں ادنیٰ تامل نہیں ہوگا۔ انصاف

ہے گریز ضمیر کی موت ہے اور ضمیر مر گیا تو بچا کیا۔

محترم دوست نے فروری ۱۹۶۳ء کا تجلی نکالا اور ہماری یہ عبارت نقل کی:۔

"وہ شخص مولانا مودودی پر کیا چوٹ کرے گا جس نے
مولانا موصوف کی خداداد عظمت و عبقریت کے آستانے
پر دن کی روشنی میں سجودِ نیاز لٹائے ہوں۔"

اس پر انھوں نے یہ اشکال قائم کیا کہ تم تو غیر اللہ کے آستانے پر سجدہ کرنے کو حرام کہتے ہو مگر خود مولانا مودودی کے آستانے پر سجدہ ریز ہو۔

اس کے بعد تجلی کے مسلسل مطالعہ نے ایک ایسی عبارت ڈھونڈی جو ان الفاظ پر مشتمل تھی کہ "ہم اپنے قلم کی جبینِ نیاز ان کی بارگاہ میں جھکا رہے ہیں۔"

اس میں ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ "یہ سجدہ بے اختیار ان کی ذات کو نہیں اُس حق کو ہے جس کے آگے پوری کائنات خواہی نخواہی سجدہ ریز ہے۔"

اس پر محترم فرماتے ہیں کہ مزار کی چوکھٹ کا بوسہ لیتے ہوئے بدست صوفی بھی تو یہی کہتا ہے کہ "میری جبینِ عقیدت کا یہ خراج صاحبِ مزار کی ذات کو نہیں بلکہ اُس جلوۂ حق کو ہے جس کے آگے خواہی نخواہی ساری کائنات سجدہ ریز ہے۔"
جب یہ بات ہے تو آخر کہاں کا انصاف ہے کہ آپ مزے میں رہیں اور صوفی کو دار پر چڑھا دیا جائے۔

یہ ہے کیس جسے بہ الفاظ خود موصوف نے برائے انصاف ہماری عدالت میں پیش کیا ہے۔

ان کی قدر افزائی کا شکریہ۔ بے تنخواہ کے جج دیکھنے میں نہ آئے ہوں گے آج یہ بھی دیکھئے۔ ہم رضا کارانہ یہ خدمت انجام دیں گے۔ اللہ ہمیں عدل کی توفیق دے۔

عامر عثمانی بطور جج پوچھتا ہے:۔

اے مدعی! آپ یہ بتلائیں کہ سجدے کے معاملے میں جھگڑے کی نوعیت کیا ہے؟ سجدہ روزمرّہ کی اصطلاح میں انسانی جسم کی ایک خاص ہیئت کا نام ہے جس میں پیشانی

زمین پر یا زمین سے متصل کسی چیز پر ٹک جاتی ہے۔ یہ ظاہری تذلل و انکساری کی آخری شکل ہے اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی اہم ترین عبادت نماز میں اس شکل کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

کیا ایسا واقعہ پیش آگیا ہے کہ تجلی کا ایڈیٹر اسی مفہوم میں اللہ کے سوا کسی کے آستانے یا پائے ناز پر سجدہ ریز ہوگیا ہو اور صوفیوں کے لئے اسی فعل کو حرام قرار دیتا ہو؟

صاف صاف کہئے۔ یہ عدالت ہے۔ یہاں ہیر پھیر کی باتیں نہیں چلیں گی۔

اے محترم بھائی جناب ارشد القادری صاحب۔ اس کے جواب میں کیا آپ یہ کہہ سکیں گے کہ جی ہاں واقعہ یہی پیش آیا ہے۔ اگر ایسا کہہ سکیں تو یقین ہے کہ قانون آپکو دروغ حلفی کی سزا دے گا کیونکہ آپ کا ارشاد سراسر دروغ و افترا پر مبنی ہوگا۔ ایڈیٹر تجلی نے اصطلاحی اور مذکورہ مفہوم میں کبھی اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا۔ اگر ثبوت لاسکتے ہوں تو لائیے اور اس بدبخت کو پھانسی پر چڑھا دیجئے۔

ہم سمجھتے ہیں آپ ایسی دروغ حلفی کی جسارت تو نہ کر سکیں گے مگر ہاں ہماری یہی دو عبارتیں دہرا دیں گے جو شامل مسل فرمائی ہیں۔

عامر عثمانی بطور جج اس پر کہتا ہے:۔

اے مدعی جو عبارتیں آپ نے پیش کیں ان سے تو کوئی دلائی اُردو خواں بھی اصطلاحی سجدہ نہیں نکال سکتا۔ آپ مریخ سے تو نہ آئے ہوں گے۔ ہماری دنیا میں اس طرح کی عبارتیں ذہنی عقیدت و احترام کے اظہار میں بولی اور لکھی جاتی ہیں اصطلاحی سجدے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا پھر کیا ایڈیٹر تجلی یہ کہتا ہے کہ صوفیوں کا کسی زندہ یا مردہ بزرگ سے عقیدت رکھنا ہی حرام ہے؟ اگر واقعی یہ کہتا ہے تو ابھی پانچ سال قید با مشقت اور پچاس ہزار روپے جرمانے کی سزا اسے دیئے دیتے ہیں بشرطیکہ آپ اس الزام کا ثبوت مہیا فرادیں ورنہ بڑی واہیات حرکت ہے کہ خود تو یہ شخص مولانا مودودی اور فلاں فلاں سے گہری عقیدت رکھے مگر اوروں پر اس کا دروازہ بند کرے آپ ثبوت پیش فرمائیے۔

ہمارے فاضل دوست بتائیں بحیثیت مدعی ان کا کیا جواب ہوگا۔ کیا وہ کہہ سکیں گے کہ ہاں جی لارڈ یہ دوسروں کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ اولیاء و انبیاء کی عقیدت دل میں مت رکھو۔ بزرگوں کو بزرگ مت سمجھو۔ کسی کا ادب و تعظیم مت کرو۔

غالباً نہ کہہ سکیں کیونکہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ پھر کیا قانونی زبان میں سوائے اس کے بھی کچھ کہا جائے گا کہ آپ سرے سے کوئی چارج ہی فریم نہ کرسکے مقدمہ چلے تو کس بات پر اور ایڈیٹر تجلی سزا پائے تو کیوں؟

ہاں خود موصوف پر کیس چل سکتا ہے کیونکہ انھوں نے بحث دعویٰ میں یہ فرمایا ہے:۔

"اپنے کسی ممدوح کی بارگاہ میں سجدۂ بے اختیار کے جواز کے لئے یہ دلیل اگر قابل قبول ہو تو مزار کی چوکھٹ کا بوسہ لیتے ہوئے بدمست صوفی بھی تو یہی کہتا ہے کہ میری جبینِ عقیدت کا یہ خراج صاحبِ مزار کی ذات کو نہیں بلکہ اُس جلوۂ حق کو ہے جس کے آگے خواہی نخواہی ساری کائنات سجدہ ریز ہے۔"

جج اس پر کہہ سکتا ہے:۔

اے مدعی! تمثیل میں آپنے چوکھٹ کا بوسہ دینے کی بات کہی۔ یہ ایک جسمانی، خارجی اور مشاہد چیز ہے۔ اس میں وہی ظاہری کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اصطلاحی سجدے میں ہے۔ یہ کوئی ادبی اسلوب نہیں۔ کوئی انشائی استعارہ نہیں۔ یہ تو سیدھا سادھا سجدۂ جسمانی کی مشابہت کا معاملہ ہے۔ اس کے مقابلے میں ایڈیٹر تجلی کی جو عبارتیں آپنے پیش کیں وہ معروف انشائی اسلوب میں صرف ایک ذہنی کیفیت کا اظہار کرتی ہیں جسے عقیدت و نیازمندی کہتے ہیں۔ ان سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ ایڈیٹر تجلی کسی بدمست صوفی کی طرح مولانا مودودی کی چوکھٹ چومنے جھک گیا تھا۔ علاوہ ازیں دوسری عبارت میں تو اس نے صاف

الفاظ میں اپنے قلم کی جبینِ نیاز جھکانے کا ذکر کیا ہے۔ کیا آپ اتنے بدحواس ہوگئے ہیں کہ ذی روح انسان اور بے روح قلم کے افعال میں فرق نہیں کرسکتے۔ صاف ظاہر ہے کہ آپ خواہ مخواہ عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں اور خالص ہوائی مقدمہ بناکر لائے ہیں۔ اس جرم میں آپ کو تابرخاست عدالت سزائے حبس دی جاتی ہے۔

ہمارے فاضل دوست اور جملہ اہلِ نظر انصاف فرمائیں کہ کیا جج نے اپنا فریضہ دیانت کے ساتھ ادا نہیں کیا۔

ہم اپنے محترم دوست کو تابرخاست عدالت ایک لطیفہ سنائیں گے۔

ایک صاحب زور شور سے دعویٰ کر رہے تھے کہ فلاں شاعر یقیناً کسی سرکس کا مسخرہ رہ چکا ہے۔ دلیل دریافت کی گئی تو انھوں نے شاعر کا یہ مصرعہ پیش کردیا۔

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

عرض کیا گیا کہ بھائی یہ تو محاورہ ہے۔ فرمانے لگے محاورے کی ایسی تیسی۔ کیا ثبوت ہے کہ محاورہ ہے!

اس لطیفے کو دوست موصوف اپنے اعتراض سے وزن کرکے دیکھیں رتی بھر بھی تفاوت شاید ہی نکلے۔ محاوراتِ زبان تو اکثر دیہاتی بھی جانتے ہیں۔ ہماری دونوں عبارتوں میں ذرا بھی ابہام نہیں۔ کہاں وہ سجدۂ جسمانی جو غیر اللہ کے لئے حرام ہے اور کہاں وہ حسنِ عقیدت کی ذہنی کیفیت جسے ہماری عبارتیں ہانکے پکارے بیان کر رہی ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ایک صاحبِ علم وفہم ایسے بچکانہ اعتراضات کیسے کرسکتا ہے۔

پانچویں بحث

ہم نے لکھا تھا۔

"یہ سمجھنا کہ فلاں مکتبِ فکر سرتاسر باطل ہے اور ہمارا اپنا مکتبِ فکر الف سے یا تک برحق ہے آدمی کو بے میل حقائق تک نہیں پہنچاتا۔"

اس پر ہمارے بھائی نے یہ ریمارک فرمایا:-

"معلوم نہیں کس عالم میں آپ نے یہ عجیب غریب نکتہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ بات بالکل اسٹیٹ لائن کی ہے کہ کسی بھی مکتبۂ فکر کو کوئی عاقل و خداترس آدمی یہی سمجھ کر قبول کرتا ہے کہ وہ کُل کا کُل برحق ہے۔ اگر اس کے علم و اعتقاد میں کُل کا کُل برحق نہ ہو بلکہ کچھ برحق ہو اور کچھ باطل ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے مکتبۂ فکر سے وہ منسلک ہی کیوں ہوگا۔"

(اطلاعاً عرض کردیں کہ صحیح لفظ مکتبِ فکر ہے نہ کہ مکتبۂ فکر ۔۔ گستاخی معاف ہو)

ہم اپنے بھائی سے بلاتکلف عرض کریں گے کہ ہمارا عالم تو ایک لحاظ سے ان سودائیوں کا سا عالم ہے جو وضع کی خاطر سر کٹا دیتے ہیں۔ ہم نے خود پر یہ لازم کرلیا ہے کہ حق اور سچ کہیں گے چاہے کوئی مار ہی ڈالے۔ یہی عزم ہے جس کی بنا پر ہم نہ فرقوں اور حلقوں کے ذہنی غلام ہیں نہ اپنے متعلق کسی خوش فہمی اور زعم میں مبتلا۔

کیا ہمارے دوست اتنا بھی نہیں جانتے کہ مکتبِ فکر اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین کوئی بھی ہو اسے قبول کرنے والا بے شک اسے سرتاپا حق ہی سمجھے گا لیکن مکتبِ فکر تو اسکول آف تھاٹ کا نام ہے۔ ہر دین، ہر شعبۂ علم، ہر فن میں متعدد مکاتبِ فکر ہوتے ہیں کیونکہ سوچنے کے ڈھنگ قدرتاً مختلف ہیں اور مکتبِ فکر کا جنم ہی طرزِ فکر کے فرق سے ہوتا ہے۔ اسلامی شریعت میں بھی متعدد مکاتبِ فکر ہیں جنھیں مذاہبِ فقہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر پڑھا لکھا جانتا ہے کہ حنفیہ شافعیہ مالکیہ اور حنبلیہ کے مابین ہزاروں مسائل میں اختلاف ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ دو متضاد باتیں برحق نہیں ہوسکتیں۔ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا واجب ہو اور امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا گناہ ہو۔ ان میں سے ایک ہی بات برحق ہوسکتی ہے دونوں نہیں۔ پھر بھی تمام سنجیدہ اہلِ علم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ چاروں مکاتبِ فکر برحق ہیں۔

ِرقہ ہائے باطلہ میں شمار نہیں کیا جائے گا۔
اس سے دو نتیجے نکلے :-
ایک یہ کہ بنیادی ترین اصول و عقائد پر اتفاق کامل
جود فروعات کے اخذ و استنباط میں کچھ نہ کچھ اختلاف
ہوتا ہے اور یہی اختلاف مکاتبِ فکر کو تشکیل دیتا ہے
بطرتاً ناگزیر ہو وہ گناہ کبھی نہیں ہوتی لہذا یہ مختلف
ِ فکر کا پایا جانا نہ گناہ ہے نہ افتراق کی علامت۔
دوسرے یہ کہ یہ مکاتب چونکہ قیاس و اجتہاد کے
ِ اسالیب اور ذہنوں کی جدا جدا ساخت کا ثمرہ ہوتے
ِس لئے ان میں لازماً یہ امکان باقی رہتا ہے کہ بعض آراء
اتبِ فکر کی مبنی بر حق ہوں اور بعض دوسرے مکتبِ
۔ کسی بھی فقیہ و مفکر کے بارے میں آسمان سے یہ
ِ تو مل نہیں گئی کہ جو کچھ جس طرح وہ سوچے گا بس وہی
ِہ صحیح ہوگا۔ اس لئے ایک حنفی کے لئے یہ یقین کرنے
ِ وجہ موجود نہیں کہ فقہ حنفی کا ہر ہر مسئلہ عند اللّٰہ
طور پر درست اور دوسرے مکاتب فکر کے تمام مسائل
ادرست۔ ایسا یقین یا تو وہ لوگ رکھ سکتے ہیں جن کے
موجھ بوجھ ہی نہ ہو یا پھر وہ لوگ جو ذہنی پندار اور
ہیوں میں مبتلا ہوں۔ تمام علوم و فنون کا یہی حال ہے۔
ِیدہ اور عدل پسند اہلِ علم میں وہ دیانت کے ساتھ یہ
ہیں کہ معروف مکاتبِ فکر میں کوئی بھی اس پوزیشن میں
ِہ اسے سرتا پا حق قرار دے کر باقی مکاتب کو سراسر
ہد یا جائے۔ مکاتب انبیاء نہیں بناتے۔ وہ تو دین لانے
اتب عام افرادِ امت کے تدبر و تفقہ کا مآل ہوا کرتے
رعام افراد کے تفقہ میں امکانِ خطا پایا جانا ایسا مسلّمہ
ِ سے دیوانوں کے سوا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔
معلوم ہوا کہ موصوف نے جو کچھ فرمایا وہ دین اور مکتبِ
فرق کو پسِ پشت ڈال کر فرمایا رہی یہ بات کہ "ایسے
کر سے وہ مسلک ہی کیوں ہوگا" تو صاف ظاہر ہے کہ
ِ سوا چارہ ہی نہیں۔ کوئی بھی مکتبِ فکر جب ایڑی سے
ِ امکانِ خطا سے بالاتر ہو ہی نہیں سکتا تو آدمی

جائے گا کہاں۔ کسی نہ کسی مکتبِ فکر سے وابستہ ضرور ہوگا جس
سے وابستہ ہوگا وہ بہر حال ایسے افکار و قیاسات کا مجموعہ
ہوگا جس کے بعض اجزاء کا نادرست ہونا بلاشبہ ممکن ہے۔
افسوس صاف و سادہ اور معلوم و مسلّم حقائق کو بھی
ہمارے فاضل دوست کے مناظرانہ ذہن نے موشگافی
کا موضوع بنا دیا اور ہماری عبارتوں میں اپنے معانی
ڈالنے کی کوشش کی۔ لفظِ باطل ہر جگہ کفر و شرک ہی کے
معنی میں تو استعمال نہیں ہوتا۔ جب کہیں گے کہ بغیر گواہوں
کے نکاح باطل ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ نکاح درست
نہیں۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایسا نکاح آدمی کو کافر بنا گیا یا
یہ نکاح ہی عین کفر ہے۔ اسی طرح لفظِ حق بھی ہر جگہ وحی کے
مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ سچ اور درست کے معنی
میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہماری منقولہ عبارت سے
بالکل ظاہر ہے کہ حق و باطل کے الفاظ کس مفہوم میں بولے
گئے ہیں۔ پھر بھی ہمارے دوست نہ سمجھیں تو ہم لقمان کو
قبر سے اٹھا کر لا نہیں سکتے۔ اور سچ یہ ہے کہ شاید لقمان
کی حکمت بھی ایسی نا سمجھی کا علاج کرنے میں ناکام ہی رہے۔
ہمارے دوست فرماتے ہیں کہ :-
"میرا اپنے مکتبۂ فکر کے بارے میں تو یہی اعتقاد
ہے۔"
یعنی وہ سرتاسر حق ہے غلطی اور قصور کی اس میں مطلق
گنجائش نہیں۔ یہ خوش فہمی ہمارے دوست کو مبارک۔
ہٹلر کا بھی یہ اعتقاد تھا کہ جرمن قوم تمام اقوامِ عالم سے
فائق و برتر ہے۔ قادیانی بھی یہ سمجھتے ہیں کہ کامل حق تو
ہمارے پاس ہے باقی امت جھک مار رہی ہے۔ کمیونسٹوں
کا خیال یہ ہے کہ حقیقت کو تو بس ہم نے پایا ہے سارے
اہلِ مذہب جہیم پر گذارا کر رہے ہیں۔
اور یہ جو فرمایا گیا :-
"باطل اور حق کا مجموعہ کبھی حق نہیں ہو سکتا۔"
تو اس سے بھی ظاہر ہے کہ سخن فہمی سے ہمارے محترم کو ضد
ہو گئی ہے۔ حق و باطل کے الفاظ انھوں نے ٹھیٹ دینی

اصطلاح میں لے لئے۔ بے شک دین سراسر حق ہی حق ہے لیکن گفتگو تو مکاتبِ فکر کی ہو رہی ہے اور ظاہر ہے کہ الفاظ کا مفہوم موضوعِ گفتگو ہی سے متعین ہوتا ہے۔ طلب کی بحث چل رہی ہو تو کسی لفظ کو سائنسی یا جغرافی اصطلاح میں نہیں لے سکتے۔ حق و باطل کا واضح مطلب تھا درست و نادرست۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سیر بھر سونے میں ماشہ بھر پیتل ملا ہو تو مجموعے پر اطلاق سونے ہی کا ہوگا۔ اسی طرح کسی بھی مکتبِ فکر کو آدمی اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس نے غور و تحقیق کے بعد اسے معقول تر اور قوی البنیان اور اقرب الی الحق پایا ہے۔ یہ رائے اس مکتبِ فکر کے ایک ایک جزئیے کا جائزہ لینے کے بعد قائم نہیں کی جاتی۔ اصول و مبانی اور تھوڑے سے اجتہادات دیکھ لئے جاتے ہیں۔ بس طبیعت مطمئن ہو گئی کہ دوسرے مکاتب کے مقابلے میں یہ بہتر ہے۔ بعض اجزاء و آراء کے غلط ہونے کا علمی امکان تسلیم کرنے کے باوجود وہ مقدار و غالب کے اعتبار سے اسے مکتبِ حق سمجھتا ہے اور ٹھیک سمجھتا ہے۔

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ ہمارے فاضل دوست نے اپنے خداداد ذہن کو شاید تھپکیاں دے کر سُلا دیا ہے ورنہ اتنے کم فہم تو وہ نہیں معلوم ہوتے۔

چھٹی بحث

ہم نے نصیحت کی تھی کہ اصلاً قابلِ التفات قرآن و سنت ہیں نہ کہ اوروں کے اقوال و ملفوظات۔ اس کا بھی مطلب محترم دوست نے وہ اخذ کیا جو خوارج سے منسوب ہے۔ خوارج حضرت علیؓ کو کافر کہتے تھے کہ انھوں نے قرآن کو حکم اور جج بنانے کے بجائے دو آدمیوں کی ثالثی منظور کر لی۔ یہ تعریض کم فہمانہ تھی۔ قرآن اپنے منھ سے تو نہ بولے گا۔ اس کے احکام انسانوں ہی کے توسط سے ظاہر ہوں گے۔ حضرت علیؓ حق پر تھے اور خوارج غلطی پر۔ ہم پاگل ہونے سے پہلے یہ کیسے کہہ دیں گے کہ علمائے سلف و خلف کی رہنمائی کے بغیر قرآن و سنت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ عربی کی بسم اللہ ہی ہمیں علمائے فن کی رہنمائی کا محتاج بناتی ہے پھر آخر تک ہم اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

مگر ہمارے سخن فہم دوست نے ہم پر یہ الزام عائد کر ڈالا کہ ہم ماضی کے اشخاص کے لئے یہ حق تسلیم نہیں کرتے کہ ان سے کوئی دین سمجھے۔

یہ ہوا میں گرہ باندھنا ہے ہماری تحریر میں کھلے طور پر صوفیاء و مشائخ کا ذکر ہوتا آ رہا ہے۔ شاہ عبد القادر جیلانیؒ اور خواجہ اجمیریؒ کے نام تک موجود ہیں۔ ہم نے کہا یہ ہے کہ صوفیاء و مشائخ کے حال و قال پر وجد کرنا اور ان سے عقائد کے لئے دلائل و قرائن نکالنا مناسب نہیں "ہمیں خالی الذہن ہو کر اللہ و رسولؐ کے ارشاداتِ عالیہ کو مرکزِ فکر بنانا چاہیئے۔"

"خالی الذہن" کی قید کا مطلب ہمارے دوست نے اگر ماضی کے اشخاص سے قطع تعلق سمجھ لیا ہے تو ہمارے پاس ایسی نادر فہم کا کوئی علاج نہیں۔ اہلِ زبان تو یہاں اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتے کہ لکھنے والا لوگوں کو یہ تلقین کر رہا ہے کہ اپنے دل و دماغ میں پہلے سے کچھ نظریات و عقائد لے کر قرآن و حدیث کی طرف مت آؤ بلکہ ذہن کو ان سے خالی کر لو اور یہ تہیہ کر کے قرآن و حدیث کو پڑھو کہ جو عقائد و تصورات ان سے ملیں گے ان سے ہی ہم ناطہ جوڑیں گے۔ ان میں ذاتی میلانات و مرغوبات کو دراندازی کی اجازت نہیں دیں گے۔

ہر پڑھا لکھا جانتا ہے کہ قرآن و سنت اور آثارِ صحابہؓ پر غور و فکر کر کے عرق ریز محنت اور بے مثال اخلاص کے ساتھ جن اسلاف نے دین و شریعت کیا احکام و عقائد کے مرتب دفتر کی شکل دی ہے انھیں ائمہ اور فقہاء و مجتہدین کہا جاتا ہے صوفیاء و مشائخ نہیں کہا جاتا عقائد و احکام کے باب میں یہی حضرات امت کے مقتدا ہیں، قرآن و سنت کے مطالب پر ان کا ہی فکر و فہم سند ہے۔ صوفیاء و مشائخ بھی انہی میں سے کسی ایک کے مقتدا اور

مسائل و احکام میں اس کے تابع رہے ہیں۔

ہم نے اگر صوفیاء و مشائخ کے حال و قال سے عقائد و نظریات لینے پر ٹوکا تو اس سے یہ مطلب نہیں نکلا کہ ماضی کے کسی بزرگ کو قرآن و سنت کے مطالعے میں رہنما مت بناؤ بلکہ یہ مطلب نکلا کہ رہنمائی کے مستحق اس باب میں دوسرے حضرات ہیں۔ دوسرے حضرات کے نام اگرچہ اس مقام پر ہم نے نہیں لئے مگر اکابر صوفیاء کے نام لینا صریحاً یہ معنی رکھتا ہے کہ تمام ہی اسلاف کی رہنمائی سے بے نیازی کی ترغیب نہیں دی جا رہی ہے بلکہ نشاندہی کی جا رہی ہے کہ صوفیاء و مشائخ ـــــ چاہے وہ کتنے ہی بلند مرتبہ ہوں عقائد و نظریات کے معاملے میں سند نہیں ہوتے۔ جب وہ سند نہیں ہوتے تو پھر ظاہر ہے کہ وہ لوگ سند ہوں گے جو علماء و فقہاء کہلاتے ہیں۔

سخن شناس نئی دلبرے کہ خطا اینجا ست

پھر جب موصوف ہی نے یہ اعتراف فرمایا کہ :-

"آپ بھی تجلی کے باب الاستفسار میں ہر ماہ یہی فریضہ انجام دیا کرتے ہیں۔"

یعنی علماء سے کسب فیض کرنا۔ تو آخر کیسے انھوں نے ہماری عبارت سے یہ معنی اخذ کر لئے کہ قرآن و حدیث کو ماضی کے خواص سے مت سمجھو۔

محترم بھائی! ہم تو اس شخص کو ذہنی مریض سمجھتے ہیں جو اسلاف کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر براہِ راست مجتہد القرآن والسنۃ بننے کی جسارت کرے۔ یہ جسارت عموماً فکری اور ذہنی ارتداد پر منتج ہوتی ہے۔ پناہ بخدا۔

ہماری ساری لے دے جس طرزِ عمل پر ہے وہ یہ ہے کہ عقائد و احکام کے مباحث میں صوفیاء و مشائخ کی سند لائی جاتی ہے اور ایسی باتیں کی جاتی ہیں جیسے یہ بزرگ خطا کر ہی نہیں سکتے۔ یا پھر ایسی روایات گھڑ لی جاتی ہیں جو ضعیف مضطرب یا موضوع یا مبہم ہیں۔ ان پر بے بنیاد علم کلام کے اہرام کھڑے کر دیئے جاتے ہیں، محکم آیات و احادیث کو جبر ان کے سانچے میں ڈھالنے کی سعیِ نامسعود کا کمال دکھایا جاتا ہے اور قطعاً بھلا دیا جاتا ہے کہ متشابہات کے پیچھے پڑنے کو قرآن نے کج فکری اور گمراہی قرار دیا ہے۔

اب حضورؐ کے علمِ غیب اور حاضر و ناظر ہونے ہی کا مسئلہ لے لیجئے۔ اکبرم شرکِ مبین۔ پچاسوں آیاتِ محکمہ اور پچاسوں احادیثِ قویہ ڈنکے کی چوٹ اس لایعنی اور یکسر باطل خیال کی تردید کئے چلی جا رہی ہیں مگر قبوری شریعت کے فنکار ہیں کہ برابر سادہ لوح عوام کو یہی زہر پلائے چلے جا رہے ہیں۔

یہ جو تعریض کی گئی کہ قرآن و سنت کی تفہیم اور دین کی تشریح کے سلسلے میں آپ کے (عامر عثمانی کے) نزدیک شاہ جیلانیؒ اور خواجہ اجمیریؒ اور دیگر اولیاء و اقطاب کی اتنی بھی حیثیت نہیں ہے جتنی تفہیم القرآن اور تفہیم الحدیث کے مصنف کی یا تجلی کے باب الاستفسار کے مجیب کی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تفہیم القرآن وغیرہ میں اگر مولانا مودودی محض اپنی ہانکتے یا صوفیاء و مشائخ کے اقوال کو بنیادِ تفسیر بناتے یا گھٹیا سندوں والی روایات لاتے تو ہماری نگاہ میں ان کی کچھ بھی وقعت نہ ہوتی۔ ان کی وقعت اس لئے نہیں کہ وہ مودودی صاحب ہیں بلکہ اس لئے ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے مطالب ان کے صحیح نمائندوں اور رازدانوں سے لے کر خلقِ خدا کو پہنچا رہے ہیں۔

اور تجلی کے باب الاستفسار کا مجیب تو نالائق عامر عثمانی ہی ہے۔ اس کی کیا حیثیت۔ اس کا بھرم بھی اسلاف ہی کے دم سے قائم ہے۔ اس کی آنکھوں کی بینائی علمائے سلف کے جوتوں کی خاک سے سرمہ حاصل کر کے خود کو قائم رکھتی ہے۔ وہ اگر بزرگانِ سلف سے اپنا رشتہ کاٹ لے اور دین میں خود رائی کا زہر آمیز کر دے تو ہم اس کی گردن ہی نہ کاٹ دیں۔

بلا جھجک، واضح ترین الفاظ میں ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری دانست میں قرآن و سنت کی تشریح اور عقائد شرعیہ اور قوانینِ اسلامیہ کے باب میں مستند ائمہ و فقہاء ہیں نہ کہ اصطلاحی اولیاء و اتقیاء۔ شاہ جیلانیؒ

اور خواجہ اجمیری رحمہما اللہ جیسے بزرگ بلا شبہ اونچے پائے کے صالحین تھے۔ ان کی عظمت مسلّم۔ ہم جیسے سیاہ کار تو ان کی غلامی کے بھی قابل نہیں۔ وہ سورج ہم ذرہ۔ وہ سونا ہم مٹی۔ مگر بچوں کا علاج کرانے کے لئے کسی مردِ صالح کو نہیں بلایا جائے گا ڈاکٹر حکیم بلائے جائیں گے خواہ وہ کافر و مشرک ہی کیوں نہ ہوں اور مکان کا نقشہ بناتے وقت انجنیروں کو زحمت دی جائے گی اہلِ جبہ و دستار کا وقت خراب نہیں کیا جائے گا۔ یہ ان بزرگوں کی توہین تو نہیں۔ اسی طرح عقائد و قوانین کے باب میں فقہائے معروف اور شہرۂ آفاق متقنینِ اسلام کے آگے جھولی پھیلائی جائے گی۔ شاہ کلیریؒ یا حضرت چشتیؒ یا حضرت جیلانیؒ کی بارگاہ میں نہیں۔

یہ ہے وہ حقیقتِ واضحہ جسے سیدھی طرح سمجھنے کے عوض ہمارے محترم بھائی نے بے مصرف این و آن کا شیش محل تعمیر کر دیا اور اس پر مطمئن ہو گئے کہ موٹی سمجھ کے قارئین تو نالائق عامر عثمانی کے پیچھے تالی پیٹ ہی دیں گے۔

ساتویں اور آخری بحث

ہم نے اپنے بھائی کو ایک دوستانہ نصیحت کی تھی۔ خلاصہ جس کا یہ تھا کہ علمائے دیوبند جن افکار و اعمال پر بدعت و شرک کا اطلاق کرتے رہے ہیں اگر وہ ہی خود ان کے یہاں کسی درجے میں موجود ہوں تو اس کا حاصل یہ مت نکال لیجئے کہ انھیں جواز کی سند مل گئی۔ ان افکار و اعمال کو محاورۃً بریلوی عقائد بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارا مطلب یہی تھا کہ اپنے عقائد کو امکانِ خطا سے بالاتر مت سمجھئے۔

ہماری دوستانہ نصیحت شاید کڑوی لگی۔ اس نے غالباً موصوف کے پندار کو جراحت پہنچائی۔ فرماتے ہیں:-

"یہاں تو خدا کا شکر ہے کہ ائمۂ دین و ملت کے توسط سے کتاب و سنت کی سند بہت پہلے سے ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اب ہمیں مزید سناد کی ضرورت ہی کیا ہے اور وہ بھی معاذ اللہ علمائے دیوبند کی سند جو خود الزامات کی زد میں ہے۔"

کاش یہ قول صحیح ہوتا۔ کاش کتاب و سنت کو ہمارے محترم بھائی نے واقعتہً رہنما بنایا ہوتا۔ کاش وہ ائمۂ دین و ملت کے الفاظ ٹھیک محل اور ٹھیک مفہوم میں استعمال کرتے۔ پھر تو ہم ان کا قلم چوم لیتے۔ ان سے خود نصیحت حاصل کرتے نہ کہ انھیں نصیحت کرنے کی گستاخی کے مرتکب ہوتے۔

قرآن و سنت سے زیادہ مظلوم شاید ہی کوئی ہو۔ قادیانیوں سے لے کر ہم اور آپ تک سب یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم تو قرآن و سنت کے پیرو ہیں۔ مگر نہ جانے کتنے بت ہماری آستینوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ کتنے ذیلی خدا ہمارے ذہن کے مختلف گوشوں میں مسند آرا ہیں۔ کیا کیا خوبصورت لباس شیطان نے ہماری خود فریبیوں کو پہنا دئیے ہیں۔ قرآن کی زبان میں زُیِّنَ لنا اعمالنا۔

اب یہی دیکھ لیجئے۔ نام تو لے دیا گیا ائمۂ دین و ملت کا۔ کتنا پاکیزہ عنوان۔ مگر ہمارے دوست جس مکتبِ فکر کے ترجمان ہیں اس کے علم کلام کا مطالعہ منکشف کرتا ہے کہ ائمۂ دین و ملت سے مراد ہے شاہ جیلانیؒ، خواجہ اجمیریؒ، خواجہ چشتیؒ اور اسی طرح کے دیگر ائمۂ طریقت۔ نام نہ ابو حنیفہؒ کا ملے گا نہ قاضی ابو یوسفؒ اور زفرؒ کا۔ نہ امام مالکؒ نہ امام شافعیؒ نہ امام احمدؒ کا۔ عامۃ المسلمین کے جذباتی استحصال کے لئے اولیاء و اقطاب کے خیالی نقشے ایسے کھینچے گئے ہیں کہ بڑے بڑے انبیاء بھی ان کے بالمقابل کوتاہ قد نظر آتے ہیں۔ انبیاء کے معجزات سے ان بزرگوں کے کشف و کرامات کئی گنا زیادہ۔ ایسی صورت میں عوام بے چارے ان کی سند کو کافی نہ سمجھیں تو کیا سمجھیں۔

ہم اگر غلط کہہ رہے ہیں تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا
۔ ہمارے فاضل دوست مختلف فیہ عقائد میں سے کوئی
عقیدہ چن لیں اور اس کی صحت کے لئے اپنے تمام
ئل پیش فرمادیں ۔ ہم بھی اپنے موقف کے دلائل حاضر
دیں گے ۔ پھر دیکھا جاسکے گا کہ کون واقعی ائمہ دین
شاگرد ہے اور کون اس عنوان کی آڑ میں کتاب و
ت سے پہلو تہی کرتا اور نظریں چراتا ہے مثلاً ہمارے
ست کے مکتب فکر کے معروف امام مولانا احمد رضا
ں رحمۃ اللہ علیہ بڑے شد و مد سے اس کے قائل تھے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک کا سایہ
یں تھا۔ یہ عقیدہ کافی پہلے سے چلا آرہا ہے۔ دیوبندی
قوں میں بھی اس کے اچھے خاصے قائلین پائے گئے
ں اور اب بھی پائے جاتے ہیں۔ عامۃ المسلمین میں تو
ے تقریباً مسلمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ بریلوی حلقوں
س پر مکمل وثوق ہے۔ غالباً ہمارے محترم بھائی بھی اسی
حامل ہوں گے۔ اگر ہیں تو پھر بسم اللہ۔ ائمہ دین و
ت کی تفسیر و تعبیر کی روشنی میں قرآن و سنت کے دلائل
افرمائیں۔ ہم اس عقیدے کو وہم خالص اور اختراع
رکرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ قطعی طور پر خلافِ
عہ ہے۔ افہام و تفہیم اور تبادلۂ خیال سے واضح
جائے گا کہ کون واقعی قرآن و سنت اور عدل و
ولیت سے ایماندارانہ واسطہ رکھتا ہے اور کون
ں پرچھائیوں کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔

یہ موضوع بحث پسند نہ ہو تو اور کوئی لے لیجئے
ر کے رسولؐ عالم الغیب یا حاضر و ناظر ہیں مرحوم بزرگوں
وحیں ہم زندوں کی مدد کرتی ہیں۔ قبروں کا عرس ثواب
ت کا باعث ہے۔ مزاروں پر دعائیں کرنے سے مرادیں
بر آتی ہیں وغیرہ ذلک ۔ اس طرح کے بے شمار عقائد ہیں
ارے نزدیک خانہ زاد اور باطل ہیں مگر ہمارے دوست
کے برحق ہونے پر مطمئن بلکہ مصر ہیں لہٰذا انتخاب کا
نھیں ہی دیا۔ ایک ایک مسئلہ پر دین و شریعت کے

متفق علیہ مآخذ — قرآن — حدیث۔ اجماع۔ قیاس
— کی روشنی میں جم کر گفتگو کرلی جائے۔ نکھر کر سامنے آجائیگا
کہ خود فریبیوں کا شکار وہ ہیں یا ہم۔

ورنہ جہاں تک خوش فہمی کا تعلق ہے تو اللہ نے فرما ہی دیا ہے کہ کلّ حزب بما لدیہم فرحون۔ ہر گروہ اپنے اپنے خیالات میں خوش اور مگن ہے۔

عقیدت کی مناسب حدیں

"جواب تبصرہ" کا قصہ تو تمام ہوا۔ بزرگوں کی عقیدت و احترام کے بارے میں چند سطور اداریئے خدمت ہیں:۔

جو لوگ کسی دین کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں ان کی نفسیات کا لازمی تقاضا ہے کہ اُن حضرات سے انھیں عقیدت ہو جو اس دین کے تعلق سے بزرگ قرار دیئے جاتے ہیں۔ ابوحنیفہؒ و شافعیؒ ہوں یا شاہ جیلانی و خواجہ اجمیری۔ ان حضرات نے اپنے اپنے انداز میں اس طاعت رب کا حق ادا کیا جو اسلام کو مطلوب ہے، لہٰذا اسلام کو سینے سے لگانے والی امت کی نظروں میں معزز ٹھہرے۔ ان سے بالیقین مسلمانوں کو عقیدت و محبت ہوگی۔ مگر ہر عقیدت کی کچھ ضروری حدیں ہیں جن میں اسے محدود رہنا چاہیئے۔ ان حدوں کو اگر مبالغے کے تیشہ سے توڑ دیا جاتا ہے تو یہ مجرمانہ حرکت ہوگی جس سے اسلام نے روکا ہے۔ حضرت عیسےٰؑ خدا کے پیغمبر تھے۔ ان کی عزت و عقیدت جس دل میں نہ ہوگی وہ سیاہ خانہ کہلائے گا۔ ان کی توہین کرنے والے کو خارج از اسلام قرار دیں گے مگر جو لوگ عقیدت کی افراط میں انھیں خدا کا بیٹا کہنے لگیں ان کے مجرم ہونے میں کیا شک ہے۔ وہ جائز حدوں سے آگے بڑھ گئے اسی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت و محبت توعینِ اسلام ہے۔ ان کی اطاعت' اطاعتِ رب کے مرادف ہے۔ انھیں اپنے ماں باپ اور اپنی جانوں پر فوقیت دینا فرمانِ خداوندی ہے۔ ان پر جو قلب شیدا نہیں وہ مومن کا قلب ہی نہیں۔ ہزار ہزار صلوٰۃ وسلام

ان پر۔ لیکن وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے بڑھاؤ چڑھاؤ نہیں۔ تعریف میں غلو مت کرو۔ شرک سے بچو۔ تمام عظمتیں اور تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ کوئی بھی تعریف و تعظیم بس ان حدوں میں درست ہے جو عبدیت و بشریت کی حدیں ہیں۔ اُلوہیت اور شانِ خدائی کا کوئی شائبہ کسی میں نہیں۔ توحید سب سے معظم و برتر حقیقت ہے اس پر حرف نہ آنے پائے۔

اور اسی طرح بہ فرقِ مراتب صحابہ، ائمہ، علماء، مرشدین و شیوخ وغیرہ کی عقیدت و تعظیم ایمان کا تقاضا ہے جس سے صرفِ نظر کیا ہی نہیں جا سکتا وہ بد دین و گمراہ ہوگا جسے ان نجوم ہدایت سے عقیدت نہ ہوگی۔ مگر عقیدت کی حدیں متعین ہیں۔ یہ سب غیر معصوم تھے۔ ان سے فقط خطائے اجتہادی اور لغزش و زلت ہی نہیں گناہ کا صدور بھی ہو سکتا تھا۔ ان میں سے فرداً فرداً کسی کا بھی ذاتی فکر یا عمل حجت نہیں واجب القبول یا واجب التقلید نہیں الّا یہ کہ قرآن و سنت اس کی تائید کر دیں۔ ان میں ایسے اوصاف و کمالات فرض کر لینا بھی جائز نہیں جن کا قوی ثبوت مہیا نہ ہو چکا ہو۔ انکی کسی رائے سے اختلاف بھی ہر نیک نیت محقق کے لئے مباح ہے اور اگر محقق مطمئن ہو جائے کہ ان کی فلاں رائے قرآن و سنت کی تعلیم سے ہم آہنگ نہیں تو اس پر واجب ہے کہ اس رائے کو قبول نہ کرے اور وہ موقف اپنائے جو قرآن و سنت سے ہم آہنگ معلوم ہو رہا ہو۔

یہ ہیں عقیدتِ محمودہ کی ایجابی و سلبی حدیں۔ پھر یہ شرط بھی لازماً ملحوظ رکھنی ہوگی کہ عقیدت کا اظہار کسی ایسے مظہر اور قالب میں نہ ہو جو شریعت کی نظر میں مذموم یا مشکوک و مشتبہ ہو۔ مثلاً اولیاءِ کرام کو مرجعِ عقیدت بنانا تو مستحسن، لیکن ان کے قدموں یا ان کے دروازوں یا انکے مزاروں پر سجدے یا رکوع کی شکل میں جھک کر اظہارِ عقیدت کرنا مذموم و مردود۔ نیت صرف تعظیم ہی کی سہی پرستش کی نہ سہی لیکن تعظیم کی یہ خارجی ہیئتیں چونکہ خالقِ دو جہاں کے حق میں مخصوص ہیں اس لئے کسی اور کی خاطر انھیں اختیار نہیں کیا جائے گا۔

مرنے کے بعد روحیں کہاں جاتی ہیں۔ کیا کرتی ہیں۔ کیا کیا اوصاف اور صلاحیتیں اللہ نے انھیں دی ہیں۔ ان سوالات کی وضاحت قرآن و حدیث نے نہیں کی۔ محض کچھ اشارے ملتے ہیں جو علم تفصیلی کا فائدہ نہیں دیتے۔ اسی لئے شریعت نے اپنے حاملین کو اس باب میں کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرنے کا مکلّف نہیں بنایا۔ اسرارِ غیب اور رموزِ تکوینی اور عالمِ بالا کے بھید صرف وحی سے معلوم ہو سکتے ہیں قیاس اور تخمینے خارج از بحث ہیں۔ کشف و الہام اور رویائے صادقہ بلاشبہ وحی سے الگ ایک مقدس ذریعہ ہیں بعض انکشافاتِ غیبی کا لیکن دین میں انھیں حجت نہیں مانا گیا اور شیطانی آمیزش ان میں ممکن سمجھی گئی۔ اس طرح ثمرہ یہ برآمد ہوا کہ اہلِ قبور کی روحانی کرشمہ سازیوں کو جزوِ عقیدہ بنا کر قول و عمل کی عمارت اٹھانا اور کشفی تجربات کو حقائقِ ثابتہ جیسا سمجھ لینا اسلام کی تعلیم نہیں۔ معقولیت کا تقاضا نہیں احتیاط پر مبنی نہیں۔

قبوری شریعت کا تمام مسالہ اور مواد وہموں اور قیاسوں اور خوش فہمیوں اور خیالی پروازوں سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ رسالت صلعم یا عہدِ صحابہ رض میں اس کا سایہ تک نہیں ملتا۔ ہم اگر اس پر نکیر کرتے ہیں، ٹوکتے ہیں، احتجاج کرتے ہیں تو اسی لئے اور مروّجہ تصوف سے ناخوش ہیں تو اسی لئے۔ اس کا مطلب شاہ جیلانی یا خواجہ اجمیری یا جنید و شبلی رحمہم اللہ کی قرار واقعی عظمت و فضیلت کا انکار نہیں۔ انکار ہے تو اس فلسفۂ تصوف کا جو ان اکابر کے نام پر گڑھ لیا گیا ہے۔ انکار ہے تو اس کردار کا جو مزارات سے غیر معمولی دلچسپی اور توحید سوز وابستگی کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے۔

ہمارے محترم جناب ارشد القادری خواہ مزارات پر سجدے نہ کرتے ہوں، مگر غلوئے عقیدت سے بالکلیہ بچے ہوئے وہ بھی نظر نہیں آتے۔ مثلاً ہم نے لکھا تھا۔

"اس کسوٹی پر (یعنی قرآن و سنت کی کسوٹی پر) کھوٹا ثابت ہونے والا مال خواہ جنید و شبلی یا عطار و رومی کا ہو وہ بہرحال کھوٹا ہے اور اس

کموٹی پر کھرا ثابت ہونے والا سکہ خواہ خوارج
معتزلہ کے بازار کا ہو وہ بہر حال کھرا ہے۔"
ے نقل کر کے موصوف نے اس تاثر کا اظہار کیا ہے کہ
راز بیان نہایت دل خراش اور پُر شوخ جسارت کا
ہے۔ "ان کا احساس یہ ہے کہ اس میں" ازالۂ حیثیت
کا جذبہ نمایاں ہو گیا ہے۔"

اہلِ انصاف نہایت غور سے ہمارے منقولہ فقروں کے
فظ کا جائزہ لیں اور دیانتدارانہ فیصلہ دیں کہ کیا ہم
ب ایسا ہی بنیادی اصول بیان نہیں کیا جس پر امت
م اہل الرائے کا اتفاق ہے۔ ہماری ناچیز رائے میں جو
ں افراط وغلو کے زہر سے بچا ہوا ہو گا اسی فیصلے پر
کہ بات صدفی صد درست کہی گئی اور کسی بھی شخصیت
کی تحقیر وتنقیص نہیں کی گئی بلکہ قرآن وسنت کی قطعی اور
چیلنج حیثیت کو نمایاں کرنا اس عبارت کا واحد مقصود

س کے باوجود ہمارے محترم دوست اسے نہ صرف
بلکہ نہایت دلخراش اور پُر شوخ جسارت پر مشتمل
فرما رہے ہیں۔ یہ شخصیات کی غالی عقیدت کا کرشمہ
اور کیا ہے۔

ہ دردمندانہ انداز میں تحریر فرماتے ہیں:-
"کاش آپ کا قلم حقائق کی تعبیر میں شیوۂ
ادب کا بھی لحاظ رکھتا تو یقین کیجئے کہ آپ کے
لم دان کے بجائے مومنین کے قلوب میں اس کے
لئے جگہ ہوتی۔"

یہ اقرار کرنے میں ذرا تامل نہیں کہ ہمارے قلم
کی خطائیں ممکن ہی نہیں واقع بھی ہیں۔
ڈھائی صدی پر پھیلی ہوئی ہماری "قلم شگافی"
خامیوں اور لغزشوں سے آلودہ ہو گی۔ مگر
زیرِ بحث عبارت کا تعلق ہے اسے ہم مومنین
ل خراش ماننے پر آمادہ نہیں۔ "مومن" کی کوئی
تعریف موصوف مکرم کے ذہن میں ہو تو الگ

بات ہے ورنہ قرآن وسنت کی اصطلاح میں جن لوگوں کو
مومن کہا جاتا ہے وہ تو انشاء اللہ اس عبارت سے
کوئی خراش اپنے قلب پر محسوس نہیں کریں گے۔ نہ اسے
شوخ چشمی سے تعبیر کر سکیں گے۔

تجارتی سود تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے
جدید وقدیم دونوں علوم کی روشنی میں تجارتی سود پر گفتگو زبان سلیس، اسلوب شگفتہ
دلائل قوی، مواد محققانہ — چھ روپے ۶/-

احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت
از مولانا تقی امینی۔
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شریعت کے احکام زمانے کے تقاضوں اور تغیر پذیر حالتوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ تمام مواد حوالوں سے آراستہ۔ قیمت۔ غیر مجلد سات روپے ۷/-

تاریخ دیوبند
یہ مشہور کتاب اب عمدہ اضافوں کے ساتھ چھاپی گئی ہے۔
دیوبند کی مکمل تاریخ۔ محققانہ اور دلچسپ
قیمت —— آٹھ روپے

تفسیر رشیدی
مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے قلم سے بیس آیاتِ قرآنیہ کی قابلِ مطالعہ تفسیر عارفانہ اور محققانہ۔ قیمت —— ڈھائی روپے ۲/۵۰

انفاسِ عیسیٰ
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ کی تصنیفات سے تصوف وشریعت، اخلاق اصلاح معاشرہ اور دیگر بے شمار موضوعات پر دین ودانش کی روشنی میں دلچسپ اور روح پرور۔ اٹھارہ روپے ۱۸/-

مدارج سلوک
ڈاکٹر میر ولی الدین کی مفید کتاب موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مطالعہ آپ کے لئے مفید ہو گا۔ قیمت ساڑھے چھ روپے ۶/۵۰

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

جناب حافظ امام الدین رام نگری کی وقیع تصنیفات

افاضات سورہ یٰس شریف .... -/۷۵
انوارِ اسلام بجواب مصابیح الاسلام مکمل .... -/۵
اردو ہندی ماسٹر .... -/۵۰
ابو ایوب انصاریؓ (میزبانِ رسولؐ) .... -/۶۲
بے مثال زندگی .... -/۶۵
حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ .... -/۷۰
دستی ہندی مراسلات و کاغذات .... -/۲
رسالت محمدیؐ کے عقلی دلائل .... -/۱
سفرائے اسلام .... -/۷۵
عظمت روم و ایران اسلام کے قدموں پر .... -/۱
عقیدۂ توحید اور انسانیت .... -/۶۰
غیر مسلم علماء اور محاسن اسلام مجلد .... -/۳
معلم نماز اردو .... -/۶۵
معیاری اسلامی حکومت ۲/۲۵
نماز کے فضائل .... -/۱

دیگر مصنّفین

مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اردو جلد اول .... -/۱۵
" " " جلد دوم .... -/۱۸
بیٹے سے خطاب .... -/۱
مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ان کے ناقد .... -/۵
سوانح حضرت موسیٰؑ .... -/۱
سوانح حضرت عیسیٰؑ .... -/۱
سوانح حضرت داتا گنج لاہوریؒ .... -/۱
سوانح شیر شاہ سوریؒ .... -/۱
گنجینۂ اسرار و عملیات علامہ انور شاہ کشمیریؒ .... -/۲
تاریخ دیوبند (اضافہ شدہ) .... -/۸

شاہان دہلی یا اسلاف دیوبند (ملقب بہ ارواحِ ثلاثہ)
مسلم یونیورسٹی، مینارۂ نور یا ظلمت کدہ ....
سوانح محمد علی جناح ....
جوہرۂ نیرہ، قدوری کی عربی شرح ....
البلاغۃ الواضحہ عربی ....
نسخۂ عجیب ....
ایک اہم دینی دعوت (مولانا ابوالحسن علی ندوی)
مسلمانوں کی پریشانیوں کا بہترین علاج
جواہر الایمان ....
میری نماز مجلد عکسی ....
آسان نماز ....
منتخب تقریریں مجلد (مولانا منظور نعمانی)
مکتوبات حضرت علیؓ اردو مع عربی ....
حدیثِ دفاع - اردو مجلد ....

نہایۃ التحقیق اردو شرح مسند ابوبکرہ

یعنی جو کلام مبارک حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ سب کا سب یکجا ہے کہ ایک مستند اور دقیقہ رس عالم نے مسند احمد بن حنبل کی کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ اور اسی سلسلے کی پہلی نہایۃ التحقیق کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ سائز کے ۵۷۴ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت صرف بڑی اہم بات یہ ہے کہ فاضل شارح نے شروع کتاب طویل مقدمہ دیا ہے جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اردو خواں طبقے کے لئے فن حدیث کی بار اصطلاحوں اور اصولوں کو پوری تحقیق کے ساتھ فرمایا ہے۔ بلند پایہ کتابوں کا نچوڑ۔ فن حدیث کی علو بیش بہا خزانہ۔ امید ہے شائقین اس تحفۂ نادرہ سے اٹھائیں گے۔ قیمت ــــ پندرہ روپے -/۱۵ مجلد سترہ روپے -/۱۷

تفسیرِ ماجدی

۱۷

سورۂ انفال ۳۴ ویں آیت :- (جو سہو کتابت سے
ہ میں ۳۳ ویں بن گئی ہے) وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ
اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الآیہ -
ات یہ چل رہی ہے کہ اللہ جل شانہٗ ان نالائقوں کا
ے ہیں جو دینِ حق کو قبول کرنے کے بجائے ازراہِ
دعا کرتے تھے کہ اے اللہ اگر یہ واقعی دینِ حق
ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا اور کوئی دردناک
نازل کر دے - اللہ اپنے رسولؐ سے فرماتا ہے کہ
حالت میں تو انھیں عذاب نہ دیں گے جب تم بھی
جود ہو اور ہم ایسی حالت میں بھی عذاب نہیں نازل
ب کہ کسی قوم میں استغفار کرنے والے قابلِ لحاظ
ں موجود ہوں - لیکن ان کی طعن آمیز دعا پر فوری
نازل نہ کئے جانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان میں
اب کا یہ ہے جس کی بنا پر وہ عذاب سے بچے ہی

ن آخری ٹکڑے کے لئے باری تعالیٰ نے منقولہ
ز استعمال فرمائے - ان کا ترجمہ مولانا دریا بادیؒ نے

ں یہ بھی ان لوگوں کے لئے نہیں کہ اللہ ان
عذاب (ہی) سرے سے) نہ لائے درانحالیکہ
مجد حرام سے روکتے ہیں۔"

یہ نہیں کہ ماحصل کے اعتبار سے ترجمہ درست ہے اور
ان کی مراد سمجھ میں آجاتی ہے - لیکن کیا اس نے
بھی ادا کر دیا ! ــــ نگاہ وَمَا لَهُمْ کے ترجمے

پر رکھتی ہے - مَا عربی میں نفی کے لئے بھی آتا ہے اور
استفہام کے لئے بھی - استفہام اقراری ہو یا انکاری یا واقعۃً
سوال ہی مقصود ہو - بہر صورت مَا استفہامیہ الگ ہے
اور مَا نافیہ الگ - ممدوح نے مَا کو نافیہ مان کر ترجمہ کیا
ہے :-

" ہاں یہ بھی ان لوگوں کے لئے نہیں -"

یہ وَمَا لَهُمْ کا ترجمہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں استفہام
نہیں نفی ہے - مگر جب ہم معروف مترجمین کے ترجمے دیکھتے
ہیں تو نظر آتا ہے کہ یہ سب مَا کو استفہامیہ مان رہے ہیں -
ممدوح کے شیخ اور مرشد مولانا تھانویؒ کا ترجمہ یہ ہے

" اور ان کا کیا استحقاق ہے کہ ان کو اللہ سزا نہ
دے -"

شاہ عبدالقادرؒ یہ ترجمہ فرماتے ہیں :-

" اور کیا ہے ان کو کہ عذاب نہ کرے انکو اللہ تعالیٰ "

حضرت شیخ الہندؒ کے الفاظ ہیں :-

" اور ان میں کیا بات ہے کہ عذاب نہ کرے ان پر
اللہ -"

مولانا مودودی کا فقرہ یہ ہے :-

" لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے -"

علامہ آلوسیؒ نے وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ کی
شرح میں لکھا ہے :-

" اَیُّ اَیُّ شَیْئٍ لَهُمْ فِی انْتِفَاءِ الْعَذَابِ
عَنْهُمْ "

کیا ــــ کیوں - اَیُّ - یہ سب حروف سوال و استفہام

ہی کے تو ہیں۔ اگر بلاغتِ کلام کے اعتبار سے یہاں مَا نافیہ یا استفہامیہ ماننا یکساں ہوتا تو وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ تقریباً مترجمین و شارحین استفہامیہ ہی پر کیوں اتفاق کرلیتے

ہمارا عاجزانہ خیال ہے کہ زورِ کلام استفہام ہی کی صورت میں ہے۔ نفی سے مفہوم تو خبط نہیں ہوتا لیکن زور گھٹ جاتا ہے۔ اردو میں بھی شدتِ انکار کیلئے استفہامِ انکاری کا اسلوب عام ہے۔ ممدوح جیسے نیک نام اور مشاق صاحبِ قلم سے توقع اس کی ہی کی جاسکتی تھی کہ فصاحت و بلاغت کے معیارِ اعلیٰ سے وہ نیچے نہیں اتریں گے ہم جیسے اناڑی خطا کھا جائیں تو کوئی بات نہیں۔

---

(۲) آیت ۵۷ - فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ الآیہ۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلعم کو کچھ سیاسی و حربی ہدایات دے رہا ہے۔ ایک ہدایت یہ ہے کہ جو لوگ بدعہد ہوں اور تجھ سے معاہدے کرکے بار بار معاہدہ شکنی کرتے ہوں وہ نرمی اور رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ وہ اگر کہیں جنگ میں تیرے ہتھے چڑھ جائیں تو انھیں ایسی سزا دے، ایسا مزا چکھا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔

آیت کے آخری الفاظ یہ ہیں۔ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ

تفہیمات جاری میں ان کا ترجمہ یہ ملتا ہے:۔

"تاکہ دوسرے لوگ بھی سمجھ جائیں۔"

اس ترجمے میں حکیم الامۃ مولانا اشرف علیؒ ان کیسا تھ ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ حکیم الامۃ کے اتباع میں انھوں نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ذکر، تذکر، تذاکیر وغیرہ موقعہ بموقعہ متعدد مفاہیم میں استعمال ہوتے ہیں، اور ایک مفہوم سمجھنا سمجھانا بھی ہے۔ لہٰذا یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ممدوح نے یا حکیم الامۃؒ نے لغوی غلطی کی۔ مگر اہلِ نظر عدل فرمائیں کہ محل کی مناسبت سے کیا یہ ترجمہ انشائے عالی کے زمرے میں آسکتا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ نے "نصیحت پکڑیں" رقم فرمایا۔
شیخ الہندؒ نے ـــ "تاکہ ان کو عبرت ہو۔"

مولانا مودودی کے یہاں "سبق لینے" کا محاورہ ہے

صاحبِ روح المعانی لکھتے ہیں:۔

یعنی افعل بھولاء	یعنی اے رسول جن لوگوں نے تم سے
الذین نقضوا عھدك	بدعہدی کی ہے ان کی گرفتاریں بھی نا
نعلاً من القتل والتنکیل	اور دوسری سخت سزائیں بھی دو تا
العظیم یفرق عنك	وہ بدحواس ہوکر بھاگ پڑیں اور ا
ویخافك بسببه من	حالتِ زار دیکھ کر وہ لوگ خوفزدہ ہو
خلفھم ویعتبر به	جو پیچھے رہ گئے ہیں (یا جو بعد میں آ
من سمعه من اھل	والے ہیں) اور اہلِ مکہ یا دوسر
مکة وغیرھم۔	جگہوں کے باشندوں میں سے جو بھی
	عبرت پکڑے۔

٭ ٭ ٭ ٭

یہیں علامہ آلوسیؒ نے ایک دوسرے قول کے الفاظ نقل کئے ہیں:۔

لیتعظ من سواھم۔ اس کے بھی معنی یہی ہیں کہ تا دوسرے نصیحت پکڑیں۔"

خلاصہ یہ کہ "سمجھ جائیں" بڑا پھسپھسا ترجمہ ہے جو موقع محل اور قرآنی زورِ کلام سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ہمیں اس کے ساتھ اقرار ہے کہ پھسپھسے پن کی تعریض کا نشانہ تنہا ممدوح نہیں بنتے ہمارے استاذ الاساتذہ اور مقتدیٰ حضرت تھانویؒ بھی بنتے ہیں لیکن اللہ کے اس فرمان سے منہ موڑ کر ہم کس گھر کے رہیں گے کہ سچی گواہی دو چاہے وہ تمھارے اپنے ہی خلاف کیوں نہ پڑتی ہو۔ اللّٰھم اغفرلی۔

آیت ۷۲:۔

فرمایا یہ جا رہا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور گھربار چھوڑا اور جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے انھیں پناہ دی اور ان کی مدد کی یہی سب ایک دوسرے کے رفیق، مونس و غمخوار اور دوست ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر حکمِ ہجرت نازل ہونے کے بعد اپنے گھر ہی ٹکے رہے ہجرت نہیں کی تو اے رسولؐ اور اس کے ساتھیو تمھیں ان کی رفاقت و ولایت سے کوئی سروکار نہ

جب تک کہ وہ ہجرت کر کے تم میں نہ آملیں۔

قرآن نے لفظِ وَلَایَۃ استعمال کیا ہے جس سے ولی مشتق ہے اور اسی کی جمع اولیاء ہے جو آیت میں موجود ہے۔ وَمَا لَکُمۡ مِّنۡ وَّلَایَتِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ کا ترجمہ مولانا دریابادی نے یہ کیا:۔

"تمہارا ان سے کوئی تعلق میراث کا نہیں۔"

یہاں بھی ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ حکیم الامتؒ ملن کے ساتھ ہیں۔ مگر یہ عرض کرنے سے ہم پھر بھی باز نہ آئیں گے کہ ترجمے میں لفظ میراث لانا خلافِ احتیاط ہے۔

ہمیں علم ہے کہ خیر الامۃ حضرت ابن عباس اور حضرت حسن بصری اور مجاہد اور سدی اور قتادہ رحمہم اللہ لفظ ولایت کو یہاں میراث کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور ہماری یہ بھی مجال نہیں کہ ان کی رائے پر انگلی اٹھا سکیں لیکن حقائق بہر حال حقائق ہیں جن پر افراد و اشخاص کو قاضی نہیں مانا جا سکتا۔ حقیقتِ ثابتہ یہ ہے کہ لفظ ولی قرآن میں بارہا دوستی اور رفاقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس آیت میں لفظِ ولایت یا لفظِ اولیاء کو میراث میں منحصر کر دینا ایک ایسا فعل ہے جس کے لئے آیت میں کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے۔ ایک ایک حرف آپ کے سامنے ہے۔ تلاش کیجئے اس میں کہاں کوئی ایسا برہان پایا جا رہا ہے جو اس پر مجبور کر دے کہ ولایت کے ساتھ میراث کو لازماً جوڑا جائے۔

اگر نہیں پایا جا رہا ہے تو کیا احتیاط کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ترجمے کو ہم کلامِ باری ہی میں محدود رکھیں اور اپنے یا کسی بھی بزرگ کے خیال کو تفسیری نوٹ میں پیش کریں۔ جب اللہ ہی نے یہاں میراث کا مفہوم دینے والا کوئی لفظ ارشاد نہیں فرمایا تو ترجمے کے شایانِ شان یہ تھا کہ وہ میراث کی تخصیص و تحدید سے خالی ہو۔

چھوٹا منہ بڑی بات نہ سمجھی جائے تو ہم عرض کریں گے کہ میراث کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہیں جن کا حکم اس آیت سے نکلتا ہے۔ ولایت وسیع المصداق ہے۔ بے شک وراثت کی نفی بھی اس سے ہو گئی لیکن بعض اور چیزوں کی بھی نفی ہوئی جو دوستی کے تقاضوں میں شامل ہیں۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ [علیہ] وسلم ہی نے فرمایا ہے کہ انا بریٔ من کل مسلم [ا]ظہر انی المشرکین (میں ان تمام مسلمانوں سے بری [ہ]وں جو کفار و مشرکین کے ساتھ رہ بس رہے ہیں) یہ صر[ف] ولایتِ میراث ہی کی نفی نہیں۔ رفاقت و دوستی کی بھی ن[فی] [ہے اور] سیاسی دائرے میں اس سے گوناگوں نتائج نکلتے ہیں او[ر] وجہ نہیں کہ قولِ باری یا قولِ رسولؐ کی عمومیت کو بلا دلیل تخصیص و محدود کر کے اس کے وسیع اطلاق اور اثر پر ر[و]ک لگائی جائے۔ تفسیر کوئی جو چاہے کہے۔ مگر گفتگو ترجمے میں [ہے]۔

حضرت شیخ الہندؒ اولیاء کا ترجمہ رفیق کرتے ہیں ولایت کا رفاقت۔ میراث کا اشارہ تک نہیں دیتے۔

شاہ عبدالقادرؒ ترجمہ فرماتے ہیں:۔

"جو کوئی ایمان لائے ہیں اور ترک وطن نہیں کیا ہے واسطے تمہارے دوستی ان کی کسی چیز سے جب تک ترک وطن کریں وہ۔"

کتنا صاف ہے کہ شاہ صاحب ولایت کا ترجمہ "دوستی" کر کے آیت کو اس کے مفہوم عام ہی میں رکھنا پسند کر ر[ہے] ہیں اور "کسی چیز" لکھ کر انھوں نے عموم پر اور بھی زور د[یا]۔ آیت کے الفاظ مالکم من ولایتہم من شیئ بھی ایسے ہی ہیں جو عمیم پر زور دے رہے ہیں۔ من شیئ کا زو[ر] زبان پر پوشیدہ نہیں۔

سورۂ انفال کے ترجمے کی حد تک تبصرہ تمام ہو[ا]۔ تفسیر پر بھی نگاہ ڈال لیں۔

(۱) پہلی آیت کی تفسیر میں یہ فقرہ پڑھنے میں آیا۔

"اپنے آپس کے سالقہ کو اپنا سنبھالو، سنوارو کہ باہمی رشک و مسابقت کا نام و نشان نہ رہے۔"

یہ "سالقہ" کتابت کی کوئی کاریگری ہے یا کوئی ایسا لفظ ہے جس سے ہم واقف نہیں۔ بہر حال سمجھ میں نہ آ سکا۔

---

(۲) قرآن میں بات معرکۂ بدر کی بات چل رہی ہے۔ اللہ تعا[لیٰ]

ں کو حکم دیا کہ میرے جو تھوڑے سے مومن بندے
ں کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے ہیں ان
ت قدمی پیدا کرو۔ میں ابھی کافروں کے دلوں
، ود ہشت اور رعب ڈالے دیتا ہوں۔ ان کے
مدو اور پور پور کاٹ ڈالو۔
فاظ یہ ہیں :- فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ
بوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۔ ہم اس سے بحث
ے کہ یہ آخری حکم فرشتوں کے لئے تھا یا مومنوں کے
لوں کے لئے۔ یہ ایک مستقل بحث ہے۔ مخاطب
، مان لیجئے کلام تفسیر ماجدی کے مندرجہ ذیل
ہے :-
جنگ ظاہر ہے کہ دست بدست تھی۔ نیزوں
داروں سے اسی جنگ کے لئے (بلکہ کہنا چاہئے
ہر جنگ کے لئے) اس سے بڑھ کر حکیمانہ ہدایت
رکیا ہو سکتی ہے کہ دشمن کے سپاہیوں کی انگلیوں
وار کرو اور ان کی جان لئے بغیر ہی انھیں
ائی کے ناقابل بنا دو۔"
ٹ کو پڑھ کر ہم دنگ رہ گئے ہیں۔
انی معاف ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص
، زید کو مار مار کر ہڈیاں سرمہ بنا دو اور ہم اس کا
فہوم لینے کے عوض الفاظ کے چکر میں پڑ جائیں
ں کہ واقعی ہڈیوں کو کھرل کرنے کا حکم دیا گیا ہے
تحقیق دینے لگیں کہ ہڈیوں کا سرمہ بنانے میں
، حکمت و مصلحت ہے۔
بب تر یہ ہے کہ پور پور کاٹ ڈالنے کا آرڈر
فوق الاعناق کے متصل بعد دیا گیا ہے۔ گردنوں
کاٹنے کا مطلب کوئی یہ لینے لگے کہ ڈنڈا مار کر
مردہ تو اسے نادان کہیں گے۔ یہ الفاظ گردن
اور سر کاٹ ڈالنے کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔
نے بھی اسی مفہوم پر اسے تسلیم کیا ہے۔ پھر کیا
ں نکتہ سنجی کا کہ انگلیوں پر وار کرو تاکہ وہ حرب

بغیر ہی ناکارہ ہو جائیں ـــ گویا ایک ہی سانس میں اللہ تعالیٰ قتل کر ڈالنے کا بھی اذن دے رہے ہیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بس انگلیاں کاٹو جان سے نہ مارو۔

بنانۃ بے شک انگلیوں کے سروں کو کہتے ہیں جنھیں پور بولا جاتا ہے۔ اور بنان اسی کی جمع ہے لیکن جس طرح اوپر کی مثال میں سرمہ کا مطلب واقعی سرمہ نہیں ہوتا اسی طرح یہاں بنان کا مطلب پورے نہیں بلکہ محاوراتی زبان میں یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ ان دشمنانِ خدا کیساتھ ذرا نرمی مت برتو۔ ان کے سر اڑا دو۔ تکا بوٹی کر دو۔ جوڑ جوڑ کاٹ ڈالو۔ جس کروٹ داؤ چلے چلاؤ۔ یا اسلئے کہ۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۔ یہ بدبخت اللہ اور رسولؐ کے دشمن اور مخالف بنے ہیں ـــ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ اور جو اللہ اور رسولؐ کا مخالف بنے تو سن رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔

آگے پیچھے دیکھئے۔ اللہ کو ان بدبختوں پر کتنا غصہ ہے جو میدانِ بدر میں اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ پھینکنے کا ارادہ کر کے آئے ہیں۔ جو اپنی کثرت اور تیاری پر اکڑ رہے ہیں جنھیں اللہ اور رسولؐ سے کد ہے۔ ایسے مغضوبوں کے لئے اللہ جب یہ فرمائے گا کہ ان کی گردنیں ناپ دو پور پور کاٹ ڈالو تو کیا اس کا یہ مطلب لینا ممکن ہوگا کہ بڑی احتیاط سے بس انگلیاں کاٹو جان نہ نکلنے پائے یا قطعی طور پر یہ مطلب ہوگا کہ اللہ حرب و ضرب کی شدت پر ابھار رہا ہے۔ تلقین کر رہا ہے کہ دھجیاں اڑا دو۔ قیمہ کر ڈالو۔ کشتوں کے پشتے لگا دو۔ تلواروں کی دھار اور نیزوں کی انی اور تیروں کی بوچھار پر رکھ لو۔ یہ سارے محاورے حرب و ضرب میں تکثیر و تشدید کے لئے استعمال ہوتے ہیں کھال کھینچ لو۔ کھال گرا دو۔ ہڈیاں سرمہ کر دو۔ بوٹیاں نوچ لو۔ بھون ڈالو۔ اس نوع کے محاورات میں الفاظ کے لغوی معانی قطعاً پیش نظر نہیں ہوتے۔

قرآن ہی میں ایک اور جگہ لفظ بنان آیا ہے۔

کیا آدمی یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہ کریں گے۔ بَلٰی قَادِرِیْنَ عَلٰی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ (ہاں ہم اس کی پوریاں درست کرنے پر بالکل قادر ہیں) صاف ظاہر ہے کہ یہاں بھی بنان سے مراد صرف انگلیوں کے سرے نہیں۔ اللہ یہ نہیں کہہ رہا کہ دوبارہ جب ہم مُردوں کو زندہ کریں گے تو اس کی صرف پوریاں جوڑیں گے پورا جسم نہیں۔ کہہ یہ رہا ہے کہ دوبارہ جب ہم زندہ کریں گے تو ان کا جوڑ جوڑ، پور پور، سارے اعضاء، پورا جسم حیاتِ نو کا جامہ پہنے گا۔ بدن کا چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی ایسا نہ رہے گا کہ ناقص و ناتمام رہ جائے۔ مُردہ رہ جائے یکم رہ جائے۔

بس ایسے ہی زیرِ گفتگو آیت میں بنان سے مراد سرِ انگشت نہیں ہیں بلکہ سارا جسم ہے۔ اس کا ہر ہر جوڑ، ہر ہر حصہ۔ جہاں بس چلے ضرب لگاؤ۔ انتھک وار کرو۔ برقِ خاطف بن کر ٹوٹ پڑو۔ ٹکڑے اُڑا دو۔ بھس ڈالو۔ کھالیں گرا دو۔ یہی وہ اسپرٹ ہے جو اسلام ہر فیصلہ کن جہاد میں مجاہدین کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے اور میدانِ مقابلہ میں برسرِ پیکار دشمن کے آگے کسی نرمی، سستی، رعایت، ڈھیل کا روادار نہیں۔

تعجب در تعجب ہے کہ انگلیاں کاٹنے کو مبنی بر حکمت قرار دیتے ہوئے ممدوح نے اس ہدایت کو فقط ماضی کی جنگوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ بریکٹ میں یہ بھی لکھ دیا کہ "ہر جنگ کے لئے" حالانکہ ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ تلوار کا دور ختم ہوا۔ اب تو مدت سے بندوقیں، رائفلیں، توپیں چلتی ہیں، بم پھٹتے ہیں، انگلیاں کاٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر واقعی یہ کوئی ہدایت ہوتی تو فقط تلواروں والی جنگوں کے لئے ہو سکتی تھی مگر تاریخ تو دورِ رسالت اور دورِ خلافت کے بارے میں بھی یہ نہیں بتاتی کہ حضورؐ یا صحابہ کرام رضؓ نے کسی بھی جنگ میں اس ہدایت پر عمل کیا ہو اور بیچ بیچ دشمنوں کے محض انگلیوں والے پورے کاٹنے پر اکتفا کرنے کی کوشش کی ہو کہ وہ مرنے نہ پائیں۔ ہم ایک بھی مثال اس کی نہ پا سکے حالانکہ اگر ایسی ہدایت ہوتی تو رسولؐ اور صحابہؓ سے بڑھ کر کون روایاتِ قرآنی پر عمل کرنے والا تھا۔

ہماری ناچیز رائے میں اس طرح نکتے نکالتے وقت ہر نیک دل کو منطقی، لسانی اور واقعاتی پہلوؤں پر بھی نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔ حضرت ممدوح تو محاوروں کے بادشاہ ہیں، وہ خود بھی جب یہ کہتے ہوں گے کہ جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے تو یہ مراد نہ ہوتی ہوگی کہ بس بدن کے صرف اُن مقامات پر درد ہے جہاں جوڑ واقع ہوئے ہیں بلکہ یہ مراد ہوتی ہوگی کہ سارا بدن دُکھ رہا ہے۔ اسی طرح کوئی دشواری نہ تھی اگر یہ محسوس فرما لیا جاتا کہ اللہ تعالیٰ گردنیں قلم کرنے کی ترغیب دے کر جب لفظ بنان استعمال کر رہا ہے تو اس کا مصداق انگلیوں کے سرے نہیں ہیں بلکہ پورا جسم اور اس کے جملہ اعضاء ہیں۔

مزید تحیّر۔ فاضربوا فوق الاعناق کے تحت ممدوح لکھتے ہیں:۔

"یعنی اگر ان کے اُوپر کے حصے پر وار کرو تاکہ حریف فوراً مر جائے۔"

گویا مان رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مار ڈالنے ہی کی ہدایت فرما رہا ہے مگر پھر بھی یہ نکتۂ نادرہ نکال رہے ہیں کہ جان نہ لو بس انگلیاں کاٹ دو۔

ویسے "اوپر کے حصے" کی بات بھی قابلِ نظر ہے۔ ممدوح نے چند سطر پہلے خود تحریر فرمایا کہ یہاں فوق کا لفظ علیٰ کے معنی میں ہے۔ یعنی مراد یہ نہیں کہ گردن کے اوپر والے حصے پر تلوار مارو یا نیچے والے حصے پر یا درمیانی حصے پر بلکہ گردن پر تلوار چلانا مراد ہے۔ یہی بات ٹھیک بھی تھی یہ قربانی کے جانور کو ذبح کرنے کا مسئلہ نہیں تھا کہ چھری چلانے کا ٹھیک مقام بھی بتایا جاتا۔ یہ تو اُس معرکۂ کارزار کا مسئلہ تھا جہاں تلواریں برق بن کر گرتی ہیں اور نیزے جسموں کے آر پار ہو جاتے ہیں۔ جہاں اس کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا کہ گردنوں کے بالائی اور زیریں حصے ٹٹولے جائیں۔

مگر آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ چند ہی سطر بعد ممدوح نے اپنے ہی ارشاد کو بھلا دیا اور فرمایا کہ گردن کے اُوپر کے حصے پر وار کرو۔ تضاد سا تضاد!

حضرت عطاءؒ اور حضرت عکرمہؓ سے منقول بھی ہے کہ فوق الاعناق سے مراد ہے الرؤس (سر) یعنی سر قلم کرو۔ نیز یہ قول بھی آلوسی نے نقل کیا ہے کہ فوق کا لفظ زائد ہے مراد صرف گردنیں ہیں۔

ہر زائد لفظ محاورات میں حشو نہیں کہلاتا۔ مثلاً بولتے ہیں کہ — "اتنا ماروں گا کہ اُدھیڑ کر رکھ دوں گا"۔ اس میں "رکھ دینا" زائد ہے۔ اس کا کوئی عملی مصداق نہیں۔ مقصد بس یہ کہنا ہے کہ اتنا ماروں گا جس سے کھال اُدھڑ جائے گی۔ اُدھڑی ہوئی کھال کو اٹھا کر کہیں حفاظت سے رکھنا بولنے والے کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں۔ اس کے باوجود یہ زیادتی حشو نہیں ہے بلکہ زور پیدا کرنے والی ہے اور اہلِ زبان اس پر صاد کرتے ہیں۔ اسی طرح فوق کا لفظ اس آیت میں محاوراتی اسلوب کی تکمیل کر رہا ہے۔ خوبصورت ہے۔ چست ہے۔ اس سے گردن کے بالائی حصّے کی طرف اشارہ نہیں بلکہ نفسِ گردن ہی کی طرف ہے۔ اور غور کیجئے تو گردنیں (اعناق) بھی یہاں کنائے کی حیثیت سے مذکور ہیں۔ مقصود کلام یہ ہے کہ انھیں موت کے گھاٹ اُتار دو۔ اگر سینے میں برچھی یا پہلو میں خنجر یا سر میں گولی اُتار دی تو یہ بھی ہدایت کے مطابق ہی ہوگا۔ یہ نہیں کہیں گے کہ ہدایت تو گردنیں مارنے کی تھی کسی اور طرح قتل کر کے خلاف ورزی کا ارتکاب کیا گیا۔ گردنوں کو تلوار کی دھار پر رکھ لینا بجائے خود محاورہ ہے قتل کے لئے۔ قرآن مخاطبین کو طریقۂ قتل نہیں سکھا رہا ہے۔ نہ یہ وضو کا مسئلہ ہے کہ گردن کے مسح سے واقعی گردن کا مسح ہی مقصود ہو۔ یہاں شدید قتال کی تلقین ہے۔ مار ڈالو۔ دھجیاں اُڑا دو۔ بھرکس نکال دو۔

فوق کی جگہ علیٰ کیوں نہیں کہا گیا۔ اس کی بھی وجہ مخفی نہیں۔ قرآن ہی سے نظیر لیجئے۔ فرمایا گیا۔ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ (انعام) اور وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ (اعراف) دونوں جگہ فوق علیٰ ہی کے مرادف ہے۔ مگر علیٰ کے مقابلے میں اس کا فائدۂ مزید یہ ہے کہ اس سے غلبے کا اظہار ہوتا ہے۔ جب کہ یہاں اللہ کے غلبے اور قوتِ کاملہ کا ظہور ہو رہا ہے تو انسب یہی تھا کہ فوق کا لفظ لایا جائے جو سفلیت اور تحت کا متقابل ہے۔ اسی طرح فوق الاعناق غلبے ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو شخص گردن مارے گا وہ کم سے کم اس مقتول کی حد تک تو غالب و فاتح ہی ہوگا۔ یہی بین السطور یہاں لفظِ فوق کو علیٰ کے مقابلہ میں افصح اور ابلغ بناتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کو عربی محاورات اور روز مرہ کی روشنی میں پڑھنا ہی واحد صحیح طریقہ ہے سمجھنے سمجھانے کا۔ خالی لغات کے گرد چکر لگانا بارہا غلط سمت میں لے جاتا ہے۔

---

(۳) ۲۹ ویں آیت کے آخری فقرے وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ کے تحت تفسیری نوٹ کا فقرہ :-

> "اور اس سے بڑے داتا کی ساری بخشش اور نعمتیں تمھارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی ہیں۔"

نہیں سمجھ میں آیا کہ اس فقرے کی ساخت کیا ہے۔ مطلب تو بظاہر صاف ہی ہے۔ لیکن "اس سے بڑے داتا" کے الفاظ کیا مفہوم ادا کر رہے ہیں یہ صاف نہیں ہوا۔

---

(۴) ۴۱ ویں آیت میں وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا آیا ہے۔ اس پر ممدوح نے جو تفسیری نوٹ دیا ہے لعل و جواہر سے زیادہ قیمتی ہے۔ ہم نے ایک سے زائد بار پڑھا اور دل ہی دل میں جزاک اللہ کہتے رہے۔

آپ بھی پڑھیئے :-

> "عبدنا سے عبدِ کامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مراد ہونا ظاہر ہی ہے۔ خوب خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید اُن شاعرانہ تعبیرات سے کتنا الگ رہتا ہے جو بعد کو شاعروں، واعظوں اور غیر محتاط علماء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بطور اسماء صفاتی گھڑ لیں۔ قرآن

جہاں بھی کمالِ تقرب وکمالِ خصوصیت ظاہر کرنا چاہتا ہے عبد ہی کا لفظ لاتا ہے مثلاً نزولِ قرآن مجید کے سلسلے میں وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا یا واقعۂ معراج کے سلسلے میں سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام یا پھر فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ اور بعض محققین تو یہ لکھ گئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبودیت آپؐ کی رسالت سے افضل ہے اس لئے کہ عبدیت ہی تو آپ کو خلق سے حق کی طرف لے گئی اور رسالت میں صورت اس کے برعکس ہے

اور اسی لئے کلمۂ شہادت میں بھی آپ کے عبد ہونے کو آپ کے رسول ہونے پر مقدم رکھا گیا ہے۔"

یہ نوٹ نہ صرف بریلوی مکتبِ فکر کو بڑا گراں گذرے گا بلکہ دیوبندی حلقوں میں بھی بہتیرے گرامی قدر اسے استحسان کی نظروں سے نہیں دیکھیں گے مگر ہمارے نزدیک یہ صحیح ترین نقطۂ نظر کا حامل ہے اور اس لائق ہے کہ آبِ زر سے لکھا جائے۔

ویسے اس کے متصل بعد جو چند عربی فقرے نقل کئے گئے ہیں ان کا حوالہ ناقص ہے۔ بریکٹ میں بس "ابوالبقاء" لکھ دیا گیا۔ بھلا کون سمجھے گا کہ یہ صاحب کون ہیں اور کہاں سے ان کا فرمودہ نقل کیا گیا ہے۔ (جاری)

ضیاء القرآن

قرآن کریم کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے کیلئے ایک آسان اُردو تفسیر

مستند تفاسیر و احادیث کی روشنی میں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق ایک ایسی تفسیر جسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

(۱) اندازِ بیان انتہائی سادہ و دلکش (۲) ضروری عنوانات کے تحت آیات کی تشریح (۳) "آیت پر غور کیجئے" کا عنوان ے کر قرآن کی ہدایات کے مطابق زندگی گذارنے کی دعوت (۴) خالص اصلاحی و تبلیغی انداز (۵) اس تفسیر کے مطالعے لے بعد آپ اپنے ذہن و قلب میں پاکیزگی محسوس فرمائیں گے۔

● کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ ● دو دو مہینے کے وقفے سے تقریباً ۱۰۰ صفحات پر ایک ایک پارہ شائع کیا جا رہا ہے ● ایک پارہ کا ہدیہ چار روپے ● تین حضرات مل کر تفسیر طلب کریں تو مشترکہ وی پی دس روپے میں۔ اور پانچ حضرات مل کر تفسیر طلب فرمائیں تو مشترکہ وی پی پندرہ روپے میں روانہ کی جاتی ہے (محصول ڈاک ہر حال میں معاف) صرف ایک خط لکھ کر مکمل تفسیر کے لئے اپنا پتہ درج کرائیے۔ اپنے عزیزوں، دوستوں کو بھی خریدار بنائیے۔

ہمارا پتہ:- کتب خانہ نعیمیہ۔ دیوبند (یو۔پی)

مُلّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

کرنا گفتگو کا صوفی نُطقُ اللہ سے

صوفی نُطقُ اللہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ آنکھوں میں چمک تھی، چہرے پر بلا کا نور۔ عام حالات میں وہ اخبارات کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے مگر اِس وقت ان کے دستِ مبارک میں تہہ کیا ہوا اخبار تھا۔ ظاہر ہے کوئی حیرتناک خبر لے کر آئے ہوں گے۔ میں نے بیٹھک کھول کر بٹھایا۔

"کیوں میاں۔ بجھے بجھے کیوں نظر آرہے ہو۔ گھر میں خیریت ہے نا؟" انھوں نے پوچھا۔

"آپ کی دعائیں ہیں۔ خیریت نام کی چیز تو عرصۂ دراز سے نظر سے نہیں گزری"۔

"ہائیں"۔

"آپ حکم فرمائیں۔ کیا خدمت بجا لا سکتا ہوں"۔

"میاں کیا خیریت کی باتیں کرتے ہو۔ ہم تو تمہاری ہمدردی میں خانقاہ سے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ ناشتہ تک نہیں کیا"۔

"آپ کی نوازشات کا ہمیشہ سے ممنون ہوں۔ چلئے ہوٹل میں کچھ کھا پی لیں گے"۔

"نالائق ہو۔ یعنی تمہارے گھر بیٹھے ہیں اور کہتے ہو ہوٹل میں کھا پی لیں گے"۔

"آپ نہیں جانتے قبلہ"۔ میں کراہا۔ "آجکل میری بیوی غالب پر ریسرچ کر رہی ہے"۔

"تو کیا ہوا؟"۔

"شاید سنا ہوگا آپ نے۔ غالب نے کہا تھا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر"۔

"لاحول ولا قوۃ۔ شاعری کا خود خانہ نوش سے کیا تعلق۔ اور میاں تمہاری بیوی کونسی عالم فاضل ہے کہ غالب کا کلام سمجھ لے گی"۔

"وہ بس ریسرچ کر رہی ہے۔ سمجھنا کیا ضروری ہے"۔

"بعض اوقات بہت بے تکی ہانکتے ہو۔ ریسرچ تو محققین کرتے ہیں۔ تحقیق بلا سمجھے کون کر سکتا ہے"؟

"یہی میں بھی اسے سمجھا رہا ہوں۔ مگر وہ کہتی ہے سچ کی کی توہین کی۔ اسی بات پر ہم میں جنگ ہوگئی ہے۔ تین دن تک وہ اپنی چھت کے نیچے چولھا نہیں جلنے دیگی"۔

"تو کیا یہ گھر تم نے اس کے نام لکھ دیا ہے؟"۔ موصوف نے ذرا آواز دبا کر پوچھا۔

"ہرگز نہ لکھتا اگر میرا ہوتا۔ یہ تو کرایہ کا ہے"۔

"استغفر اللہ۔ پھر وہ کیسے دھونس جما رہی ہے"۔

"مثل مشہور ہے تگڑا مارے اور رونے نہ دے وہ دھمکی دے رہی ہے کہ غالب کے بعد اقبال اور مولانا روم پر بھی ریسرچ کرے گی"۔

"میاں کیوں ہمیں بیوقوف بناتے ہو۔ سنا ہے تمہاری زوجہ تو بہت خوش مزاج ہے۔ سراج الدین کی والدہ کہہ رہی تھیں کہ ملا کی بیوی جیسی بیوی تو اللہ سب کو دے"۔

"خوش مزاجی سے تو میں نے انکار نہیں کیا۔ یہ بات اس نے مسکرا کر ہی کہی تھی کہ اب تین دن تک گھر میں کچھ نہیں پکے گا۔ ہوٹل سے کھاؤ یا صوم وصال رکھو"۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ تلنے کی خوشبو تو اب بھی اندر سے آرہی ہے"۔

"ہو سکتا ہے غالب کا کوئی شعر تلا جا رہا ہو۔ وہ جب کسی شعر کو سمجھ نہیں پاتی تو گرم پانی میں ابال کر اس کا ست نکالتی ہے"۔

"بکواس مت کرو۔ ہم تمہارے لئے ایک بڑے کام کی چیز لائے ہیں۔ ہمارا ظرف دیکھو۔ تجلی کس قدر زہر اگلتا ہے مگر ہم پھر بھی اس کے بدخواہ نہیں۔ آجکل وہ نرغے میں ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ تصوف و طریقت سے بیر رکھ کر آدمی جائے گا کہاں۔ اولیاء اللہ کی پھٹکار تو بڑے بڑے رستم بھی برداشت نہیں کر سکتے"۔

"میں ہزار فیصدی آپ سے متفق ہوں۔ یاد رکھیے ہم نے بارہا ایڈیٹر صاحب کو سمجھایا ہے۔ راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے انہیں آسیب کا اثر ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں عبدالوہاب نجدی کی روح سوار ہوگئی ہو"۔

"بھئی اس غریب کی کیا خطا۔ قرآن وحدیث نے تو اسرارِ طریقت بیان کئے نہیں، کیونکہ عوام الناس ان کا تحمل نہیں کر سکتے۔ اس بیچارے نے قرآن و حدیث کے سوا پڑھا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث جہاں ختم ہوتے ہیں تصوف تو وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا بڑا تعلق تجربات ومشاہدات سے اس لئے ہم تمہارے ایڈیٹر صاحب کو کافر نہیں سمجھتے بس بیوقوف سمجھتے ہیں"۔

"آپ کی محبت ہے ورنہ آپ کو یاد ہوگا پچھلے سال جو درگاہ سمنونیہ میں مشائخ کی میٹنگ ہوئی تھی وہاں کثرت رائے سے پاس کیا گیا تھا کہ ایڈیٹر تجلی ازلبکہ کافر زندیق ہے اور اس سے کلام سلام کرنے والوں کی بھی مغفرت نہیں ہوگی"۔

"ہم نے اس قرارداد کی مخالفت میں ووٹ دیا تھا اسی لئے خواجہ برہان اور صوفی مرزا رہیم سے آجتک خفا ہیں۔ سچی بات ہے ہم تو خدا لگتی کہنے والوں میں ہیں ایڈیٹر تجلی جیسا نحیف ولاغر آدمی دوزخ میں جھونک دیا جائے، یہ ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ وہاں تو ذرا موٹے موٹے آدمی ڈالے جائیں تو مزا آئے گا۔ بس چلو اب چائے لے آؤ۔ گلا خشک ہو رہا ہے"۔

"آپ کو شاید یقین نہیں آیا۔ میں نے کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہے"۔

"ایسے ہی صابر و شاکر ہو ــــ کل شام مولوی صبغۃ اللہ کے ساتھ گاجر کا حلوہ کس نے کھایا تھا"۔

"میٹھی چیزوں کو میں نے کبھی غذائیات میں شامل نہیں سمجھا"۔

"چلئے بھی غذائیات میں کہاں ہے۔ چلو چائے کے ساتھ انڈے کا حلوہ چلے گا۔ پراٹھے نہ سہی"۔

"آپ آخر کیسے یقین کریں گے کہ بیوی مجھے طلاق

دے چکی ہے۔"

"شیطان" وہ ہنسے ——"اچھا یہی سہی دوران عدت کا نان نفقہ تو طلاق دینے والے کے ذمے..."

"والی ——" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں ہاں —— طلاق تو تمیر پڑی ہے۔ نان نفقہ بھی تمہیں ہی ملنا چاہئے۔"

"واقعی ——" میں اچھل پڑا۔ "آپ نے بڑا اچھا نکتہ پیدا فرمایا۔ افسوس کیسا واہیات زمانہ آگیا ہے کہ بیویاں مردوں کو طلاق دیں اور نان نفقہ بھی نہ دیں۔ م.... مگر حضرت ہم۔ وہ اگر اس دلیل کی قائل ہو بھی گئی تو بہت سے بہت مجھے باورچی خانے میں بٹھا کر کچھ کھلا پلا دے گی مگر آپ کا نان نفقہ!"...

"ارے تو ہم نان نفقہ کب مانگ رہے ہیں۔ چلئے حلوہ وغیرہ الگ چیزیں ہیں۔ تمہارے سر کی قسم اخبار میں بڑے کاٹنے کی چیز ہے۔ دیر نہ کرو۔ در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔"

"مر جاؤں گا —— آپ سے کیسے کہوں وہ پورا دیوان غالب بھی میرے سر پر دے مار سکتی ہے۔ بہت موٹی جلد والا منگا رکھا ہے۔"

"ناممکن۔ سراج الدین کی والدہ کہہ رہی تھیں ملا کی بیوی بڑی شائستہ بھی ہے۔ ہنس مکھ بھی۔ شوہر پرست بھی ہے۔"

"لیکیا آپ کے یہاں وہ مستقل موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے؟"

"میاں نہیں۔ شوشے کیوں نکال رہے ہو۔ اچھی خواتین کا ذکر تو آہی جاتا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں پہلے آپ اخبار دکھلائیں آخر اس میں ہے کیا ——"

پھر تو تم نے بہت بلائی چلئے۔ برخوردار ہم ہر جگہ تمہاری تعریف کرتے پھرتے ہیں مگر اب تم بداخلاق ہوتے جا رہے ہو۔ بھائی مسکین بھی شکایت کر رہے تھے کہ برسوں وہ تمہارے یہاں دو گھنٹے بیٹھے رہے تم نے بس پان سگریٹ پر ٹرخا دیا۔ ایسا نہیں چاہئے۔ تواضع اور خلق تو اوصاف پیغمبری ہیں۔ دیکھتے نہیں خانقاہوں اور درگاہوں میں کیسے لنگر جاری رہتے ہیں۔"

"میں نے چلئے کے لنگر کہیں نہیں دیکھے۔ آپ کی خانقاہ سے تو شاید مسور کی دال اور تنوری روٹی بانٹی جاتی ہے۔"

"اس میں بھی کچھ معمولی خرچ نہیں آتا۔ اب شاید ہر ذرے کے چھینے گوشت بھی پک سکے گا۔ بمبئی کے ایک نیک دل سیٹھ نے وعدہ کیا ہے"

"مجھے بھی کسی سیٹھ سے ملوا دیجئے۔ آپ یقین کریں ریڑھ کی ہڈی تک کمر سے غائب ہوگئی ہے۔ گرانی سی گرانی ہے"

"ابھی کیا رو رہے ہو صاحبزادے۔ تمسکر کہ دکھ میٹھے تجلی کا مال اڑا رہے ہو۔ کیا تمہیں امید ہے کہ ایڈیٹر صاحب کی اپیلوں پر لوگ چالیس ہزار پکڑا دیں گے۔"

"بالکل امید نہیں۔"

"پھر —— انجام تو یہی ہوگا ناکہ رسالہ بیٹ ہو۔ تمہیں تنخواہ کہاں سے ملیگی۔ اور کوئی تو تم جیسے ناکارہ کو شاید سو روپے مہینے پر بھی نہ رکھے۔ رکھ کر کرے گا کیا اس کا بھی کباڑا کر دوگے۔ اب بتاؤ۔"

"پھر تو غالب ہی کا سہارا لینا پڑے گا ——

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے"

"شعروں سے پیٹ نہیں بھرتا۔ ساری طراریاں دھری رہ جائیں گی جب پیسہ جیب میں نہیں ہوگا۔ وہ کیا شعر ہے ایک دفعہ تم نے خانقاہ میں ہمیں سنایا تھا۔ روٹی ہوتی ہے۔"

"جی ہاں۔

جب جیب میں پیسہ ہوتا ہے جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
ہر چیز یہاں پر سونا ہے ہر کنکر ہمتفسر موتی ہے"

"بس سمجھ لو اسی لئے ہم دوڑے آئے کہ ایک مفید

مشورہ ایڈیٹر صاحب کو پہنچادیں۔ اس پر انھوں نے عمل کرلیا تو چالیس ہزار کیا بعید نہیں چالیس لاکھ بھی مل جائیں"۔

"چالیس لاکھ" میں اچھل پڑا۔

"کیوں نہیں۔ خدا کے خزانے میں کیا کمی ہے"۔

"خدا کا معاملہ ہے تو میں ابھی زوجہ کو نان نفقے پر مجبور کرتا ہوں ـــ جسٹ اے ۔ ون منٹ"۔

یہ کہہ کر میں نے قلانچ ماری۔ دراصل میں تو ابتک یہی سمجھ رہا تھا کہ موصوف کچھ خرافات ہی لے کر آئے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کسی لاٹری کا اشتہار نظر پڑ گیا ہو لیکن "خدا" کا نام سنکر یقین ہوگیا کہ معاملہ سیریس ہے ضرور کوئی کام کی چیز اخبار میں چھپا رکھی ہے۔ خود میں کئی دن سے پریشان تھا کہ ہوگا کیا۔ چالیس ہزار کس گھر سے آئیں گے۔ کاغذ نہ ملے تو تجلی بند۔ تجلی بند تو میری حرام خوریاں اور کون برداشت کرے گا۔ جوانی کٹ گئی گلچھرے اڑانے میں۔ اب تو ڈکیتی بھی بس کی نہیں خود کشی مولوی لوگ حرام بتاتے ہیں۔ پھر ایسی اچھی بیوی بیوہ ہوگئی تو میرا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے کیسے بچیگا

اب کرنا گفتگو کا اپنی زوجہ سے

زوجہ کیاریوں کے پاس کھڑی ایک تازہ کھلے ہوئے گلاب کو اتنے غور سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے بطن سے کوئی عجوبہ برآمد ہونے والا ہو۔

میری قلانچ سے پیدا شدہ دھمک نے بھی اسے نہیں چونکایا۔ میں اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا تب بھی اس کا پوز نہیں بدلا۔ محلہ میں آجکل سناٹا تھا۔ الیکشن کی قیامت گذر چکی تھی۔

"نیک بخت کیا دیکھ رہی ہو"۔ میں اس کے کان کے قریب بدبدایا۔ وہ مڑی۔

"ارشاد فرمائیے!" اس کا لہجہ خشک اور سرد تھا کچھ ایسی بیزاری اس میں کروٹیں لے رہی تھی کہ اگر کوئی شوہر اس لہجہ میں بیوی کو مخاطب کرے تو عین ممکن ہے کہ طلاقِ بائن بھی پڑ جائے۔

"بہت خفا ہو"۔ میں نے ہونٹوں پر نیازمندانہ مسکراہٹ پیدا کرنے کی سعیٔ بلیغ کی۔

"مطلب بیان کیجئے۔ میری خفگی سے آپ کے زمین و آسمان میں کیا فرق پڑتا ہے"۔

"بہت فرق پڑتا ہے۔ صوفی نطق اللہ ایسی اطلاع لائے ہیں کہ خفگی وغیرہ کو دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھنا ہوگا"۔

"مجھے کوئی اطلاع نہیں سننی۔ نطق اللہ اور سمیع اللہ سب آپ ہی کو مبارک"۔

"ایسی بھی کیا بے مروتی ہے۔۔

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
یہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"

اس کے ہونٹوں پر تو نہیں مگر ماتھے پر تبسم ضرور طلوع ہوا۔ اس کے چہرے کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ پہلے ماتھا ہنستا ہے پھر آنکھیں پھر ہونٹ۔ ابھی آنکھوں تک لہر نہیں پہونچی تھی۔ پھر بھی ماتھا ہنسنے لگا تھا۔

"ناس کردیا شعر کا" وہ جھلاہٹ کے انداز میں بولی۔

"بھلا کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"قافیہ کیا ہے اس میں؟"۔

"ارے ـ اوہ ـــ" میں چونکا۔ واقعی قافیہ تو کہیں کھسک ہی گیا تھا۔ میں نے یادداشت کو ٹٹولا مگر وہاں بلیک آؤٹ تھا۔ مجبوراً ہتھیار ڈالے۔ کہنا ہی پڑا ـــ "مائی سوئیٹ ڈارلنگ۔ قافیہ تنگ ہے۔ صوفی نطق اللہ چائے کے ساتھ انڈے کا حلوہ بھی مانگ رہے ہیں"۔

"میں نے اب ایسی باتیں سننا چھوڑ دی ہیں" وہ سنجیدگی سے بولی۔ ماتھے کا تبسم پھر کھرے پن میں بدل گیا تھا۔

"نہ سنو۔ لیکن وہ چالیس ہزار کی خوش خبری لے کر آئے ہیں"۔

اب وہ اچھلی - مطلب یہ کہ محاورۃً اچھلی - اپنے بھیا کی وجہ سے فکرمند بہت تھی۔ توقع اسے بھی نہیں تھی کہ اپیل کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکل سکیگا۔ چالیس کیا وہ تو دس ہزار کو بھی مشکل ہی سمجھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب وہ چیز نظر آئی جسے شاعر لوگ ایک لاکھ طریقوں سے بیان کرتے آئے ہیں مگر اب تک بیان نہیں کر پائے ہیں۔ حرف و بیان سے بالاتر ایک کیفیت۔ تشبیہ کی گرفت سے باہر۔

"کیسی خوشخبری ؟" اس کی آواز میں دبے دبے جوش کی جھلکیاں تھیں۔ آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"تم میرے احباب کو ناکارہ تصور کیا کرتی ہو — آج دیکھ لو انشاء اللہ وہی کام آ رہے ہیں"۔

"پہیلیاں نہ بجھائیے۔ کیا بات ہے صاف صاف بتلایئے"۔

"صاف صاف تو صوفی نطق اللہ نے بھی نہیں بتایا وہ کہتے ہیں کہ چائے کے بغیر ان کا گلا صاف نہ ہوگا۔ صاف گلے سے سنانے والی بات ہے"۔

اب اس کی آنکھیں پھر بجھ گئیں۔

"کیا یہ موضوع بھی مذاق کا موضوع ہو سکتا ہے" اس نے دکھ بھرے لہجہ میں شکایت کی "آپ اپنی آنکھوں سے بھیا کی پریشانی دیکھ رہے ہیں"۔

"مذاق کرنے والے پر ایک ہزار لعنت - میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ صوفی صاحب کوئی خاص ترکیب لائے ہیں۔ خدا کے خزانے کا ذکر کر رہے تھے"۔

"تو آخر بتائی کیوں نہیں۔ چلئے بہرحال پک ہی جاتی"۔

"یہ ان کے موڈ کی بات ہے۔ آدمی غلط گو نہیں ہیں تمہاری تو بہت تعریف کر رہے تھے"۔

"میری تعریف آپ کا ہر دوست اور بزرگ کرتا ہے۔ وہ آپ کی کمزوری سمجھتا ہے"۔

"کیا مطلب ؟"۔

"ختم کیجئے۔ چلئے بنائے دیتی ہوں۔ انڈا ایک بھی نہیں ہے"۔

"دو چار توس گھی میں تل دینا۔ یہ تلنے کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ صوفی صاحب نے بھی محسوس کی تھی"۔

"آپ تو گویا دودھ پیتے بچے ٹھہرے۔ اندازہ ہی نہیں کر سکتے —"

میں نے گردن پھیر پھیر کے ناک سے زور زور سے سانس لئے۔ اندازہ ہوا کہ لہریں تنویر صاحب کے گھر سے آ رہی ہیں۔ وہ برابر ہی میں رہتے تھے۔

"تنویر صاحب کے یہاں کچھ تلا جا رہا ہے —" میں نے خفت مٹانے کی کوشش کی۔

"گھی ہے نہ مکھن۔ توس بھی دو چار سوکھے پڑے ہیں آپ صوفی صاحب سے کہئے کہ اگر واقعی ان کی دی ہوئی کسی اطلاع سے امید کی کوئی راہ نکل آئی تو شاندار دعوت کھلائی جائے گی"۔

"وہ تو بعد کی بات ہے۔ اس وقت بالکل خالی چائے — یہ تو ٹھیک نہ ہوگا"۔

"بتائیے پھر کیا کروں۔ گھر آپ کے سامنے پڑا ہے ڈھونڈھ لیجئے کیا چیز تیار ہو سکتی ہے۔ شکر بھی شاید تین چار پیالیوں سے زیادہ کی نہ نکلے"

"تنویر صاحب کی بیوی سے تو تمہاری کافی بے تکلفی ہے"۔ آگے کہنے کے لئے مجھے مناسب الفاظ نہیں ملے۔

"یعنی میں بھیک مانگ کر خوانِ نعمت مہیا کروں"۔ اس نے سوگوار سی آواز میں کہا۔ احتجاج اور ذہنی اذیت کے آثار اس کی آنکھوں میں ابھر آئے تھے۔

"برا مت مانو۔ یہ تو محلہ داری میں چلتا ہی ہے اس دن تنویر صاحب کے یہاں رات گئے جو مہمان آ ٹپکے تھے ان کی بیگم کس بے تکلفی سے ہماری ہانڈی صاف کرا لے گئی تھیں"۔

"وہ ایک ہنگامی معاملہ تھا"۔

"یہ بھی تو مائی سویٹ ڈارلنگ ہنگامی ہی معاملہ ہے۔ آجتک میرے احباب کے دلوں میں تمہاری ساکھ

جمی ہوئی ہے۔ پھر آج تو اپنی غرض بھی اٹکی ہوئی ہے۔ سوچو اگر میں اور تم کوئی چالیس ہزار والی ترکیب لے کر تمہارے بھیا کی خدمت میں پہنچے تو وہ کس قدر خوش ہوں گے۔"

"خاک ترکیب ہوگی۔ ہوگا کوئی اوٹ پٹانگ معاملہ۔"

"ارے نہیں۔ نطق اللہ صاحب سنجیدہ لوگوں میں ہیں۔ کچی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

"جائیے آپ۔ چائے بھجواتی ہوں۔ چار انڈے رات آپا زاہدہ کے یہاں سے مرغی کے نیچے رکھنے کو منگائے تھے۔"

"جیو۔ ہزاروں سال جیو۔ عرب میں سواری کا آخری اونٹ بھی مہمانوں کی تواضع میں ذبح کر دیا جاتا ہے ہم آخر کن کی اولاد ہیں:-

ہٹ نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے"

اب میں نے الٹی زقند لگائی اور بیٹھک میں جا پہنچا۔

اب آنا پچھلے بیٹھک میں

"واہ میاں گھر ہی میں چپک کر رہ گئے تھے"۔— صوفی صاحب جلیسے بھرے بیٹھے ہوں۔

"بڑی مشکل سے پری کو شیشے میں اتارا ہے قبلہ! بس اب یہ اخبار رکھیے۔ میں اور وہ دونوں ہی بے چین ہیں۔"

"صبر سے کام لو۔ تمہارے سر عزیز کی قسم اگر تمہارے ایڈیٹر صاحب نے سعادتمندی کا ثبوت دیا تو بیڑا پار ہی سمجھو۔"

"تو کیا فی الحال ہم ایک دوسرے کی صورت تکیں"— میرا موڈ خراب ہونے لگا۔

"تو کیا چائے میں بہت دیر لگے گی؟"

"کچھ تو لگے ہی گی۔ آپ کی خانقاہ میں جو مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی کا قصہ چل رہا تھا اس کا کیا ہوا؟"

"برابر چل رہا ہے۔ کچھ لوگ صاحبزادے نورالحسن کے حق میں ہیں کچھ لوگ ذوالفقار صاحب کو مستحق قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں ہی غلط ہیں۔ خواجہ برہان علی سے بڑھ کر مرشد رحمۃ اللہ علیہ کا مقرب کوئی بھی نہیں رہا۔ ان کے لئے حضرت نے آخری وقت وصیت بھی کرنی چاہی تھی مگر بعض لوگوں نے فریب سے کام لے کر وقت ٹلا دیا۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"دیکھئے کیا ہو۔ خانقاہ کے تبرکات اور جمع پونجی پر تو تکبیر علی قابض ہیں۔ انھیں بھی خلافت کا دعویٰ ہے۔"

"آپ ہی مسند سنبھال لیتے تو یہ سارے اختلافات دب جاتے۔ آپ بھی تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مقربان خاص میں سے تھے۔"

"کون انصاف کرتا ہے میاں آجکل۔ ہم نے جتنی ریاضتیں کی ہیں اتنی تو شاید برہان علی صاحب نے بھی نہ کی ہوں۔ کشف وغیرہ میں بھی وہ ہم سے آگے نہیں جا سکے۔ بس ہمارا کوئی ایجنٹ نہیں ہے۔ لوگ توجہ ہی نہیں کرتے۔"

"اگر ناچیز یہ خدمت انجام دے!" میں نے بہت ادب سے عرض کیا۔ وہ گھورنے لگے پھر طویل سانس لے کر بولے۔

"تمہاری شہرت خانقاہی حلقوں میں اچھی نہیں ہے۔ ایڈیٹر تجلی کے تعلق سے اکثر تمہیں بھی وہابی ہی سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے بارہا لوگوں کو سمجھایا کہ ملا تجلی والے عقیدوں پر نہیں چلتا ہے۔ وہ تو عرس وغیرہ میں بہت شریک ہوا ہے مگر لوگ سوچتے ہیں کہ کوئلے کی کان میں رہنے والا اسیاہی سے کیسے بچ سکتا ہے۔"

"غلط سوچتے ہیں۔ محاورہ ہے کوئلہ کی دلالی میں ہاتھ کالے۔ محاورات میں تبدیلی تو رستم بھی نہیں کر سکتا

میں نے کبھی تجلی والے عوام کی دلالی نہیں کی بلکہ آپ کو تو معلوم ہے کہ ایڈیٹر تجلی مجھ سے کس قدر بیزار رہتے ہیں ان کا بس چلے تو کھال کھینچ کر بھس بھروا دیں۔ اپنی بہن کی وجہ سے بے بس ہو گئے ہیں۔"

"ہم تو سمجھتے ہیں مگر لوگوں کی زبان کون پکڑے عزیزم اگر تم پانچویں دسویں خانقاہ کے پروگراموں میں حصہ لے لیا کرو تو بدگمانیاں بہت کم ہو سکتی ہیں۔ مشکل ہی کیا ہے۔ ذکر اللہ ہی تو کرنا ہے۔"

"میں سوچا کرتا ہوں :-

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن ...."

"ساری ابھی سے کہاں کٹ گئی۔ تم تو ہم سے بہت چھوٹے ہو۔"

"پھر بھی ذرا سوچئے :-

مرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں"

"کوئی حرج نہیں۔ صنم بھی خدا ہی کی طرف لیجاتے ہیں۔ تم تو میاں پیچھے رہ گئے۔ کاش کچھ حاصل کر لیا ہوتا۔"

اندر سے کنڈی کھڑکی۔ پھر میں ناشتہ لے آیا۔

آخر کار وہ زریں لمحہ آ ہی گیا جب تہ کیا ہوا اخبار بڑی احتیاط سے صوفی صاحب نے کھولا اور میری طرف بڑھایا۔

یہ "سیاست" کا نمبر کا ۱۱ مارچ ۶۴ء کا پرچہ تھا۔ ایک کالم کی جس خاص سرخی کی طرف انھوں نے اشارہ کیا وہ تھی "میرے غریب نواز"

میں چونک پڑا۔ یہ سرخی تو شاید اس تراشے کی بھی تھی جو کئی دن ہوئے کسی نے مجھے ڈاک سے بھیجا تھا اسے میں پڑھ نہیں سکا تھا۔ جس وقت لفافہ کھولا تھا اسی وقت غالباً صوفی نفاست علی نے آواز دے لی تھی۔ میں نے باورچی خانے کی کارنس پر رکھ دیا وہاں سے وہ چولھے میں جا پڑا۔

"سمجھے کچھ؟" نطق اللہ صاحب مجھے گم سا پا کر بولے۔

"جی ہاں میرے غریب نواز! — اسمیں کیا چیز ہے"

"پڑھ تو لو — کوئی غیر معتمد تو خبر نہیں ہے۔"

میں نے پڑھا۔ مضمون یہ تھا۔

میرے غریب نواز!

"شکیل پکچرس کی رنگین پیشکش میرے غریب نواز جو مقامی نرائن " تاکیز میں چھٹے ہفتے میں چل رہی ہے ایک ایسے جوڑے کی کہانی سے شروع ہوتی ہے جو پندرہ سال سے لاولد تھا اور ہر جگہ سے مایوس ہونے کے بعد آخر میں جب وہ خواجہ غریب نواز کے مزار اقدس پر حاضر ہو کر دعا مانگتا ہے تو ان کی دعا بارگاہ الٰہی میں قبول ہوتی ہے اور ان کے یہاں اولاد ہوتی ہے لڑکا جوان ہوتا ہے اور اسکی شادی ہو جاتی ہے۔ ان سب فرائض سے فارغ ہو کر اسکے والدین اپنی آخری تمنا پوری کرنے حج بیت اللہ شریف کے لئے چلے جاتے ہیں۔ ادھر یوسف میاں (ستیش روڑہ) بمبئی میں ایک حادثہ میں زخمی ہو کر اپنی یادداشت کھو بیٹھتے ہیں اور ایک دوسری عورت فردوس جو یوسف سے کالج کے زمانے سے محبت کرتی تھی اس کو اپنے چکر میں پھانس لیتی ہے۔ یوسف کی بیوی سلمیٰ (نازیمن) کو جب اپنے شوہر کی بمبئی میں موجودگی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ اس گھر میں جا کر ایک خادمہ کے طور پر کام کرتی ہے اور اس کو پچھلے واقعات یاد دلا کر اس کی یادداشت واپس لانے میں کچھ کامیاب ہونا شروع ہوتی ہے کہ اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ سلمیٰ سیدھی خواجہ کے دربار میں پہنچتی ہے اور وہاں اپنے شوہر کی واپسی کے لئے دعائیں مانگتی ہے۔ بالآخر فردوس کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اپنے شوہر کے پاس چلی جاتی ہے جسے اس نے اپنے پیسے کے غرور میں چھوڑ دیا تھا۔ آخر میں یوسف سلمیٰ کو ڈھونڈتا ہوا غریب نواز کے مزار اقدس پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی سلمیٰ اس کو مل جاتی ہے اور یہیں پر اسکے ماں باپ بھی حج سے واپسی پر مل جاتے ہیں۔

پکچر کی کہانی موثر ہے اور خاص طور سے حج کے

مناظر اور خواجہ غریب نواز کے مزار کے مناظر بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کئے گئے ہیں۔ پکچر کے شروع میں جو اذانِ عرب کے مشہور قاری عبدالواسط صاحب کی پیش کی گئی ہے وہ بہت ہی پرکشش ہے۔ گانے اور قوالیاں بھی دلکش ہیں"

"خوب" میں مردہ سی آواز میں بڑبڑایا۔ میرے سنہری خوابوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ میں سمجھا تھا واقعی وہ کوئی کام کی خبر دکھلائیں گے۔ یہ تو فلم کا تبصرہ نکلا۔ میں نے بڑے ہی دلدوز لہجے میں عرض کیا۔ "آپ فرما رہے تھے خدائی خزانے کا معاملہ ہے"۔

"ہائیں، نہیں تو کیا شیطانی خزانے کا معاملہ ہو رہا تھا۔ کیا اولیاء اللہ خدا سے الگ ہوتے ہیں"۔

"جی؟" میں نے آنکھیں پھاڑیں۔

"بات سمجھا کرو۔ خواجہ غریب نواز جیسے بزرگوں کو اللہ نے اختیارات بخش رکھے ہیں اور جو کچھ وہ دیتے ہیں اللہ ہی کے خزانے میں سے دیتے ہیں۔ تم تو آخر اولیاء اللہ کے قائل ہو ہی"۔

"بلاشبہ قائل ہوں۔ میری سات پشتیں تک کراماتِ اولیاء سے انکار نہیں کر سکتیں۔ مگر چالیس ہزار کا اس میں کہاں قصہ ہے"؟۔

"میاں جو بچے دے سکتے ہیں بچھڑوں کو ملا سکتے ہیں وہ چالیس ہزار نہیں دے سکتے کیا؟"۔

"قبلہ و کعبہ! یہ حقیقت تو پہلے سے مسلّم تھی۔ نئی بات کیا نکلی"۔

"بعض وقت بالکل ہی بھونپو بن جاتے ہو۔ اے ایڈیٹر تجلّی اب تک اسی وجہ سے تو ایسی چیزوں کے قائل نہ ہوں گے کہ ثبوت کوئی نہیں تھا۔ اب یہ ثبوت بھی مل گیا۔ مشاہدات کو تو نہیں جھٹلا سکتے"۔

"مشاہدات......" میں نے آہ کھینچی۔ "بے شک مشاہدات۔ مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا"۔

"کیسی گھنٹی۔ کیا مطلب؟"۔

"ایڈیٹر تجلی کو یہ فلم کیسے دکھائی جائے"۔

"اب دیکھنے کی کونسی ضرورت رہ گئی۔ اخبار تو غلط نہیں لکھ سکتا۔ شک رہے تو خیر دیکھی بھی جا سکتی ہے۔ سہارنپور میں چل رہی ہے"۔

"آپ دیکھ آئے کیا؟"۔

"ابھی تو نہیں۔ خانقاہ کی طرف سے پروگرام بنایا جا رہا ہے کہ اکٹھے دیکھی جائے۔ اہل و عیال بھی دیکھیں گے۔ سہارنپور کے لئے پوری بس کرایہ پر لی جائے گی تم بھی چلنا"

"تو گویا ایڈیٹر تجلی کو چالیس ہزار لینے خواجہ غریب نواز کے مزار شریف پر بھیجا جائے"۔

"بھیجو نہ بھیجو۔ ہمارا کام تو راستہ دکھلانا تھا دکھلا دیا۔ آخر جب آنکھوں سے ایسی ایسی کرامتیں نظر آ رہی ہیں تو چون و چرا کی کیا گنجائش رہ گئی"۔

"خادم کے نزدیک تو پہلے بھی چون و چرا کی گنجائش نہیں تھی۔ نہ جانے کتنی بانجھ گودیں مزاروں کے طفیل بھری ہوئی ہیں۔ مجھے یاد ہے جب بی۔ ایم چنگیزی نے کاٹھ کی پتلی بنائی تھی تو نمائش سے پہلے وہ خواجہ غریب نواز کے آستانے پر حاضر ہوئے تھے اور عرض کیا تھا کہ اے خواجہ آج تک کچھ نہیں مانگا، آج آپ سے بس ایک چیز مانگتا ہوں۔ باکس آفس"۔

"باکس آفس!" صوفی صاحب بڑبڑائے "یہ کیا بلا ہوتی ہے"۔

"کھڑکی توڑ ہفتے کا باپ۔ یعنی کہ جس سنیما ہال میں چڑھ جائے ہفتوں ہاؤس فل کی تختیاں لٹکی نظر آئیں"۔

"خوب ——— تو پھر کیا ہوا؟"

"وہی جو ہونا چاہئے تھا۔ جہاں چڑھ گئی سقوں کی مشکیں تک بکوا دیں۔ بعض تماش بینوں نے تو تن کے کپڑے بیچ کر ٹکٹ خریدے تھے۔ پولیس کے لئے بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا کہ ہر شو میں دو چار لنگوٹیے چلے آ رہے ہیں۔ لیڈیز مینجر سے شکایتیں

ـسے ہوڈ ہیں۔ منیجر بیچارہ بولا کہ میں کس ضابطے کی رو سے انہیں روک سکتا ہوں۔ آپ کچھ دنوں بعد دیکھ لیں یا عیب ورش کم ہو جائے۔ لیڈ یز گالیں اور کوسنے دیتی چلی گئیں کہ واہ رے واہ ہم کیوں بعد میں دیکھیں۔ ہم تو ابھی دیکھیں گے۔ آنے دو جس کا جی چاہے آئے۔ بلا سے کوئی لنگوٹ بھی اتار پھینکے تو ہمارا کیا بگڑے گا۔"

"تو کیا پولیس کچھ نہیں کر سکتی تھی؟"

"کیا کر سکتی۔ وہ ایک شریف قسم کے پولیس والوں نے ٹوکا تو تھا مگر ایک لنگوٹیے نے آنکھیں نکال کر کہا تھا۔ وہ دیکھو! پھر ٹوکنے والوں نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا تو ہال کے دروازے میں کئی ایسی خواتین نظر آئی تھیں جن کے بدن پر بس ایک نصف بالشت کا بلاؤز تھا اور گھٹنوں سے اوپر کا اسکرٹ۔ ٹوکنے والے ہارے ہوئے لہجے میں بولے تھے کہ صاحب وہ تو عورتیں ہیں۔ اس پر دو تین اور لنگوٹیوں نے ہانک لگائی تھی کہ ہم تو مرد ہیں اسی لئے بلاؤز نہیں پہنا۔ آس پاس کے ہجوم نے زور کا قہقہہ لگایا تھا اور شریف پولیس والے زیر لب مسکراتے ہوئے دوسرے کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے۔"

"تمہیں تو پر خوردار بڑے بڑے قصے یاد ہیں۔ الحمدللہ ہم مسلمانوں کی عورتیں تو برقعہ اوڑھ کر جاتی ہیں۔ دوسری قوموں کے قلوب سے خوفِ خدا بالکل اڑ گیا ہے۔ بھلا بتاؤ گھٹنوں سے اوپر تک کا پائجامہ یعنی کہ....."

"جی ہاں یعنی کہ۔"

"اب زمانہ ہی بڑی بے حیائی کا آگیا ہے۔ ایک فلم ہم نے دیکھی تھی عرب کی حور۔ اس میں فرنگی اس قدر گندی کہ خدا کی پناہ مگر عورتوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اسے دیکھنے جا رہے تھے۔ بلکہ ہمارے برابر ہی میں کئی عورتیں بیچ بیچ میں باتیں بھی کئے جا رہی تھیں۔ ایسی باتیں کہ میاں ملا بس تمہیں کیا بتائیں۔"

"آپ تو فلمیں شاید دیکھتے نہیں ہیں۔"

"تو یہ کہ وہ عشق بازی کے قصے دیکھ کر کون اپنی عاقبت برباد کرے مگر وہ تو ہم نام کی وجہ سے چلے گئے تھے۔ عرب دیکھنے کا شوق تو بہرحال ہر مسلمان کو ہوتا ہی ہے۔"

"بے شک بے شک۔ پھر حور بھی کوئی غیر اسلامی چیز تو ہے نہیں۔ آپ نے سوچا ہوگا کہ قرآن میں تو حوروں کا ذکر آتا ہی ہے۔ چلو آج آنکھوں سے بھی دیکھ لیں۔"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔ مگر لاحول ولا قوت اس میں تو کمبختوں نے جانے کسی جاپانی یا وحیدہ بائی کو حور بنا رکھا تھا۔ ایسا خوبصورت چہرہ کہ طبیعت خوش ہو گئی۔ عمر بھی تیس سے اوپر ہی ہوگی۔ پھر عرب میں نہ دکھایا نہ مدینہ۔ خدا جانے کس حصے میں ڈیرے ڈالے ہوں گے مردودوں نے۔ پھر بھی چلو اس سرزمین مقدس کی ریت اور اونٹ اور نخلستانوں کی زیارت تو ہو گئی تھی۔"

"آپ نے شاید وہ نہیں دیکھی یمن کی حور یمن بھی تو عرب ہی میں ہے۔"

"کیا کچھ خاص تھی؟"

"خاص الخاص۔ اس میں واقعی حور دکھائی ہے عمر تو مشکل سے سترہ برس ہوگی۔ ضرور دیکھئے۔ اپنے زمانے میں سلور جوبلی منا چکی ہے۔"

"اب کہاں سے دیکھیں وہ کوئی چل رہی ہے۔"

"آئے گی لوٹ پھر کر۔ ایک فلم اور بھی دیکھنے پڑا رہا"

"اس میں کیا ہے؟"

"اس میں درگاہ بندہ نواز کا قصہ ہے۔ ایک بہت رئیس میاں بیوی اولاد سے محروم ہیں۔ میاں ساٹھ سال کے ہیں۔ پہلی بیوی لاولد مر گئی۔ چند سال پہلے ایک جوان العمر خاتون سے شادی کی ہے۔ بیوی کی عمر تیس سال ہوگی۔ دفعتاً میاں کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے کروڑوں کی دولت پر مرحوم کے بھائی بھتیجے دوڑ پڑے ہیں۔ بیوہ بیچاری سخت پریشان ہے۔ ایک بچہ ہوتے

زرگ انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ درگاہ بندہ نواز پر
اؤ اور اولاد نرینہ مانگو۔ وہ گھبرا کر کہتی ہے کہ اب
یسے مانگوں۔ میاں کو مرے ہوئے تو کچھ مہینے ہوگئے
ہ ڈانٹتے ہیں کہ اے بیوقوف عورت روحوں کی
نیا میں مہینوں، سالوں کا کچھ حساب نہیں۔ بحث
ت کر دیے تھے۔ یہ کے سودے ہیں۔ لڑکا ہوگیا
دولت تمہاری ہوگی۔ ورنہ بھیک مانگتی پھرو گی۔"

"کیوں بھیک کیوں" صوفی صاحب نے
ح کلام کیا وہ بڑے شوق و ذوق سے سماعت
ار رہے تھے۔ "زوجہ کا بھی تو حصہ ہوتا ہے مرحوم
ہر کے ترکہ میں۔"

"اس کا جواب تو فلم کا ڈائریکٹر ہی جانتا ہوگا۔
بیوی کو زیادہ تو ملتا نہیں۔ پھر جو کچھ حصہ بنتا
بھی مرحوم کے بھائی بھتیجے ہتھیائے بغیر کیوں
ڑ دیتے۔"

"خیر چلو آگے کیا ہوا؟ اور ہاں اس جواں سال
ن کا نام کیا تھا"؟

"زبیدہ جمال۔ مرحوم شوہر جمال الدین سیٹھ کہلاتے
زبیدہ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے درگاہ بندہ نواز
ر کو نکلی۔ لمبا سفر تھا۔ ریل کے ڈبے میں ہیرو داخل
ہے۔ تن بہ تقدیر دلوں میں محبت شروع ہوجاتی
ہیرو کشمیر جا رہا ہے کیونکہ وہیں کسی آفس میں ملازم
وہ کہتا ہے کہ چلو تم بھی کچھ دنوں وہاں سیر کرنا
مان پرور موسم ہے۔ ہم سرسبز پہاڑوں کے
میں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے چشموں کے کنارے
رسیلے گیت گائیں گے۔ گہری جھیلوں کے سینوں پر
ہوئے شکاروں میں ہم تم ہم ایک دوسرے کی
ں میں کھو جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ زبیدہ
غم کی ماری تھی۔ دل موم کی طرح نرم ہو گیا تھا
گیا۔"

واہ برخوردار تمہارے تو مکالمے تک حفظ کر رکھے ہیں۔"

صوفی صاحب نے بے ساختہ داد دی۔ ان کے تن تو ہر کر
پر شباب کی حسین میت کھیل رہی تھی۔

"حفظ نہیں کیے گئے۔ وہ تو آپ سے آپ دل میں نقش
ہو جاتے ہیں۔ کیا کھیل تھا قبلہ۔ زبیدہ تو بس حور بہشتی ہی
معلوم ہو رہی تھی۔ ایک سال انھوں نے کشمیر میں گزارا۔"

"ایک سال؟" ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ شاید
اس اطلاع سے انھیں گہرا صدمہ پہنچا تھا۔

"جی ہاں۔ وہاں کچھ جاسوسی کا چکر بھی پھیل گیا
تھا۔ کوئی گروہ تھا غنڈوں کا۔ زبیدہ اس کے چکر میں
پھنس گئی۔ ہیرو نوکری چھوڑ چھاڑ جاسوس بن گیا۔ بس پھر
وہ مار ماری ہوئی کہ اللہ اکبر۔ کبھی ہیرو دشمنوں کی چٹنی بنا کر
زبیدہ کو نکال لے جاتا کبھی غنڈے پھر انھیں گھیر لاتے
یہی چکر مہینوں چلتا رہا۔ آخر کار ہیرو نے پورے گروہ کی
دھجیاں اڑا دیں۔ کوئی ادھر گرا کوئی ادھر گرا۔ اب شادی
کا نمبر آتا ہے۔ تب زبیدہ کو یاد آتا ہے کہ میں تو درگاہ بندہ نواز
سے بچہ مانگنے نکلی تھی۔ اب کیا ہوگا۔ ہیرو تسلی دیتا ہے
کہ گھبراؤ مت میرے ایک چچا صاحب کا گہرا تعلق درگاہ
بندہ نواز کے بڑے سجادے صاحب سے ہے۔ وہ
انھیں خط لکھ دیں گے۔ تمہیں حجرۂ مقدس میں پہنچنے
میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ زبیدہ
اصرار کرتی ہے کہ تم بھی ساتھ چلو۔ ہیرو کہتا ہے فی الحال
تو مشکل ہے۔ پچھلی نوکری غنڈوں کے چکر میں چلی گئی۔ اب
نئی بڑی مشکل سے ملی ہے۔ کئی مہینے چھٹی کا کوئی چانس
نہیں۔ تم بے فکر ہو آؤ۔ وہیں سے گھر چلی جانا۔ جب
تم حضرت بندہ نواز کے فیض سے ماں بن جاؤ گی تو میں بھی
نوکری چھوڑ چھاڑ وہیں آ جاؤں گا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" صوفی صاحب حلق کے بل چیخے
"مردود بےوفا نکلا۔"

"یہ بات نہیں۔ وفا تو اس کی رگ رگ میں کوٹ
کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ دراصل یہ نہیں چاہتا تھا کہ
زبیدہ کی نیک نامی پر حرف آئے۔ اگر درگاہ پر بھی

سامنے دیکھا جاتا تو لوگ جانے کیا کیا سوچتے۔ ممکن ہے بڑے سجادے صاحب ہی اکڑ جاتے۔ پھر حجرۂ مقدس میں حاضری کی راہ کیسے کھلتی۔ بہرحال یہ تو ہیرو جانے یا ڈائریکٹر فلم میں تو یہ دکھایا ہے کہ وہ سفاری خط لکیر درگاہ پہنچی۔ خوب آؤ بھگت ہوئی۔ حجرۂ مقدس میں سجدے کی اجازت بھی ملی۔ بس کیا پوچھتے ہیں قبلہ بڑا دل گداز منظر تھا۔ مزار شریف کی پائنتی سجدہ ریز ہو کر اس نے وہ قوالی گائی ہے کہ تماشائیوں کی دہاڑیں نکل گئیں۔ بلا کا سوز تھا ظالم کی آواز میں طرز بھی ایسا تھا کہ مردے قبروں سے اکھڑ آئیں۔ مجھے تو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اگر تھیٹر کا معاملہ ہوتا تو میں تو شاید اسٹیج پر چھلانگ لگا کر اس کے قدموں میں جان ہی نچھاور کر دیتا۔ جان کیا چیز ہے ایسی قتالۂ عالم پر تو آدمی شش جہات بھی قربان کر دے۔"

"شش۔ شش جہات" صوفی صاحب کے ہونٹ پھڑکے۔ نظریں میرے رخ زیبا پر تھیں۔ غالباً ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ شش جہات کا یہ کیا محل ہے لیکن سوال کر کے قصے کی روانی میں مخل بھی ہونا نہیں چاہتے تھے۔

بہرحال میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "ٹکٹ کے پیسے تو اس اکیلے گانے ہی نے وصول کر دیئے تھے۔ اب بڑے سجادے تین دن تک زبیدہ کو مہمان رکھتے ہیں۔ کتنا شاندار تھا وہ محل جس میں زبیدہ کو ٹھہرایا گیا تھا بعید نہیں خواجہ بندہ نواز کے توسط سے بہشت ہی سے منگوا لیا گیا ہو۔ وہاں حوریں بھی تھیں۔ سبحان اللہ کیا حسن۔ کیا چھل بل۔ کیسے کیسے لباس۔ نور کا لباس بھی میں نے وہیں دیکھا۔"

"نور کا لباس ـــ کھاؤ قسم ـــ"

"آپ جانتے ہیں میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ جھوٹ بول بھی کیسے سکتا ہوں جبکہ ثبوت موجود ہے۔ آپ خود دیکھ لیجئے گا۔"

"کس قسم کا تھا۔"

"یہی تو کمال تھا قسم ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ کہنے کو لباس مگر مجال نہیں کہ نظر اور نظارے کے درمیان ذرا بھی حائل ہو بس جیسے شیشہ۔ بدن کا ایک ایک رواں گن لو۔"

"رہنے دو میاں" صوفی صاحب نہایت کھلے ہوئے لہجہ میں ـــ بلکہ کھنکتے ہوئے لہجہ میں بولے ـــ "تم بیوقوف بن گئے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے عرض کیا۔

"ارے کپڑے پہنائے بھی نہ ہوں گے۔ بس بدن کا دیا نور کا لباس۔"

"توبہ کیجئے۔ سنسر والے کیسے پاس کرتے۔ لباس یقیناً تھا۔ کبھی کبھی لہریں سی بھی نظر آتی تھیں۔ اب اگر بدن بھی ڈھک جاتا تو نور کا لباس کیسے ہوتا ـــ نہیں ذرا سوچئے!"

"ٹھیک ہی کہتے ہو گے۔ خیر آگے؟"

"زبیدہ جہانی کے مزے لوٹ کر گھر لوٹتی ہے۔ کچھ دنوں بعد اس کے چاند سا لڑکا پیدا ہوتا ہے ـــ"

"نہیں!" صوفی صاحب چونک پڑے۔ یہ "نہیں" شاید ان کی روح کی گہرائیوں سے اچھل کر آئی تھی۔

"نہیں کیوں ......"

"میاں ابھی تو تم نے بتایا کہ وہ سال بھر کشمیر میں رہی۔ شوہر اس سے بھی چھ مہینے قبل مر چکا ہے۔ بھول رہے ہو شاید یہ کسی اور طرح ہوگا۔"

"نہیں قبلہ اپنے سر عزیز کی قسم بلکہ بڑے سے بڑے پیر دستگیر کی قسم ـــ آخر آپ کو شک کیوں ہے۔"

"ارے تو اتنے دنوں بعد ....."

"کرامت ـ حیرت ہے آپ کرامت کو بھی منطق کی ناپاک ترازو میں تولنا چاہتے ہیں۔ اولیاء دینے پر آئیں تو سب کچھ دیدیں۔ کیا مشکل ہے انھیں۔"

"پھر بھی برخوردار ......"

"بس معاف کیجئے گا آپ سے میں وہابیت کی توقع

نہیں کر سکتا"۔

"یہ مطلب نہیں ہے۔ اولیاء کو قدرت تو ہر طرح کی ہے مگر اس بچے کو میراث کیسے مل گئی ہوگی۔ مرحوم کے بھائی بھتیجوں نے تفتیش نہ کیا ہوگا کہ ڈیڑھ سال بعد یہ بچہ کہاں سے چلا آرہا ہے"۔

کیسے کر سکتے تھے۔ ڈائریکٹر جیسا کہے گا ویسا ہی تو کریں گے۔ پلاٹ کے مطابق وہ سب بھی خوش عقیدہ ہی تھے۔ زبیدہ نے جب ثبوت پیش کیا کہ اس نے درگاہ بندہ نواز کے حجرۂ اقدس میں رو رو کر بچہ حاصل کیا ہے تو انھیں بھی چپ ہونا پڑا۔ ایک بولا تھا۔ اسی کو وہیڑا قرار دیکر گھر سے نکال دیا گیا تھا"۔

"یہ فلم ہم ضرور دیکھیں گے لیکن اگر تمہاری غلط بیانی ثابت ہوئی تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا"۔

"گلا کاٹ ڈالئے گا ایک حرف بھی غلط ثابت ہوجائے۔ ہاں یہ گوش گزار کردوں۔ سنسر والوں نے بعد میں اس میں سے نورانی لباس والے مناظر نکلوا دیئے"۔

"کیوں" انھیں جیسے شاک لگا "تم تو کہہ رہے تھے واقعی لباس ہے"۔

"سو فیصدی تھا۔ مگر تماش بینوں میں اہل نظر ہوتے کتنے ہیں۔ بوڑھے لیڈروں نے شور مچایا کہ یہ تو ننگی فلم ہے۔ پروڈیوسر نے چیلنج کیا تھا کہ ننگی کیسے ہے ہم نے تو یہ جاذب ترین حریری کپڑا امریکہ سے امپورٹ کیا ہے لائسنس موجود ہے۔ لیڈروں کی میٹنگ ہوئی۔ ایک کمیٹی بنی کہ فلم کو غور سے دیکھ کر فیصلہ کر لیا جائے۔ اس کمیٹی کے نام کا اعلان ہوتے ہی پروڈیوسروں نے شور مچایا کہ یہ تو سب بوڑھے ہیں انھیں کیا نظر آئے گا۔ ان کی عینکوں تک کا اعتبار نہیں۔ اعتراض معقول تھا۔ جمہوریت میں تاناشاہی تو چل نہیں سکتی کمیٹی توڑ کر ایک جوان ٹیم تیار کی گئی جس کی آنکھوں کا ٹیسٹ آئی اسپیشلسٹوں سے کرایا گیا۔ اس ٹیم میں کئی جوان خواتین بھی شامل کی گئیں کیونکہ اسپیشلسٹوں نے رائے ظاہر کی تھی کہ لباس اور عریانی کے مسائل میں زیادہ صائب رائے عورتوں ہی کی ہوسکتی ہے۔ اب آپ حیرت کریں گے کہ اس ٹیم نے تین تین بار دیکھنے کے بعد فیصلہ دیا کہ لباس یقیناً موجود ہے مگر چونکہ پلاٹ کی ناگزیر ضرورتوں کے تحت یہ بہرحال نورانی لباس ہے اس لئے بدن ڈھک جانے سے فن کا خون ہوجاتا۔ اس طرح کی آرٹسٹک چیزیں مخرب اخلاق نہیں قرار دی جاسکتیں"۔

"معاذ اللہ۔ پھر جھوٹ کیوں بولتے ہو کہ یہ منظر نکلوا دیئے گئے"۔ صوفی صاحب بولے۔

"ابھی سنئے تو۔ بدقسمتی سے ایک شوہردار خاتون بھی اس ٹیم میں شامل کرلی گئی تھیں۔ شوہر صاحب ٹیم کے ممبر نہیں تھے مگر یوں ہی تفریحاً بیوی کے ہمراہ چلے گئے جب یہ مناظر اسکرین پر آئے تو موصوفہ نے محسوس کیا کہ شوہر بے حد انہماک سے انھیں دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے ٹوکا کہ آپ نظریں نیچی رکھئے۔ فیصلہ مجھے دینا ہے آپ کو نہیں۔ شوہر صاحب کچھ اس درجہ غرقاب تھے کہ بے خیالی میں بیوی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ یہ وقت تو جوں توں کٹ ہی گیا مگر فیصلے والی میٹنگ میں موصوفہ نے شدومد سے فلم کی مخالفت کی۔ میٹنگ کے بعد اگرچہ فیصلہ وہی ہوا جو میں نے ابھی عرض کیا مگر موصوفہ بھی غضب کی لیڈر تھیں۔ پتا نہیں کیا کیا پاپڑ بیل کر اس فیصلے کو منسوخ کرا ہی دیا اور فلم سے یہ مناظر کٹ گئے"۔

"واہ میاں بڑے بڑے پاپیوں میں تیر آئے ہو"۔ صوفی صاحب نے گہرا اور لمبا سانس لیا "بعض بزرگوں پر تو ہم نے نورانی لباس دیکھا تھا لیکن عورتوں کا معاملہ جدا ہے"۔

"ہے نا جدا؟"۔

"ظاہر ہے۔ مشکل یہ ہے کہ عورتوں کا رجحان تصوف کی طرف ذرا کم ہے۔ وہ تو بس مرادیں مانگنا جانتی ہیں

بہت سے بہت بیعت ہو جائیں گی۔ بال بچوں میں انھیں کچھ ریاضت کا موقع تو ملتا نہیں ۔۔۔ استغفر اللہ یہ تو بہت دیر ہو گئی" انھوں نے جیبی گھڑی دیکھی" غیرت علی کی طرف جانا تھا منتظر ہوں گے"۔

"یہ حمیت علی کے بھائی ہیں کیا؟"۔

"بھتیجے۔ ان کے بھائی شریعت علی تھے۔ بچارے ایک حادثے میں مر گئے۔ زمرد شاہ کی درگاہ انہی کی بنوائی ہوئی ہے"۔

"سبحان اللہ۔ زمرد شاہ بھی بڑے اونچے درجے کے قطب ہوئے ہیں۔ میری بڑی پھوپی کی نانی کی ایک خالہ تھیں ان کے بھی اولاد نہیں ہوتی تھی۔ بڑھاپے میں چاند سا بیٹا زمرد شاہ ہی نے عطا کیا تھا۔ بیلی حویلی والوں کی نسل اسی سے چلی ہے"۔

"تم سے کس نے بتا دیا۔ بیلی حویلی والے تو بڑے نسلے ہیں ان کے جد امجد سرحد کی طرف سے آئے تھے"۔

"نہیں۔ آپ تذکرہ حضرت بابا دامن ذرا دیکھیں اس میں بڑی تفصیل سے بیلی حویلی والوں کے احوال درج ہیں"۔

"دیکھ رکھا ہے۔ یہ صحیح حالات پر مبنی نہیں ۔۔۔ اچھا باقی باتیں پھر۔ تم اب کی ایڈیٹر تجلی کو درگاہ غریب نواز کھینچ ہی لے جاؤ۔ اخبار چھپ چھپ کر جاتے ہیں انھیں دکھا دینا"۔

ان کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا کہ زوجہ کو کیسے منہ دکھاؤں۔ وہ اوپر سراپا شوق بنی بیٹھی ہوگی کہ اب آئی چالیس ہزار کی ترکیب۔ میں اخبار پیش کر دوں گا تو بعید نہیں کہ ہارٹ فیل کر جائے۔ مزارات سے اس کی بیزاری آپ جانتے ہی ہیں۔ میں کوشش کرتا رہتا ہوں کہ کسی طرح اس کے عقائد درست ہوں۔ مگر وہ اس کوشش میں رہتی ہے کہ میرے ہی عقائد درست کر کے رکھا رہے۔

٭ ٭ ٭

اب جانا پھر سے گھر میں

بہر حال سامنا تو کرنا ہی تھا۔

"بتائیے کیا خبر لائے ؟"۔ اس نے مجسّم سوال بنکر پوچھا۔

"خبر نہیں۔ ایک اٹل ثبوت اس بات کا کہ تم اور تمہارے بھیا غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ یہ دیکھو"۔

میں نے اخبار اس کے آگے کھول دیا۔ سرخی پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر بالکل ایسی فوری تبدیلیاں واقع ہوئیں جیسے جنس بدلنے جا رہی ہو۔ ماتھے پر پورے ایک درجن بل پڑ گئے۔

"کیا؟"۔ وہ حلق کے بالکل نچلے سرے سے چیخی۔

"مزار شریف کی کرامت پڑھ کے دیکھ لو"۔

"میں پہلے ہی سمجھ رہی تھی"۔ اس کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔

"نہیں اچھا حرج ہی کیا ہے اگر آزما ہی لیں۔ چلو تمہارے بھیا تو شاید نہیں مانیں گے مگر ہم تم چلیں۔ ایک مزار چاند سا بیٹا بھی مانگیں گے اور چالیس ہزار بھی"۔

"آپ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ بعض اوقات مذاق کس قدر روح فرسا ہو جاتا ہے۔ بھیا کو معلوم ہو جائے کہ آپ کی اٹکھیلیوں میں کوئی فرق نہیں آیا تو انھیں کیسا صدمہ ہو"۔

"مذاق اور بے مذاق کی بحث کہاں سے کھڑی کر دی۔ بھاگوان بلکہ بھاگیہ وان قلم میں نے نہیں بنائی اخبار میں نے نہیں چھاپا۔ درگاہ غریب نواز سے سُنا ہے اکبر بادشاہ کو بھی فرزند نصیب ہوا تھا۔ چلو وہ تو تاریخ کی باتیں رہیں۔ کہہ سکتی ہو کہ مؤرخ نے جھوٹ ملا دیا ہے۔ مگر یہ قلم تو آج کی زندہ حقیقت ہے۔ بقول صوفی نطق اللہ صاحب ظلہٗ مشاہدات کا انکار کوئی کیسے کر سکتا ہے"۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں میری طرف دیکھے

جا رہی تھی۔ ہونٹوں میں ذرا سی تھرتھراہٹ نظر آئی مگر وہ کھلے نہیں۔

"کیوں کیا سوچ رہی ہو۔ چلو ہم تم انھیں سمجھا دیں۔ شاید سمجھ میں آ ہی جائے خدا کو بڑی قدرت ہے۔"

"آپ اکیلے جائیے۔ قسم ہے آپ کبھی گھر تو جائیں۔"

"وہ تو خیر جاؤں گا ہی۔ تم ساتھ رہتی ہو تو دل کو ذرا قرار رہتا ہے۔ وہ تمہاری موجودگی میں ذرا غصہ بھی کم کرتے ہیں۔"

"میں تو نسرین کے یہاں جا رہی ہوں۔ وہ کئی دنوں سے بلا رہی ہے۔"

"بس تو جب شام کو لوٹو کفن دفن کا سامان مہیا کرتی لانا۔ ہو سکتا ہے آج وہ گولی ہی مار دیں کیونکہ بہرحال میں انھیں درگاہ غریب نواز پر جانے کا مشورہ دیکر رہوں گا۔"

"گولی کیا وہ تو آپکے توپ ماریں گے۔ البتہ انھیں ملال ضرور ہوگا کہ آپ ایسے حالات میں بھی تفنن سے باز نہیں آتے۔"

"تفنن — یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ تم نیک بخت ایسے ثقیل الفاظ مت بولا کرو۔ نزاکت کا خون ہو جاتا ہے۔"

"اچھا اچھا۔ خدا جانے آپ کا دماغ تھکتا کیوں نہیں۔ اتنی دیر بیٹھک میں بیتا نہیں کیا کیا پھول برسا کر آئے ہوں گے اب میری چولیں ہلا رہے ہیں۔ جی جی ہیں آئے کیجئے۔ ارے ہاں وہ آپ تو تجلی کا نمبر لکھنے والے تھے میں تو کسی وقت قلم کاغذ دیکھتی نہیں آپ کے ہاتھ میں۔"

"کیا کروں گا لکھ کر۔ تر چالیس ہزار ہوں گے نہ کاغذ ملیگا۔ نہ تجلی چھپے گا۔ کس کے لئے لکھوں؟"

"ستر پھرے دور۔ ایسی باتیں منہ سے نکالتے کچھ تو تامل کیا کیجئے۔ انشاء اللہ ضرور چھپے گا کیوں نہیں۔"

"بیشک چھپ سکتا ہے۔ اگر خواجہ غریب نواز نے سن لی۔ تمہارے بھیا نصیحت مانیں گے نہیں اور روپے آسمان سے برسیں گے نہیں۔ خدا بھی وسیلے ہی سے دیتا ہے۔ جیسے رزق بہانے موت۔"

"ایسا جو کیجئے آپ ہو آئیے خواجہ کے دربار میں بلکہ یہاں بھی تو سیکڑوں مزارات میں سب میں کوئی نہ کوئی ولی سو رہا ہے۔ یہیں جو مانگئے۔"

"یہاں کے اہل مزار خدا جانے یا تو ریٹائر ہو گئے یا کچھ اور گھپلا ہے۔ سر مارے جاؤ سنتے ہی نہیں۔ لے دے کے ایک تو گڑے پیر پر کچھ شنوائی ہو جاتی ہے مگر وہ بھی کیا۔ خواجہ بہرام کی زوجہ نے چاند سا بیٹا مانگا تھا چھپکلی جیسی لونڈیا ہوئی وہ بھی تیسرے دن مر گئی۔ مرزا آفاق نے معمے کا صحیح حل مانگا تھا۔ مل تو گیا مگر دس ہزار نو سو بارہ صحیح حل نکل آئے۔ انعام فی کس مبلغ تین روپے ساٹھ پیسے بٹ گیا۔"

میں منتظر تھا کہ ان انکشافات کے صلہ میں وہ کچھ تو ہوں ہاں کرے گی مگر وہ تو نظریں گاڑے گلاب کی اس کلی کو دیکھ رہی تھی جو عنقریب پھول بننے والی تھی۔ میری طرف التفات ہی نہ تھا۔ میں نے غفلت مٹانے کی ضرورت محسوس کی۔

"کیا دیکھ رہی ہو اے روحِ غزل۔ عبرت کی جا ہے سنو شاعر کیا کہتا ہے۔

خوشی کو دامِ الم سے کہاں رہائی ہے
کھلا ہے پھول تو غنچہ کو موت آئی ہے"

اس نے قدرے چونک کر میری سمت نظریں اٹھائیں پھر بولی — "ذرا پھر سے پڑھئے۔"

مجھے دفعتاً محسوس ہوا جیسے مشاعرے کے اسٹیج پر دھواں دار غزل پڑھ رہا ہوں اور مجمع شور مچا رہا ہے مکرر ارشاد ہو۔ سبحان اللہ کیا جواب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بس پھر تو دوبارہ لہرایا۔ اب وہ بیر سا منہ بنا کر بولی "مضمون تو اچھا ہے مگر یہ لفظ موت بالکل بے جگہ آیا ہے۔ غنچہ۔ پھول۔ کھلنا۔ اتنے نازک اور ریشمی الفاظ کے ساتھ موت جیسا پتھریلا لفظ۔"

"استغفار پڑھو۔ یہ تمہارے بھائی صاحب کا ہے۔"

"جھوٹ۔ وہ اب شعر کہتے ہی نہیں —"

"تو پھر چھپتے ہوں گے۔ تجلی میں تو چھپتے رہتے ہیں"

اچھا ایک اور سنو۔

کھل کے جب پھول بنی ختم ہوا اس کا وجود
ہر کلی اپنے تبسم کی سزا پائے ہے "

"یہ اچھا ہے۔ اگرچہ پہلے مصرعہ میں وہ ترنم نہیں جو دوسرے مصرعہ میں ہے۔ کاش پہلا مصرعہ بھی غزل ہی کا ہوتا"۔

"تم غالب۔ اقبال سب کا کریا کرم کر کے رکھ دو گی۔ خیریت مزارات کی چل رہی تھی"۔

"میں یاد دلا رہی ہوں۔ سمجھ جائیے اُبکائیاں آنے والی ہیں۔ آپ کو نہ جانے قبروں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے"۔

"سبھی کو مرنا ہے۔ میں فرض کرو مرنے کے بعد ولی بن گیا تو....."

"اے اللہ — آپ آخر اب جاتے کیوں نہیں دس بج رہے ہیں"۔

"سوچ رہا ہوں سہارنپور جا کر میرے غریب نواز دیکھ ہی کیوں نہ آؤں۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ پھر تمہارے بھیا کو قائل کرنے میں بھی آسانی رہے گی"۔

"میں منع نہیں کرتی۔ اپنی قبر میں آپ ہی کو سونا ہے"۔

"یہ ہوا نکتۂ عارفانہ۔ لیکن معمولی سے معمولی لٹھا بھی اب چار روپے میٹر ہے۔ کفن کے بغیر تو تم بھی میری تدفین پسند نہیں کرو گی۔ حساب لگاؤ کیا خرچ آئے گا"۔

"یہ حساب تو اب میرے لئے لگائیے۔ نوج میرے سامنے خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو"۔

"نوج بیگماتی لفظ ہے۔ فرشتۂ اجل صرف مردانہ زبان جانتا ہے"۔

"اے تو بھئی....."

"ہائیں — آج پھر بھائی"۔

"آخر آپ کسی طرح جان بھی چھوڑیں گے"۔

"سمجھدار ہو۔ صرف پندرہ روپے۔ کمبختوں نے ریلوں، بسوں کے کرائے بھی تو بڑھا دیئے ہیں۔ مونگ پھلی خریدو تو چار آنے کی پندرہ دیتا ہے۔ فی منٹ دو مونگ پھلی بھی لگاؤ تو ایک گھنٹہ میں کتنی ہوئیں"۔

"بھاڑ و پھر جائیے....."

"بالکل پھر یگی۔ ابھی سستی مل رہی ہیں۔ ایک دن آئے گا چار آنے میں ایک مونگ پھلی۔ دو روپے میں پانچ تولہ آٹا۔ آلو، انڈوں کے بھاؤ۔ انڈے شتر مرغ کے بھاؤ۔ بس سینما کے ٹکٹ سستے ہو جائیں گے۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے فیملی کو بھی ساتھ لائیے"۔

"روپے تو بس اب آپ ہی کہیں سے لائیں۔ ابھی مہینہ پورا کرنے کے لئے کم سے کم ساٹھ روپے اور چاہئیں"۔

"فقط۔ وا بھئی وا۔ سوتے میرے مولوی بدر الحسن ہی کی طرف ہیں انھوں نے کہا تھا جب بھی سہارنپور آؤ لے لینا"۔

"پہلے تو آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا"۔

"تم جانتی ہی ہو میں تمہارے ساتھ اقتصادی امور پر گفتگو پسند نہیں کرتا۔ رومانس کا کباڑا ہو جاتا ہے یقین کرو ڈارلنگ اگر میں شعر کہہ سکتا تو تمہیں ہی جانِ غزل بناتا۔ جب گھر میں موجود ہے تو باہر سے کیوں لائی جائے"۔

"پتا نہیں آپ کس مٹی سے بنے ہیں"۔

"ڈارون کا خیال تھا ہم مٹی سے نہیں بندر سے بنے ہیں — خیر و فقرہ کچھ بنا نہیں"۔

"اتنا وقت لکھنے پر صرف کیا کریں تو تنخواہ بھی بڑھ جائے اور — آدمی بھی بن جائیں"۔

"یہ تم کہہ رہی ہو — تم۔ افسوس۔

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہیں
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

"بعض نثر نگاروں کو جا بے جا اشعار ٹھونسنے کا مرض ہوتا ہے۔ آپ بھی اسی مرض کا حملہ ہوا ہے۔ میرا سر تو کھوکھلا ہو کر رہ گیا"۔

"پروا مت کرو۔ جب تک اس پر یہ لمبے لمبے ریشمیں

ال یہیں میں تمہاری پوجا کرتا رہوں گا"۔

"یہ موئے کبھی جھڑ جائیں گے۔ آپ کی باتیں انھیں چھوڑیں گی کب"۔

"موئے کا اتنا برمحل استعمال آجتک نہیں دیکھا تھا سبحان اللہ اسے کہتے ہیں رعایت لفظی۔ شاعری کی اصطلاح میں اسے ابلاغ المبین بھی کہا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے اب پنارہ دے ہی دو ورنہ بال سچ مچ جھڑنے لگیں گے"۔

"ہرگز نہیں۔ یہ خوب رہی۔ بات نہ وات پنارہ دیدو"۔

"نہیں دیا۔ دو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا"۔

"بہت دیئے۔ کہے جلیئے میں تو غسل کو جا رہی ہوں"۔

"پہلے پنارہ۔ میں ذرا قلم دیکھ کر تصدیق کر لوں اخبار نے جھوٹ تو نہیں لکھا۔ اگر تصدیق ہو گئی تو کسی سی طرح تمہارے بھیا کو کھینچکر درگاہ تشریف لے ہی اؤں گا۔ نہ لے جا سکا تو بہر حال ہم تم چلیں گے۔ پچاس ار مانگیں گے۔ چالیس ہزار انھیں دیدیں گے دس در کھ لیں گے"۔

وہ کچھ مسکراتی کچھ اونٹتی کمرے میں گھس گئی۔ میری تی امید کو گرداب یاس کے بلا خیز حلقوں نے ل لیا۔ دریائے دل میں جوار بھاٹا آگیا۔ اس وقت لم کا غذ میسر آجاتا تو آغا حشر کے انداز کا ایک ڈرامہ لکھ بیٹھتا۔ ماشاء اللہ کیا کیا تشبیہات و کنایات ڈاریں کھوپڑی کی وسعتوں میں قلانچیں لگا رہی ہیں۔ طلسم شش جہات۔ خرمن تمنا۔ چراغ رہ گزر۔ کالے رنگ کا نشتر مرغ۔ سبحان اللہ بلکہ ر اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

مکتوباتِ مجددِ الف ثانیؒ
حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے خطوط تمام اہلِ علم میں ایمان و معرفت اور شریعت و طریقت کا گنجینہ سمجھے گئے ہیں سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھیئے۔
قیمت مجلد جلد اول ـــــ پندرہ روپے ۱۵/-
جلد دوم اٹھارہ روپے ۱۸/- ● جلد سوم ـ پندرہ روپے ۱۵/-

حیاتِ عبدالحیؒ
مولانا علی میاں کے خامۂ زرنگار سے ایک ممتاز عالم دین اور خادمِ ملت کی ایک ایمان افروز سوانح۔ قیمت مجلد ـــــ گیارہ روپے

مآثر و معارف
علوم حدیث، علوم فقہ، فنونِ اسلامیہ اور دیگر اہم موضوعات پر مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ۲۵ عمدہ مقالات کا مجموعہ۔
قیمت ـــــ نو روپے

وحدۃ الوجود
اہلِ معرفت کے مشہور مسلک "وحدۃ الوجود" پر محققانہ گفتگو۔ حضرت مجددِ الف ثانیؒ کا بیان اور اس کے اسرار۔ مجلد ـــــ ڈھائی روپے ۲/۵۰

مکاتیبِ گیلانیؒ
مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے قابلِ قدر خطوط کا مجموعہ۔ معقول و منقول کا خزانہ
مجلد پلاسٹک۔ دس روپے ۱۰/- ۔ مجلد سادہ آٹھ روپے ۸/-

اسماءِ حسنیٰ کے برکات
تعویذ و عملیات کے سلسلہ میں ایک عمدہ کتاب۔ قیمت مجلد۔ چار روپے ۴/-

فضائلِ نماز
شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مشہور کتاب۔ عکسی طباعت کے ساتھ۔ قیمت ـــــ ۱/۲۵

جمالِ مصطفیٰ ﷺ
درد قریشی کی نعتوں کا دل کش مجموعہ
قیمت ـــــ ایک روپیہ
مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

آسان عربی • مکتوبات علیؓ • ہفت رنگ • نجات کے بعد

کھرے کھوٹے

تبصرہ طلب کتابیں سو پچاس تو عموماً ہی جمع رہتی ہیں لیکن کبھی کبھی حسب گوناگوں وجوہ سے ہمیں ایک دو ماہ مطالعہ کا موقعہ نہیں ملتا تو ان کا ڈھیر بڑھ جاتا ہے اور "کھرے کھوٹے" کا کالم تجلی سے غائب ہو جاتا ہے۔ اب "نظریۂ ارتقاء نمبر" کے بعد آج نوبت آ رہی ہے تبصروں کی۔

گو کہ تفسیر ماجدی کا طویل تبصرہ منقطع نہیں ہوا۔ اہل فہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس پر بھی کچھ کم وقت صرف نہ ہوتا ہوگا لیکن "کھرے کھوٹے" کا بہرحال اپنا الگ مقام ہے اور ہم تبصرہ طلب کتابیں بھیجنے والوں سے شرمندہ ہیں کہ انھیں بسا اوقات طویل انتظار کرنا پڑتا ہے اور بعض بے چارے تو کئی کئی دفعہ کتابیں بھیج دیتے ہیں کہ شاید پہلے بھیجی ہوئیں گم ہو گئی ہیں، پھر بھی ان کی باری نہیں آتی۔ اسے ہماری کم توفیقی کہہ لیجئے یا نادانی۔ ہم بہرحال اس اصول کے قائل ہیں کہ تبصرہ کتاب پڑھ کر کرنا چاہیئے اور اجمال و اشارت کے بجائے تفصیل و وضاحت سے کام لینا چاہیئے تاکہ تبصرے کا کچھ حاصل بھی ہو۔

سوچ رہے ہیں کہ اس اصول سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کر لیں۔ کتنا آسان نسخہ ہے دس پانچ ورق الٹ پلٹ کر دیکھے پھٹ سے تبصرہ صادر کر دیا۔ مصنف و ناشر بھی خوش اور تبصرہ نگار بھی چین سے۔ کتابوں کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ انھیں پڑھنے پر صرف وقت ہی خرچ نہیں ہوتا بلکہ بہتیری ایسی ہوتی ہیں جنھیں پڑھکر نزلہ زکام یا دردِ سر یا حد درجہ کی کوفت بھی حصہ میں آتی ہے کس سے فریاد کریں۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ متعدد بار کوشش کی کہ کوئی اللہ کا بندہ اس خدمت کے لئے مل جائے۔ کچھ تبصرے لکھوائے بھی مگر طبیعت پڑھکر جمی نہیں۔ حد سے زیادہ شریفانہ یا پھر مرموز و مبہم تبصرے ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ لیکن شرفاء تو بہرحال شرافت ہی سے کام لیں گے۔ ہماری طرح غیر شریف اور منہ پھٹ بن جانا ہر ایک کے لئے آسان نہیں ہے لہٰذا حاصل وصول اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اپنی گاڑی خود کھینچا کریں۔ چوبیس سال تو گذر گئے۔ کاروانِ شباب کا اڑایا ہوا غبار بھی اب بیٹھتا جا رہا ہے بوڑھاپا خراماں خراماں تشریف لے آیا۔ گالیاں سن کر غصہ نہیں آتا۔ یہ موت ہی کے آثار ہیں۔ عینک بغیر پڑھنا مشکل۔ کتاب موٹی ہو تو سہم سوار ہو جاتا ہے۔ پتلی ہو تو فضول معلوم ہوتی ہے۔ بارہا یوں دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ قدیم عربی کتابیں پڑھے جاؤ۔ سلف کی یادگاریں، اخلاص و تفقہ کے بیش بہا خزانے۔ اتنے میں کاتب دستک دیتا ہے کہ مضمون ختم ہے۔ طلسم خیال پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں اس کیفیت کا نام رہبانیت رکھیں گے یا کچھ اور۔

اب دیکھ لیجئے۔ بات کیا چل رہی تھی۔ قلم کدھر بھٹک گیا۔ شاید کہنا ہمیں یہ تھا کہ تبصرہ طلب کتابوں کو ہم نے بیچ نہیں کھایا بلکہ وہ سامنے کی الماری میں جمع ہیں اور ہمارے سینے پر مونگ دل رہی ہیں ہم عیب چینی سے باز نہیں آتے مگر ناشر حضرات تبصرہ طلبی سے باز نہیں آتے۔ خفا ہو جائیں گے۔ ناک بھوں چڑھائیں گے مگر بھیجیں گے ضرور۔ اب یہ ممکن نہیں کہ پوری کتاب پڑھنے ہی کا التزام کیا جا سکے۔ پچھلے سال تک پڑھنے کی رفتار ناول سائز کے سو صفحات فی گھنٹہ تھی۔ اب گھٹ کر ستر صفحات پر آ گئی ہے۔ قلم بھی نسبتاً سست چلنے لگا ہے۔ جسم فاقہ برداشت نہیں کرتا حالانکہ فاقہ

...بغیر دس بارہ گھنٹے مسلسل لکھنا شاید محالات میں سے ہے۔ ...تے سر میں درد نہیں ہوتا اور کمر مضبوط رہتی ہے۔ روح تو ...لطیف ہو جاتی ہے جیسے ہے ہی نہیں۔ ہاں ہلکے قسم کے مشروبات ...ولات ضرور چلتے رہنے چاہئیں۔ روزے میں کام نہیں ہوتا۔ ...ریں نکات قبر میں ساتھ لے جانے کے قابل تھے مگر اس خیال ...کھول دیئے کہ ممکن ہے کچھ طلبا ان سے فائدہ اٹھالیں۔

آئندہ ہم ایسا کریں گے کہ بعض کتابوں پر بڑے تغیر بھی ...رہ جھاڑ دیں گے، اس کی علامت یہ ہوگی کہ پیشانی پر لفظ "تعارف" ...ر ہوگا۔ اس سے سمجھ جائیے کہ تبصرہ کی آڑ میں دفع الوقتی کی ...ی ہے۔ دفع الوقتی کا لفظ ناموزوں ہو تو خانہ پُری کہہ لیجئے۔

...ان عربی زبان (حصہ اول)

- تالیف:- محمد شہاب الدین ندوی۔ صفحات ۴۸ لکھائی چھپائی غنیمت۔ کاغذ سفید۔ قیمت ایک روپیہ
- ناشر:- فرقانیہ اکیڈمی۔ ۱۶۴ پولیس روڈ بنگلور ۲

جناب شہاب الدین صاحب اپنی قلمی کاوشوں کی بنا پر ...ام نہیں رہے ہیں انھوں نے عربی سکھانے والے اسباق کا ...لہ اپنے ماہنامے "تعمیر فکر" میں شروع کیا تھا اور اسی کا ایک ...کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔

عربی سکھانے والی بہت سی کتابیں بازار میں چل رہی ہیں۔ ...تنقیص مقصود نہیں۔ واقعے کا اظہار ہے کہ شہاب الدین صاحب ...اسلوب کو مقابلۃً سب سے قریب الفہم اور دلچسپ پایا ...سلیقے سے انھوں نے آغاز کیا ہے اور ان کے اسباق کی تکنیک ...کے ذہنوں پر بوجھ نہیں ڈالتی۔ یہی تدریس کی خوبی ہے۔ ...دا نے انھیں صحت، طاقت اور توفیق و استطاعت عطا ...ے کہ اس مفید سلسلے کے مزید حصص شائع کرا سکیں اور اسلام ...کاری زبان —— عربی —— کو ان کے غنیمت ...ے شیوع حاصل ہو۔ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو عربی کو دوسری زبانوں کی طرح محض ایک زبان ہی نہیں سمجھتے بلکہ تقدیس و عظمت سے بھرپور ایک نعمت بھی تصور کرتے ہیں کیونکہ ہمارے رب نے اپنے دائم قائم کلام پاک کے لئے اسی زبان کا انتخاب فرمایا اور جس صحیفے کو تغیر و تبدل کے بغیر قیامت تک موجود و محفوظ رہنا تھا اسے اسی زبان کا جامۂ زریں پہنایا۔ لہٰذا ہمارا عقیدہ ہے کہ جو بھی مسلمان حسنِ نیت کے ساتھ زبانِ عربی کی خدمت کرے گا۔ انشاء اللہ بڑے اجرِ آخرت کا مستحق ہوگا۔ شہاب الدین صاحب کو ہم سعید و خوش نصیب تصور کرتے ہیں کہ انھیں اس کارِ خیر کی توفیق ملی۔ سلیقہ ملا، موقعہ میسر آیا اور بنگلور کے حجن تاجر صاحب نے زیرِ تبصرہ حصۂ اول کی اشاعت کا خرچ اٹھایا ہے انھیں اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ بڑے نفع کا سودا ہے۔ آخرت میں کم سے کم دس گنا نفع وہ ضرور کمائیں گے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ بقیہ حصوں میں بھی وہ اپنا فراخدلانہ تعاون جاری نہ رکھیں۔

اس مجموعی اظہارِ خیال کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی سمجھ کے مطابق بعض قابلِ اصلاح مقامات کی بھی نشاندہی کردیں خود مؤلف نے پیش لفظ میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اہلِ علم کوتاہیوں کی نشاندہی میں بخل نہ کریں۔ ہم "اہلِ علم" کہلانے کے قابل تو نہیں مگر علم کی شُدبُد ضرور ہے۔ لہٰذا اپنی سی نشاندہی کر ہی دیں گے۔

ہاں یہ بتانا تو رہ ہی گیا کہ کتاب کی تصحیح نہایت اعلیٰ ہے۔ آجکل کم ہی کتابیں ایسی چھپ رہی ہیں جو کتابیں اغلاط سے قابلِ لحاظ حد تک پاک و صاف ہوں۔ خصوصاً عربی عبارات اور ان کے اعراب کی غلطیاں تو عام ہو گئی ہیں مگر شاباش ہے شہاب الدین صاحب کو کہ انھوں نے حقِ تصحیح ادا کر دیا۔ ہم ان کی اس محنت کو "کارنامہ" میں شمار کریں گے۔

---

(۱) قاعدے کے مطابق ہر ایسے عربی لفظ کے معنی اسباق کے شروع میں دے دیئے گئے ہیں جنھیں مشق میں استعمال ہونا ہے لیکن پھر بھی سہو ہو ہی گیا۔ عاصمۃ، رئیس، حدیقۃ اور محترث وہ الفاظ ہیں جن کا اردو ترجمہ پوری کتاب میں کہیں نظر نہیں آیا

اگلے ایڈیشن میں اس بھول کی تلافی ہونی چاہئیے۔

(۲) ایک فقرہ ہے الکَّالسۃُ عند الشلودۃ۔ اس کا ترجمہ ہوگا ــــــ "دستر بورڈ کے پاس ہے۔" اس ترجمے کا مفہوم کتنے لوگ سمجھیں گے خصوصاً مبتدیوں کے لئے تو ایسے جملے چیستاں بن جائیں گے۔

(۳) ساتویں سبق میں "بندر" کے لئے "قرد" کا لفظ دیا گیا بالکل درست ہے لیکن ایک الجھن اس سے بعض طلبا ر کے لئے پیدا ہو سکتی ہے وہ یہ کہ قرآن میں یہ لفظ جہاں بھی استعمال ہوا تا کے ساتھ ہوا (قردۃ)، جن لوگوں کو عربی پڑھنے کا شوق ہے قدرتی بات ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ قرآن مترجم بھی دیکھتے ہی ہوں گے۔ یہ لفظ اتفاق سے شروع ہی کی سورتوں میں آیا ہے (بقرہ، اعراف اور مائدہ)، اغلب ہے کہ بہتیروں کی نظر سے گذرا ہو اور ذہن نشین بھی ہو لہٰذا وہ عربی کے مبتدی کی حیثیت میں ذہنی الجھن اور خلش کا شکار ہو سکتے ہیں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ممکن ہے وہ یہ سمجھ بیٹھیں کہ کتاب کے مؤلف سے غلطی ہوئی یا کاتب نے غلط لکھ دیا کیونکہ قرآن تو بہرحال غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ دونوں لغت اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

(۴) نویں سبق میں الحقیبۃ کا ترجمہ "بیاگ" لکھا گیا۔ بعض لوگ بعض علاقوں میں بے شک نشنل کو نیاشنل اور بیگ کو بیاگ بولتے ہیں مگر اہلِ زبان کا صحیح تلفظ "بیگ" ہے اور عوام کا سوادِ اعظم اسی تلفظ سے آشنا ہے بیاگ کو تو ساگ پات جیسا کوئی لفظ سمجھا جائے گا۔ اگلے ایڈیشن میں بیگ ہی کر دینا چاہئیے۔

(۵) صفحہ ۱۲ پر لفظ "زیر" کو دوبار مؤنث استعمال کیا گیا ہے

"..... ہمیشہ زیر آتی ہے۔"

"..... دو زیر ہوں گی۔"

یہ ٹھیک نہیں ہے۔ زیر اہلِ زبان کے یہاں مذکر ہے مؤنث نہیں۔ جیسے زبر، فتح، پیش، ضمہ، رفع، نصب، جر، جزم۔ یہاں تک کہ کسرہ بھی اردو میں مذکر ہی ہے، بس تشدید مؤنث مانی جاتی ہے۔

(۶) تیسرے سبق میں "ضمیر" کا مطلب سمجھاتے ہوئے تمثیل میں یہ فقرہ دیا گیا۔

"رشید آیا اور وہ گیا۔"

اور اس کے تحت لکھا گیا۔

"اس میں رشید اسم ہے اور وہ ضمیر ہے جو رشید کی جگہ پر استعمال کی گئی۔"

حالانکہ یہاں "وہ" کسی اور کے لئے لایا گیا ہے نہ کہ "رشید" کی ضمیر کا مفہوم سمجھانے کے لئے ہزاروں صحیح جملے سپردِ قلم ہو سکتے تھے مثلاً :-

"زید بھلا تمہیں قرض کیسے دیتا وہ تو پکا بخیل ہے۔"

"رشید کی فیاضی کا کیا ذکر کرتے ہو وہ تو ماشاء اللہ حاتم طائی ہے۔"

"طلحہ سے مجھے آج ہی ملنا ہے وہ کل سفر میں چلا جائیگا۔"

اس طرح کے فقرے اگرچہ نسبتاً طویل ہیں مگر آناً فاناً ذہن نشین ہو جانے والے ہیں۔ ویسے اختصار بھی مشکل نہ تھا۔

"زید سے ملو وہ بھلا آدمی ہے۔"

"ریحان سے بچو وہ برا آدمی ہے۔"

ہمارا مقصد یہ ہے کہ شہاب صاحب جیسے اچھے قلمکار صحتِ انشار سے ذرا بھی غفلت برتیں تو اسے ہنرمندی نہیں کہیں گے۔

(۷) ایک دو جگہ صندوق کا لفظ آیا ہے اور صاد پر پیش ہے یہ درست بھی ہے لیکن بول چال میں صاد کا فتح عام ہو گیا ہے (صَندوق)، نہ جانے کتنے قارئین یہ گمان کریں گے کہ صاد پر پیش مؤلف کا سہو ہے یا کاتب کا۔ اس گمان کا ازالہ ایک ایک نوٹ کے ذریعہ کر دینا چاہیئے تھا کہ صحیح لغت صاد کے پیش ہی سے ہے نہ کہ زبر سے۔

(۸) صفحہ ۲۰ پر ایک نحوی قاعدہ بیان کر کے لکھا گیا۔

"اس قاعدہ کو صرف اس لئے بیان کیا کہ قانونی طور پر آپ کی الجھن رفع ہو جائے۔"

مافی الضمیر تو مؤلف کا اس فقرہ سے ظاہر ہو گیا لیکن قلم کی شائستگی مجروح ہوئے بغیر نہ رہی۔ نحو یا صرف کے کسی ضابطے کا لفظ قانون سے تعبیر کرنا فصاحت سے بعید ہے۔ پھر "قانونی طور پر" کا ٹکڑا تو اور بھی کھٹکتا ہے۔

اسی صفحہ پر :-

" خالی جگہوں میں مناسب الفاظ بھرتی کیجئے "

یہ زبان ثقہ نہیں ۔ بھرتی کا لفظ پیشہ ورانہ قسم کا لفظ ہے شعر و سخن کے سلسلہ میں استعمال ہو تو مذمت کا کام دیتا ہے" بھرتی کا شعر" غیر معیاری اور بے مزہ شعر کو کہتے ہیں۔

فقرہ یوں لکھنا تھا :-

" خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پُر کیجئے "

(۹) مخترعۃ کا لفظ دو جگہ استعمال ہوا (صفحہ ۷، ۴) پہلی جگہ "ما" پر زیر چھپ گیا ہے ۔ یہ کتابت کی غلطی ہے ۔ زبر درست ہے لیکن المذ یاغ مخترعۃ العلوم کا مطلب اس کتاب کا متعلم کیسے سمجھے گا ۔ علوم علم کی جمع ہے یہی عام لوگوں کی واقفیت ہے اس لفظ کے مخصوص اصطلاحی معنی کیا ہیں ۔ یہ کتاب میں نہیں بتایا گیا ۔ پھر متعلم کیسے یہ ترجمہ کرے گا کہ

" ریڈیو سائنس کی ایجاد ہے "

سائنس کو عربی میں فلسفۃ طبیعیّۃ کہتے ہیں یا پھر العلوم الطبیعیّۃ ۔ کثرت استعمال میں فقط " العلوم " رہ گیا مگر مبتدی متعلم کیسے جانے گا جبکہ " علوم " کا ذکر ہی آگے پیچھے نہیں ۔

---

(۱۰) صفحہ ۳۷ انت صدیقٌ نجیب ۔ یہ فقرہ تو کتابتی چوک کا شکار رہا قاف کی تنوین غلط ہے لیکن مبتدی الصلوٰۃ قرۃ العین کا ترجمہ کیسے کرے گا جبکہ قرۃ العین کے معنی کتاب میں بیان نہیں کئے گئے ۔

(۱۱) صفحہ ۲۵ پر حِذاءٌ کا ترجمہ لکھا گیا ہے :-

" جوتا ، بوٹ "

اس میں ایک لطیف خامی ہے ۔ متعلم یہ سمجھے گا کہ حذاءٌ ہر طرح کے جوتے کو بھی کہتے ہیں اور مجرد بوٹ جوتے کو بھی ۔ حالانکہ بوٹ جوتے کو جزمۃ کہتے ہیں اور حذاء کا اطلاق بلا تخصیص ہر جوتے پر ہوتا ہے ۔ اگر زید کے پاس متعدد جوتے ہوں سلیپر بھی ، بوٹ بھی ، چپل بھی ، سینڈل بھی اور وہ ملازم سے بوٹ منگوانا چاہے تو حذاء کا لفظ نہیں بولے گا بلکہ جزمۃ یا بوٹ بولے گا ۔ صحیح تربات یہ تھی کہ حذاءٌ کا ترجمہ جوتا لکھا جاتا جو نعل کا مرادف ہے ۔ اسی سے مسح الحذاء ہے یعنی جوتوں پر پالش کرنا ۔ بوٹ کی تخصیص جزمۃ میں ہے ۔ ہاں جزماتی ہر جوتا بنانے والے یا مرمت کرنے والے کو کہیں گے ۔ بوٹ کی تخصیص اڑ جائے گی ۔ جزمۃ کو غرفۃ جیسا سمجھئے کہ کہ اس کا اطلاق صرف سینڈل پر ہوتا ہے ۔ ہر جوتے پر نہیں ۔

مچھلی کے لئے دو لفظ لکھے گئے " حوت ۔ سمک ۔ ہماری رائے میں صرف سمک لکھنا انسب تھا ۔ حوت کا اطلاق عموماً بڑی مچھلی پر ہوتا ہے ۔ جبکہ سمک عام ہے ۔ یہ دونوں لفظ شمشیر اور تلوار کی طرح مرادف نہیں ہیں کہ ہر محل میں یکساں طور پر استعمال ہوجائیں مثلاً حضرت یونس علیہ السلام کو صاحب الحوت کہنا فصیح ہے مگر صاحب السمک کہنا غیر فصیح ۔ لہٰذا مبتدیوں کو مچھلی کا مرادف سمک ہی بتانا چاہیئے حوت کی تعلیم اگلے مراحل میں دی جائے یا پھر وضاحت کردی جاتی کہ حوت اکثر و بیشتر بڑی مچھلی کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔

غرفۃٌ کا ترجمہ لکھا گیا " کمرہ ، روم "

حالانکہ غُرفہ چیمبر کو بھی کہتے ہیں دیوان اور بالاخانہ کو بھی ایسے متعدد معنیٰ والے الفاظ سے یا تو اجتناب کیا جاتا یا سب معنی دیدیئے جاتے ۔

خدا ہماری مغفرت کرے ۔ خاصے بدنام ہو گئے ہیں کہ یہ شخص نکتہ چیں ہے خردہ گیری کرتا ہے ۔ بال کی کھال نکالتا ہے ۔ ہم کسی کو کیسے یقین دلائیں کہ خامیوں کی تلاش میں ہمارے قصد و نیت کو دخل نہیں ہوتا ۔ دورانِ مطالعہ آپ سے آپ جو خامی نظر آگئی اس کی صاف صاف نشاندہی کردی نشاندہی بھی اس لئے کردی کہ علمی دیانت اور تنقیدی امانت داری کا یہی تقاضا ہے ۔ اہانت ، تحقیر اور تنقیص ہرگز پیش نظر نہیں ہوتی ۔

ویسے ہماری علمی قابلیت بس یونہی سی ہے خصوصاً عربی میں تو بالکل ہی اناڑی ہیں اس لئے شہاب الدین صاحب ہماری آراء کو چھان پھٹک کر قبول کریں ۔ ضروری نہیں کہ ہماری رائے درست ہی ہو ۔

تبصرے کا حاصل یہ ہے کہ عربی سیکھنے کے شائقین کے

لئے یہ سلسلہ بہت عمدہ ہے۔

مکتوبات علیؓ

مرتبہ:- حکیم نبی احمد خاں بریلوی ● سائز متوسط
صفحات ۲۲۰۔ کاغذ سفید لکھائی چھپائی روشن
قیمت مجلد مع ڈسٹ کور آٹھ روپے
ناشر:- مکتبہ رحمانیہ۔ پٹھانپورہ اسٹریٹ۔ دیوبند

یہ کتاب اب سے چھ سال قبل لاہور کے مشہور ناشر اسلامک پبلیکیشنز نے چھاپی تھی نفیس طباعت وکتابت اور اعلیٰ تصحیح کے ساتھ۔ اب یہ سعادت مکتبہ رحمانیہ کے حصہ میں آئی ہے اس میں حضرت علیؓ کے خطوط کا عربی متن بھی ہے اور الفاظ پر اعراب کا التزام بھی اس لئے کتابت کی تصحیح کا کام نہایت مشکل تھا لیکن آفریں ہے مکتبہ رحمانیہ کو کہ اس نے پوری توجہ اور کوشش صرف کی جس کے نتیجہ میں اغلاط بہت کم برائے نام ہی ہیں۔ ورنہ آجکل تو عموماً ایک صفحہ بھی ایسا نہیں چھپتا جو الفاظ واعراب کی غلطیوں سے پاک ہو۔

نفس کتاب اس لحاظ سے بڑی وقیع ہے کہ مرتب نے نہ صرف خطوط کی تلاش وتنقیح اور متعدد نسخوں کے تقابل وغیرہ میں بڑی محنت کی ہے بلکہ اردو ترجمہ نہایت شاندار ہے۔ سلیس رواں اور شگفتہ۔ حضرت علیؓ جیسے بلند پایہ ادیب وخطیب کی تحریر کا شایان شان ترجمہ آسان نہیں۔ ان کے یہاں محاوروں کی بہتات ہوتی ہے اور لغات دقیقہ کی کثرت مگر مرتب نے اکثر محاوروں کا ترجمہ محاوروں ہی سے کر کے خطوط کو ایسا بنا دیا ہے جیسے اردو ہی میں لکھے گئے ہوں۔ اس سے بڑھکر ترجمے کی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔

مرتب کی کامیاب عرق ریزی کا اچھا تعارف مولانا امتیاز علی عرشی کے مقدمہ اور مولانا شاہ محمد جعفر کے "تعارف" سے بھی ہو جاتا ہے مرتب کا اپنا پیش لفظ اور بھی مفصل ہے۔ ترجمے کے علاوہ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس کے نام خط لکھا گیا وہ کون تھا، کیا تھا، کس عہدے پر فائز تھا وغیرہ، جن مقامات اور شہروں کا ذکر خطوط میں ہے ان کی بھی فہرست انڈیکس کے طریق سے آخر میں شامل ہے اور حواشی میں مزید تفصیلات بھی۔ جہاں جہاں سے خطوط لئے گئے ہیں ان کتابوں کی فہرست بھی موجود ہے۔ غرض ترقی یافتہ تالیفی معیار پر کتاب پوری اترتی ہے البتہ مرتب نے یہ اعتراف خود ہی کر لیا کہ خطوں کی صحت اور عدم صحت کے سلسلہ میں انھوں نے تنقید ودرایت کو دخل نہیں دیا بلکہ حوالہ پر قناعت کر لی۔ اسی لئے وہ فراخدلی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ناقدین کو اختیار ہے جسے چاہیں تسلیم کریں اور جسے چاہیں نہ تسلیم کریں۔ ہم سمجھتے ہیں اس صاف گوئی کے بعد ان پر کوئی الزام نہیں آتا، اگر بعض خطوط کلاً یا جزءاً ناقابلِ اعتماد خیال کئے جائیں۔

ہم نے حرف حرف پڑھ لیا۔ ہمارا ناچیز خیال یہ ہے کہ بعض خطوط حذف واضافے سے نہیں بچ سکے۔ کہیں کہیں تو اسلوب اور انشاء اس کی چغلی کھاتے ہیں۔ کہیں کہیں معانی اس کا شبہ پیدا کرتے ہیں مثلاً حضرت معاویہ کو فاسق ابن فاسق اور مرتشی اور دیگر سخت ترین الفاظ لکھنا کچھ زیادہ قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ بعض اور شخصیتوں کے بارے میں بھی کہیں کہیں لب ولہجہ اور الفاظ بڑے سخت ہیں اگر ان سب خطوط کو حرفاً حرفاً حضرت علیؓ کے مان لیں تو جہاں ان کی قدرتِ کلام اور زورِ بیان اور بعض محامد ومحاسن کا نقش دل پر ثبت ہوتا ہے وہیں بعض ایسے میلانات بھی علم میں آتے ہیں جن کی تحسین آسان نہیں ہے۔ مثلاً نسل ونسب کا مبالغہ آمیز احساس۔ اپنے تفضل واستحقاق کا غیر معمولی یقین۔ سخت کلامی۔ جوشِ غضب۔ ان غیر مستحسن اوصاف کی اچھی توجیہ بھی ممکن ہے اگر وہ خطوط سامنے ہوں جن کے جوابات آپ نے لکھے ہیں۔ ان خطوں میں اگر واقعی ناشائستہ نوع کی اشتعال انگیزیاں ہوں تو ممدوح کی اشتعال پذیری اور سخت کلامی کے لئے جواز نکل آتا ہے۔

بہرحال ہم غلاموں کا یہ منصب نہیں کہ دامادِ رسولؐ کے مکتوبات پر جرح کر سکیں۔ ہاں یہ ضرور حق ہے کہ جن نکڑوں کو

آپ کی شانِ بلند کے خلاف سمجھیں انھیں الحاقی قرار دیدیں یا پھر یہ گمان کرلیں کہ راویوں سے چوک ہوئی۔

مجموعاً ان مکتوبات کے مطالعے سے ایمان کو غذا بہم ہوتی ہے بشرطیکہ حُبِّ علی بغضِ معاویہ یا حبِ معاویہ بغضِ علی میں تبدیل ہوئی ہو۔ تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْنَا مَا کَسَبْنَا۔

حضرت علیؓ کے بعض فقرے تو دل میں اترتے چلے جاتے ہیں اور وجدان جھوم اٹھتا ہے جیسے لا رأی لمن لا یطاع ——— اناکم لن هابکم فی التقیہ اور ایسے ہی بے شمار۔

غیر مناسب نہ ہوگا اگر اب ان مقامات کی بھی نشان دہی کردیں جہاں بھول چوک نظر آئی۔

بڑے تبصرے نگار۔ طباعت وکتابت کی غلطیوں میں سر نہیں مارتے مگر ہم چھوٹے تبصرہ نگار ہیں اس لئے یہ دردسری بھی اکثر مول لیتے ہی ہیں۔ دراصل علمی ولٹریری کتابوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجۂ صحت پر دیکھنا ہمیں بے حد محبوب ہے۔

آج کل ایک اور مصیبت بھی تجربہ میں آرہی ہے کہ بہتیرے الفاظ کا حلیہ پریس والے بگاڑ دیتے ہیں۔ چھپ کر آجائے تو پڑھئے اور سر پیٹئے۔ ضروری نہیں کہ کتاب میں پائی جانے والی ہر کتابتی غلطی کاتب یا مصحح کی غفلت کا ثمرہ ہو۔ پریس کی بدعنوانیوں کا بھی اس میں دخل ہوسکتا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں کتابتی غلطیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو اصل پاکستانی نسخے میں بھی موجود ہیں اور دوسری وہ جو صرف اسی نسخے میں ہیں۔ دونوں کو الگ الگ پیش کرنا مفید ہوگا۔ تجلی کی کچھ کاپیاں اب بھی کہیں نہ کہیں گھوم کر پاکستان پہنچ ہی جاتی ہیں۔ کیا بعید ہے کہ اسلامک پبلیکیشنز والے بھی تبصرے سے فائدہ اٹھالیں۔

بعض اغلاط کو ہم نے نظر انداز کیا مثلاً ایک ہی حرف پر ڈبل اعراب چھپ گیا یا کوئی اردو لفظ کتابت سے رہ گیا۔ ایسی غلطیوں کو ناشر خود ڈھونڈ کر اگلے ایڈیشن میں تلافی کرسکتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ ایڈیشن کی غلطیاں :-

ص۲۲ : وَحَمْزَۃَ سَیِّدُ الشُّھَدَاءِ۔ یہ دراصل حمزۃُ ہے اور سیّد کی یا پر زیر ہونا چاہئے زبر غلط ہے۔

ص۲۵ : وَمَنَعُوْنَا ——— نون پر جزم نہیں فتح کا موقع ہے مَنَعُوْنَا۔

ص۶۶ :- وسرح منها الی الکوفۃ محمد ابن ابی بکر ومحمد ابن جعفر :- یہاں دونوں جگہ لفظ محمد کی دال پر جر (زیر) غلط ہے فتح دینا تھا۔

ص۸ : نهیکُ ابنَ صُوحان : یہ دراصل ابنا ہے۔ ابن کا تثنیہ حضرت علیؓ نے سیحان اور زید دونوں کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ بالترتیب صوحان اور محمد وج کے بیٹے تھے۔

ص۸۲ :- یا جریرِ انطلقَ الی معاویۃ ۔ قاف پر فتح کا محل نہیں۔ جزم کا محل ہے۔

ص۸۸ :- محونق یہ کاتب نے عین کو حا بنادیا ہے معونق ہونا چاہئے تھا۔

ص۹۴ :- فَادْخُلْ فیھا۔ الف پر فتح صحیح نہیں۔ جزم دینا چاہئے۔ فَادْخُلْ۔

ص۹۵ :- تَنْھَرُوْھَا نون پر پیش غلط ہے صحیح لفظ تَنْھَرُوْ ہے۔

ص۱۱۱ :- حتیٰ یَاتِیْکَ رسولی۔ یا تی کی یا کا جزم کاٹ کر فتح بنا دیا جائے۔

ص۱۲۹ :- وخِفتَ ایک نقطہ زائد ہوکر ف کو ق بنا گیا لفظ ہے خِفْتَ۔

ص۱۳۲ :- قرظۃ بن کعب الانصاری۔ کعب کی با پر دو نہیں فقط ایک زیر ہونا چاہئے۔ نیز اسی صفحہ پر یوم تخیو ——— اعمالھم نظر آیا ہے۔ یہ بیچ کا ڈیش لایعنی ہے بلکہ نقصان دہ۔

ص۱۵۳ :- وتجرد ولکموٗ الظالمون۔ یہ دراصل لکمُ ہے جو لکمو چھپ گیا ہے۔

ص۱۶۵ :- وَقُتِلَ بنَ حسان تا پر جزم کا محل نہیں۔ فتح دیا جائے (قَتَلَ)

ص۱۸۹ : حتّٰی تَمُرُّ را کا پیش اڑا کر فتح کیا جائے (تَمُرَّ)

وہ کتابتی اغلاط جو دونوں ایڈیشنوں میں مشترک ہیں درج ذیل ہیں :-

ص۲۴ :- الی معاویۃَ بنَ ابی سفیان ہمارے خیال میں

ابن کا نون یہاں مجرور ہونا چاہیئے (بنِ)، یہ کتابتی سہو شاید نہ ہو کیونکہ آگے صفحہ ۱۰۴ پر بھی نون مفتوح ہی نظر آ رہا ہے اور ۱۶۴ کے خط میں اسی طرح مِنْ قَبْلِ قُرَيْظَةَ بْنَ كعب پڑھنے میں آیا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ محترم مرتب ہی اعراب دینے میں چوکے ہیں۔ چوک شاید نحوی قاعدہ کے اطلاق میں ہوئی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ صفت و موصوف کا اعراب ایک ہی ہونا چاہیئے لہٰذا معاویۃ اور قریظۃ پر فتح آیا تو ابن بھی مفتوح لکھ دیا گیا۔ حالانکہ ان الفاظ پر فتح تو اس لئے آیا ہے کہ غیر منصرف ہیں ورنہ حالت ان کی جری ہی ہے غیر منصرف نہ ہوتے تو فتح نہیں کسرہ آتا صفت کا اعراب موصوف کی اصل حالت کے اعتبار سے تجویز ہوگا۔ جیسے :-

ارسل رسولاً الیٰ عثمانَ بنِ ابی العاصِ

یا روی عن عُبادَةَ بنِ الصّامِتِ۔

ان دونوں مثالوں میں عثمان اور عُبادۃ غیر منصرف ہونے کی بنا پر مفتوح ہیں مگر الیٰ اور عن کی وجہ سے اصلاً مجرور ہیں لہٰذا ابن کے نون پر زیر ہی زیب دے گا زبر نہیں۔ اس کی مثال ۲۶۴ ویں خط کے عنوان ہی میں موجود ہے الیٰ قرظۃ بنِ کعب۔ یہاں ابن کو اپنے موصوف قرظۃ کی اصل حالت پر ہی محمول کر کے تو مجرور رکھا گیا ورنہ ظاہراً تو قرظۃ مفتوح ہے۔

ص۱۵۰ :- وَ دُرِبَتْ نَزَالِ اقام اھل بیتہ :- یہاں ہماری کم علمی آفت بن گئی۔ ہماری موٹی سمجھ میں تو یوں آتا ہے کہ یہ نُزّال (بہ تشدید زا) ہونا چاہیئے اور لام پر پیش آنا چاہیئے۔ بہتر ہے کہ تحقیق کر لی جائے۔

ص۱۵۵ :- اِنَّ اللہ تعالیٰ ذِکْرُہٗ لما قبض نبیّہٗ :- شاید ذکر کا محل نہیں ذَکَرَہٗ ہونا چاہیئے اللہ یہاں معناً حالتِ فاعلی میں ہے نہ کہ حالتِ اسمی میں۔

ص۱۵۶ :- وَ فَزِعْتُ الیکم لما حدث :-

فَزَعَ جب باب فتح یفتح سے آتا ہے تو اس کے معنیٰ ہوتے ہیں ڈرنا۔ یہاں حضرت علیؓ فرما رہے ہیں کہ اے اہلِ کوفہ مجھ پر جب بھی کوئی افتاد پڑی یا آڑا وقت آیا ہے میں نے تمہاری ہی پناہ لی ہے۔ تم سے ہی فریاد چاہی ہے۔ تمہیں ہی مدد کو پکارا ہے۔ یہ مفہوم سمِعَ یسمع سے ادا ہوتا ہے فَزِعْتُ الیکم

صحیح ہے نہ کہ فتح سے۔ شاید غلط ہو۔

ص۱۶۱ :- عند من یَّعِیبَہٗ :- سمجھ میں نہیں آیا کہ یا کو فتح کس عامل نے دیا۔ بظاہر تو اسے مضموم ہونا چاہیئے (یَعِیبُہٗ)

ص۱۴۶ حَجَرُ بنُ عدی : حا پر فتح غلط چھپ گیا پیش ہونا چاہیئے۔ (حُجر)

ص۱۵۳ :- بالغضب والفساد۔ نقطے کے اضافے نے غصب کو غضب بنا دیا۔ یہاں غصب ہی ہونا چاہیئے۔

ص۱۶۱ :- کان الرسول اباجرۃ الحنفیُّ۔ یہیں حنفی کے اعراب پر شبہ ہے۔ یہ رسول کی صفت نہیں ابوجرہ کی صفت ہے۔ غور کر لیا جائے۔

ص۱۶۶ :- حتّیٰ ینصرِمَ عَنَا حمارّۃ القیظ۔

عنا مشدد ہونا چاہیئے (عَنّا)

کاش مکتبہ رحمانیہ والوں کا کارنامہ یہ ہوتا کہ علمی تفکر سے کام لے کر وہ اصل کے کسی سہو کا ازالہ کرتے مگر وہ ایسا نہ کر سکے اور سلوٹوں میں کچھ اضافہ ہی ان کے حصہ میں آیا۔

اب ہم دوسرے پہلوؤں کی طرف آتے ہیں۔ فاضل مرتب کے عمدہ پیش لفظ میں ایک فقرہ لائقِ اصلاح معلوم ہوا۔

" یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے علاوہ کسی انسان کو تمام صلاحیتیں عطا نہیں فرمائیں "

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انبیاء تمام صلاحیتوں سے متصف تھے " تمام " کا لفظ بڑا وسیع ہے۔ انبیاء کو صرف ان صلاحیتوں سے نوازا گیا جو ان کے کارِ نبوت کے لئے ناگزیر تھیں۔ باقی صلاحیتوں کے سلسلہ میں ان کا وہی حال تھا جو ابن آدم کا ہونا چاہیئے۔ کسی میں صبر و ضبط کم کسی میں زیادہ۔ کوئی بہت ذکی کوئی نہیں۔ صلاحیتوں کی فہرست تو بہت لمبی ہے۔ ضروری نہیں کہ ساری ہی صلاحیتیں ہر نبی کو عطا کر دی جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مؤلف نے یہ مبالغہ دانستہ نہیں کیا۔ رو میں لکھ گئے مگر غلو سے بچنا بہرحال احتیاط کا تقاضا ہے۔

ص۱۹ :- " حضرت علیؓ کی عمر کا دسواں سال تھا کہ ریگستان عرب سے آفتابِ رسالت نے طلوع ہو کر سارے عالم کو اپنی شعاعوں سے منور کیا "

یہ طرزِ تحریر پرانا ہو چکا۔ اس میں بس شعریت کا حسن ہے
یت کا نہیں جب حضرت علیؓ دس سال کے تھے تو آفتاب
لت کی شعاعیں بہت محدود دائرے میں ضوفشانی کر رہی تھیں
عالم تو ان شعاعوں کے دائرۂ کار میں بہت بعد میں آیا ہے۔
اللہ علیہ وسلم۔

چند مقامات پر ترجمہ بھی افہام و تفہیم کا طالب ہے۔

ص۳۶:۔ اختار الاسلام دینا لنفسہ و ملائکتہ
سُلہ اس کے ترجمے میں لنفسہ نظرانداز ہو گیا۔

ص۵۶:۔ لتعرفنہم عما قلیل تطلبونک۔ اس عبارت
رہ پھر سے دیکھنے کے قابل ہے۔

ص۹۲:۔ وھو یماطلہ بالبیعۃ:۔ یہ فقرہ ترجے میں
گیا۔

ص۹۵:۔ "نہ جہاں تیزی مناسب احتیاط ہے ...."
مناسب اور احتیاط کا اجتماع اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ان میں
ں ایک لفظ چن لینا تھا۔

ص۱۰۱:۔ " اور انھیں یہ ظاہر نہیں کیا کہ مجھے تم نے
ہے۔"
فصیح زبان "ان پر ظاہر کرنا" ہے نہ کہ انھیں ظاہر کرنا

ص۱۸۱:۔ حَتّٰی اِذَا فُعِلَ بِوَاحِدِنَا مَا فُعِلَ بِوَاحِدِھِمْ
یلَ الطَّیَّارُ فِی الْجَنَّۃِ وَذُوالْجَنَاحَیْنِ۔
ترجمہ یہ کیا گیا:۔

"ہم سے ایک کے ساتھ وہ ہوا جو کسی دوسرے
کے ساتھ نہیں ہوا (اسے)، ذوالجناحین اور جنت
کا پرندہ خطاب ملا۔"

یہاں چوک ہو گئی مترجم سے۔ حالانکہ اس کی گنجائش نہیں
وہ بے خیالی میں ما کو نافیہ تصور کر گئے ہیں اور پھر
ق وسیاق کے واضح تقاضے نے بھی نہ جانے کیوں انھیں
ہ نحوی غلطی پر متنبہ نہیں کیا۔ ما یہاں موصولہ ہے اور صحیح
ہے:۔

"یہاں تک کہ وہی فعل جو دیگر مہاجرین و انصار
میں سے کسی بھی اور فرد کے ساتھ کیا گیا تھا جب

ہمارے خانوادے کے ایک فرد (جعفر طیارؓ)
کے ساتھ کیا گیا تو وہ جنت کا پرندہ اور ذوالجناحین
کہلائے۔"

مترجم پر مخفی نہیں کہ حضرت علی اپنے خاندان کے فضل و شرف کی ایک خاص دلیل پیش کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ دیکھو مہاجرین و انصار بھی خدا کی راہ میں شہید ہوئے اور صاحبِ فضیلت ہیں مگر ہمارے خانوادے کا ایک فرد حمزہؓ شہید ہوا تو اسے سیّدُ الشہداء کا خطاب ملا اور رسول اللہ نے اس کی نمازِ جنازہ میں بھی نسبتاً خصوصیت برتی۔ اسی طرح کیا تم نہیں دیکھتے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں ہاتھ تو صحابہ میں سے کتنوں ہی کے کٹے اور بیشک ان کو بھی اپنی جگہ فضیلت حاصل ہے مگر قطعِ ید کا یہ فعل جب ہمارے ایک آدمی (جعفر ابن طالب) کے ساتھ واقع ہوا تو اسے ذوالجناحین اور طائرِ بہشتی کا خطاب ملا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہم اللہ اور رسول کی نظروں میں زیادہ معزز ہیں۔

جو ترجمہ مذکورہ فقرہ کا مترجم نے کیا ہے وہ تو صورتِ استدلال ہی بگاڑ دیتا ہے اور خلافِ واقعہ بھی ہے اور حضرت علیؓ خود فرما رہے ہیں اَوَلَا تَرٰی اَنَّ قَوْمًا قُطِعَتْ اَیْدِیْھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلِکُلٍّ فَضْلٌ (اے معاویہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ انصار و مہاجرین میں سے بہتیرے افراد کے ہاتھ اللہ کی راہ میں کاٹ ڈالے گئے اور ان میں سے ہر ایک کو یقیناً فضیلت ہے)، پھر یہ کیا کہنے کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ حضرت جعفر کے ساتھ وہ ہوا جو کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوا حالانکہ جو کچھ ہوا وہ قطعِ ید ہی تھا۔

فاضل مترجم نے غالباً مراد یہ لی ہے کہ طیار اور ذوالجناحین کے خطاب پانے کا جو فعل حضرت جعفر کے ساتھ ہوا وہ کسی اور کے ساتھ نہیں ہوا۔ یہ مراد لی جا سکتی تھی، اگر حضرت علیؓ کے الفاظ اس کا ساتھ دیتے۔ لیکن پورے فقرے کے فریم میں اس مراد کی گنجائش نہیں نکلتی اور حتّٰی کے بعد جب اِذَا آ گیا تو مائے نافیہ کا نحوی جواز ہی ختم ہو گیا۔

ابھی جس فقرے اَوَلَا تَرٰی کا ترجمہ ہم نے کیا اس کے ترجمے میں بھی ذرا سی سلوٹ رہ گئی ہے۔ مؤلف کا ترجمہ یہ ہے۔

"یا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کی راہ میں جن لوگوں

کے ہاتھ کٹے ان سب کو فضیلت حاصل ہے"۔

اس ترجمہ سے وہ چیز بدل گئی ہے جسے حضرت علیؓ دکھلانا چاہتے ہیں مختلف جہادوں میں صحابہ کے ہاتھ پیر گردنیں اسر سبھی کچھ کٹتے رہے تھے جو معلوم بات تھی۔ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفرؓ کے ہاتھ کٹے تو یہ کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو کسی صحابی کو پیش نہ آیا ہو۔ حضرت علیؓ اسی صورتِ حال کے پس منظر میں فرما رہے ہیں کہ اے معاویہؓ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ انصار و مہاجرین کے ہاتھ جہاد میں کٹتے رہے ہیں۔ پھر یہ اعتراف وہ اپنے طور پر فرماتے ہیں کہ یقیناً وہ لوگ بھی محرومِ فضیلت نہیں تھے جن کے ہاتھ کٹے۔ اس اعتراف سے یہ جتانا مقصود ہے کہ میں ان لوگوں کا مرتبہ نہیں گھٹاتا۔ ان کی تحقیر نہیں کرتا۔

مگر مؤلف کے ترجمے میں یہ آخری ٹکڑا "وَلِكُلٍّ فَضْلٌ" اور ہی محل پر اتر گیا ہے۔ اب مطلب یہ ہو گیا ہے کہ اے معاویہ مقطوع الید افرادِ قوم کو جو فضیلت ہے وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ آخری ٹکڑا "تری" کا مفعول اب فضیلت بن گئی نہ کہ قطع ید۔ حالانکہ "وَلِكُلٍّ فَضْلٌ" کا واؤ اس طرح مہمل ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لئے مترجم نے اس واؤ کو نظر انداز ہی کر دیا۔

بہرحال اس مقام پر عبارت فہمی اور ترجمہ میں چوک ہوئی ہے یہ مفعول بدل جانے کا حادثہ خطاب کے پہلے فقرہ میں بھی پیش آیا غور کر لیا جائے۔

تبصرے کا حاصل یہ ہے کہ کتاب وقیع، لائقِ مطالعہ اور افادیت کی حامل ہے یہ الگ بات ہے کہ ہر انسانی کوشش سہو و خطا کے کچھ نہ کچھ پھول اپنے اندر ضرور رکھتی ہے تنزیہہ کاملہ تو بس اللہ ہی کا وصفِ مخصوص ہے۔

ہفت رنگ

مرتبہ: ضیا سعید • صفحات ۵۲ • لکھائی چھپائی اچھی۔ کاغذ عمدہ • قیمت۔ ڈیڑھ روپیہ
• ناشر: مکتبہ شرف۔ ٹانڈہ۔ ضلع رام پور (یوپی)

یہ چند غیر معروف شعراء کے کلام ایک تعارفی خاکہ ہے۔ خاور شرقی، ضیا سعید، محسن بن عمران، اسرار الحسن ترمذی، خمار عزیزی، محمد شاکر عیش، مظہر عمران۔ ہر شاعر کا مختصر تعارف پھر نمونۂ کلام۔ گیٹ اپ سے سلیقہ جھلکتا ہے۔ اہلِ ذوق کے لئے اچھا تحفہ ہے ضروری نہیں کہ اچھے شعر صرف مشہور ہی شعراء کے یہاں ہیں۔ کتنے ہی اچھے شاعر گمنام رہ جاتے ہیں۔ اس گلدستے میں بھی اچھے شعر عنقا نہیں ہیں ہمارا انتخاب۔

آپ تک رات گئے آنچ تو آتی ہوگی
ان سلگتے ہوئے سانسوں کی حرارت بھیجی (خاور)

اپنے افسانے کو اس طرح مرتب کیجے
بے وفائی کا ہر الزام مرے سر جائے (ضیا سعید)

اربابِ وفا شاد ہیں غم بھول گئے ہیں
شاید یہ تری زلف کے خم بھول گئے ہیں (〃)

یا میرے غمِ دل کا نہیں کوئی مداوا
یا مجھکو کبھی اہلِ کرم بھول گئے ہیں (〃)

اور کچھ دیر ذرا بیٹھو کے ہنس ہیں گا لیں
غم اٹھانے کو تو اک عمر پڑی ہے یارو (〃)

دستِ تو عزت و عظمت کے تحفظ کے لئے
اور بینے ہیں شہادت کے تمہیں جام ابھی (محسن)

کلیوں کے آنسوؤں کو بھی شبنم سمجھ لیا
ہم یوں فریبِ صبح بہاراں میں آگئے (ترمذی)

وہ اپنے ذہن ہی کے تراشے ہوئے سہی
کتنے صنم ہیں آج مسلماں کے آس پاس (خمار عزیزی)

نہیں کچھ خبر تھا وہ کیسی کی نظر کا شعلۂ برق وش
مجھے عیش اتنا خیال ہے مرے آشیاں سے گذر گیا (عیش)

عام معیارِ تبصرہ سے تبصرہ مکمل ہو گیا۔ ہم اسے تبصرہ نہیں بس اشتہار سمجھتے ہیں۔ دوسرا رخ بھی سامنے رکھدیا جائے تب شاید تبصرہ کہہ سکیں۔

کتابت کے سہو کافی ہیں۔ خاور صاحب نے شعراء کے تعارف کی خدمت انجام دی ہے۔ نثر مجموعاً ان کی بری نہیں لیکن

جب کوئی چیز پریس میں لائی جائے تو کسی اہلِ نظر کو بھی دکھا لینی چاہیئے۔ بعض فقرے اصلاح طلب تھے

"اسلام ان تمام لوازمات نوعِ انسانی کو محیط کرتا ہے یا نہیں۔"

لفظ محیط کا محل نہیں تھا۔ محیط کرنا لغو ہے "احاطہ کرنا" اس کا بدل ہو سکتا ہے۔

"ابتدائی کلام حضرت احمق پھپھوندوی کا مرہونِ تلازہ ہے۔"

تلازہ تو کوئی لفظ ہی نہیں۔ اگر کاتب نے "تلامذہ" کا تلازہ لکھدیا جب بھی بات نہیں بنتی "مرہونِ اصلاح" لکھنا تھا۔ یا پھر زیادہ اچھی بات یہ تھی کہ سادہ عبارت لکھتے۔ "ابتداءً اپنا کلام فلاں صاحب کو دکھلاتے تھے۔"

شریک بزمِ شعرا میں سے ہر ایک کے بارے میں ہماری مجموعی رائے درج ذیل ہے۔

خاور شرقی کے اندازِ بیان میں ابھی الجھاؤ باقی ہے۔ الفاظ ان کے بلند خیالات کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ کافی مشق کے علاوہ کسی اچھے استاد کی رہنمائی بھی حاصل کرنی چاہیئے۔ بطور نمونہ چند اشارے۔

ہر بوالہوس کو وقت کا یہ ہی کمال ہے
تعظیم اقتدار کریں آدمی کہیں

"یہ ہی" جائز تو ہے مگر بس جائز۔ فصیح بالکل نہیں ہے۔ اہلِ زبان "یہی" استعمال کرتے ہیں۔ پھر مطلب گنجلک ہے۔ نثر کر کے دیکھیے گرامر ساتھ نہ دے سکے گی۔

کیا دبی خاور مری خودداریوں کا خون تھا
دیکھنے والے مجھے نقشِ جبیں کہنے لگے

شاعر آخر کیا کہنا چاہتا ہے۔ "نقشِ جبیں" اس طرح استعمال ہوا ہے کہ مفہوم ہی متعین نہیں ہوتا۔ ننگی زمین پر پیشانی ٹیکنے سے جو نشان بن جاتا ہے اسے ہی نقشِ جبیں کہہ سکتے ہیں لیکن شاعر کی مراد غالباً داغ نشان ہے جو سجدوں کے تسلسل سے ماتھے پر پڑ جاتا ہے۔ محاورے میں "نقشِ جبیں" نہیں کہلاتا لیکن اس کے بغیر شعر کا کوئی مطلب نہیں بنتا پھر شاعر اگر سجدہ گذاری کو اپنی خودداری کا خون تصور کرتا ہے

تو سوال ایسا انداز کا موقع کہاں تھا۔

بنا بنا کے صنم آرزو کے توڑ دیئے
صنم گری کی طبیعت بھی غزنوی ہی رہی

غزنوی بت شکن تھا مگر بت ساز نہیں تھا جو بت اس نے توڑے وہ اوروں کے تراشیدہ تھے مگر شاعر آرزو کے جن بتوں کو توڑ رہا ہے وہ خود اسکے ساختہ ہیں۔ لہٰذا غزنویت سے تشبیہ درست نہیں ہوگی۔ صنم گری اور غزنویت ایک دوسرے کی ضد ہیں پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ صنم گری کی طبیعت بھی غزنوی ہی رہی۔

خاور صاحب میں سخن سنجی کی بھی صلاحیت ہے یہ صلاحیت نکھر سکتی ہے اگر کسی صاحبِ نظر کو مشیر بنا لیا جائے اور شعر خوب سوچ کر کہا جائے۔

ضیا سعید اس مجموعے کے سب سے اچھے شاعر ہیں، انکے یہاں الجھاؤ نہیں، خیالات کی جو بھی سطح ہے الفاظ بھی اسی سطح کے ہیں روانی اور چستی بھی ہے۔ بحیثیت مجموعی کچا پن ضرور ہے مگر پختگی کی منزل سے قریب۔

محسن صاحب بھی بُرے نہیں۔ ذرا تخیل کو بلند کر لیں۔ پیش افتادہ اور بار بار کے دہرائے ہوئے مضامین خوشگوار نہیں ہو سکتے۔

ترمذی صاحب شاید کم کہتے ہیں۔ کافی نومشقی جھلکتی ہے غیر ضروری الفاظ سے شعر کا وزن پورا کرنا اکثر ابتداہی میں ہوا کرتا ہے۔

خمار عزیز بھی مشاق نہیں معلوم ہوتے۔ ہو جائیں گے رفتہ رفتہ۔ فی الحال ان کے اشعار بس برداشت کئے جا سکتے ہیں۔ جھومنا مشکل ہے۔

نفیس صاحب تھوڑی ریاضت کریں اچھے لٹریچر کا مطالعہ بھی ریاضت ہی کے خانے میں ہے۔ مطالعہ انھیں بتائیگا کہ مثلاً لفظ "جنوں" اگر اعلانِ نون کے ساتھ بولیں تو وہ پاگل پن کے ہم معنے ہوگا حالانکہ وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ تو شاعری میں جذبے کی شدت کے ہم معنی ہے اور مقام مدح میں استعمال ہوتا ہے۔ صرف اضافت کی صورت میں تو اعلانِ نون بجا ہے جیسے جنونِ عشق، جنونِ شوق۔

یاسمین ان کا مصرعہ

منزلِ عشق میں پہنچا ہے وہی راہِ رواں

اس میں "راہ رواں" مہمل ہے یہ بات مطالعہ سے عیاں ہو جائے گی۔ صحیح لفظ "راہ رو" ہے اور "رہ رواں" اس وقت بولتے ہیں جب جمع استعمال ہو اور اضافت کے ساتھ استعمال ہو۔ رہروانِ آرزو، رہروانِ محبت وغیرہ۔

مظہر عران کے نمونۂ شعری چار صفحات پر ہیں مگر ہم اوپر اچھے شعروں کے نمونے میں ان کا کوئی شعر نہ لے سکے۔ یہ شاید ہماری کم علمی ہے۔ یا بدذوقی۔ وہ اللہ کے بندے الفاظ اور دروبست دونوں لحاظ سے اتنا مشکل کہتے ہیں کہ عقل چکرا جاتی ہے۔ سامع بوجھ محسوس کرتا ہے مثلاً

مرد شفق کا تصور جمالِ گل کا خیال

بجا ہے روئے منور کو آذری کا سلام

اب دیکھئے پتا نہیں چلا کہ آنجہانی آذر یہاں کیسے آ ٹپکے شاید مظہر صاحب کی مراد یہ ہو گی کہ محبوب کا چہرہ اتنا حسین ہے کہ اسے ماڈل بنا کر نیا بت تراشنے کی امنگ پیدا ہو سکتی ہے "آذری" ظاہر ہے تلمیحاً اس جمالیاتی حس کو کہہ سکتے ہیں جو حسین سنگی محبوب میں نمودار ہو۔ "سلام" سے خوش آمدید، اہلاً وسہلاً مرحبا قسم کا خیر مقدم سمجھ میں آتا ہے۔ جو بھی ہو شعر اتنا گہرا اتر گیا ہے کہ مفہوم شاید ڈوب ہی گیا۔

نئے لئے ہے مناظر اڑی اڑی سی ہنسی

ہماری بزم کی ہر برتری سے ملتے ہیں

گمان ہے کہ مظہر صاحب نے "ابتری" نظم کیا ہو گا۔ کتابت میں "برتری" بن گیا۔ مگر بس گمان ہی ہے یقین نہیں۔ ممکن ہے اپنی مشکل پسندی کے تحت انھوں نے "برتری" ہی سے کوئی معنی پیدا کرنے چاہے ہوں۔

اگر ابتری لکھا تھا تو مطلب سمجھ میں آتا ہے گو کہ "ہر" پھر بھی فضول ہی ہے۔ ابتری ایک محیط کیفیت کا نام ہے اس میں تعدد کہاں۔

ستم ظریفی قسمت بچھڑ نہ لے مظہر

جمالِ دوست کے پرتو خودی سے ملتے ہیں

دوسرے مصرعے کا بھی کوئی مطلب ہو تو ہو لیکن کسی قسم کی ستم ظریفی کسے کہا جا رہا ہے۔ مفہوم شاعر و بطن شاعر۔

گردشِ ایام پہ رقصاں غزل کے ساز آ

بے ثباتی کے طلسموں سے مگر تو باز آ

جذبۂ وارفتگی گم ہو نیازِ عشق میں

بازوئے مشہود میں لے طاقتِ پرواز آ

فکرِ ملحد کے لئے رنگینیٔ ہوش و خرد

قلبِ مظہر کے لئے لے صورتِ غماز آ

ہم کم سمجھوں کے لیے یہ اشعار چیستاں ہیں۔ کیا "گردِ ایام" کسی فرش یا اسٹیج کا نام ہے جس پر کوئی رقصاں ہوا، ساز تو فقط بجتے ہیں۔ رقص بھی کرتے ہوں کبھی نہیں سنا۔ بے ثباتی کے طلسم کیا ہوتے ہیں۔ یہ بھی حل طلب ہے اور "باز آ" کا حکم غزل کو دیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "بے ثباتی کے طلسم" کسی فعل و عمل کا نام ہے جس کا ارتکاب یہ "سازِ غزل" سے چلا جا رہا ہے۔

وارفتگی عشق کا ایک اسٹیج ہے (مرحلے کے مفہوم میں) جو وارفتگی اور نیازِ عشق دو الگ چیزیں کب ہوتی ہیں جو ایک دوسرے میں گم ہونے کا آرڈر دیا جائے "بازوئے مشہود" اور معمہ ہے۔

"فکرِ ملحد" کے ایک معنی تو ہیں مگر رنگینیٔ ہوش و خرد سے جوڑ بہت باریک ہے جو نظر نہیں آتا۔ اس سے بھی بڑھ کر باریک "صورتِ غماز" کی ترکیب ہے۔ غماز چغلخور کو کہتے ہیں۔ لغوی معنوں میں اشارے باز یا مشیر کو کہہ لیجئے۔ مگر مطلب یہاں کیا ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ پُرشکوہ اور وزن دار زبان استعمال کرنا ہے تو ایک اونچا فن۔ مگر اس کے لئے بڑی مہارت اور قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوشؔ یا غالبؔ یا اقبالؔ یونہی نہیں بن جاتے۔ جو لوگ یہ خواہش رکھتے ہوں کہ وہ ذرا مشکل اور بھاری بھرکم شاعری کریں انھیں پہلے سیدھا سادھا کہنے کی مشق کرنی چاہئے۔ جیسے اقبالؔ کی ابتدائی شاعری ہے۔ جب مہارت ہو جائے تب لغاتِ دقیقہ

کی بجرم بجا ہیں۔ بلا مشق و مزاولت اور بلا قدرتِ کلام موٹے موٹے الفاظ استعمال کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی قیمتی پتھروں اور دیگر سامانِ تعمیر کا ڈھیر لگا دے مگر تاج محل اور لال قلعہ بنانے کا فن اسے نہ آتا ہو۔ ظاہر ہے سونے کی سلاخ کو جبینِ عروس کا جھومر یا انگشت حنائی کی انگوٹھی تو نہیں کہہ سکتے۔ شاعری زیور سازی سے کم باریک فن نہیں ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب ہم جیسے نالائق تبصرہ نگار کو نہ بھیجنی چاہئے تھی۔ جب معلوم ہے کہ ہم محض اشتہار نہیں لکھ سکتے تو کیوں سامانِ فضیحت کیا۔ خدا ہماری مغفرت کرے۔ ہم اپنی روش سے شاید کبھی باز نہیں آئیں گے۔

نجات کے بعد

مجموعۂ کلام یوسف ندیم • صفحات ۱۰۸ • لکھائی چھپائی قابلِ برداشت • مجلد تین روپے • ناشر: سروج پبلشرز ۵۲ سروج نگر۔ یوسف گڈھ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۳۴۔

یوسف ندیم جواں سال شاعر ہیں۔ انھیں "فخرِ اردو" کا خطاب ملا ہے۔ ان کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ حساس، ذہین اور پرجوش انسان ہیں۔ بے لوث اور ایثار پیشہ۔ کتاب کے آغاز میں جو تعارف و تقریظ ہیں ان سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔

لیکن "محمود شکیل" صاحب کے اس انکشاف سے بڑا صدمہ ہوا کہ نیاز فتحپوری کی تصانیف اور نفسیات کی کتابیں پڑھ کر اسلام سمیت تمام مذاہب سے ان کا ایقان اٹھ گیا ہے۔ گو کہ انکشاف کا آخری ٹکڑا یہ ہے۔

"مگر وہ مذہب کی اساسی روح کے احترام کو اپنا فرض خیال کرتے ہیں"

لیکن یہ کوئی چیز نہیں۔ ایک مسلمان دہریہ بن جائے تو اساسی روح اور احترام جیسے الفاظ محض تمسخر ہوتے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں۔ کاش ہم اپنے عزیز کو سمجھا سکتے کہ مذہب سے بیزاری دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے جس کے بعد بے عقلی کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ نیاز فتحپوری

مر گئے۔ انھیں کیا کہا جائے۔ جدید علم النفس صرف تخمین و ظن ہے۔ عضویاتی دائرے میں اس پر کسی حد تک اعتماد کر سکتے ہیں [illegible] اخلاقی اور روحانی دائرے میں یہ سرتاسر بکواس ہے جس سے [illegible] پراگندگی، تشکیک اور آوارہ مزاجی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ عزیز گرامی کو ہمارا مشفقانہ مشورہ ہے کہ زندگی کا طول و عرض ناپیں [illegible] سے سو سال۔ اس کے بعد لامحدود زندگی ہے۔ جاوداں اور [illegible] سے بالاتر۔ کیا وہ آدمی عقلمند کہلا سکتا ہے جو انجام سے بے نیاز [illegible] دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لے جوانی کا گرم لہو جب اپنی چنگاریاں [illegible] دے گا تو ہمارے عزیز کے لئے مذہب بیزاری کا احساس [illegible] شدید وبالِ جان بن جائے۔

ان باتوں کا تبصرے سے بے شک تعلق نہیں مگر برادرانہ جذبہ نے بے اختیار چند غیر متعلق سطور نکلوا دی ہیں کاش یہ ضائع نہ ہو جائیں۔

کتاب میں زیادہ نظمیں آزاد ہیں۔ ایسی آزاد کہ سر پیر تک کا پتا نہیں چلتا۔ یہ بات نہیں کہ یوسف ندیم پابند اشعار نہ کہہ سکتے ہوں۔ کچھ پابند اشعار بھی کتاب میں موجود ہی ہیں اور اچھے خاصے ہیں لیکن افتادِ طبع کا کوئی علاج نہیں۔ بے قیدی کے ساتھ اغلاق و ابہام اور جدت طرازی کا شوق آسمان کو چھو رہا ہے۔ یہاں تک کہ صحتِ زبان و لغت کی بھی قید اڑ گئی۔ اب مثلاً شروع ہی میں ایک عنوان نظر آیا "تناظیر" نہیں پتا چلا کہ کونسی زبان کا لفظ ہے عربی میں "نظر" سے "تناظر" آتا تو ہے مگر اس کے معنی ہیں مل جل کر خفت اٹھانا ایک دوسرے کے مقابل ہونا یا ایک دوسرے کو دیکھنا۔ یہاں اس مصدر کی جمع بنا کر کیا مفہوم لیا گیا ہے۔ یہ بس پہیلی ہی ہے

اشعار میں بھی غلط الفاظ یا الفاظ کے غلط استعمال کی کمی نہیں مثلاً:۔

"ناصر کو کافر کا فتویٰ دیا"

"کفر کا فتویٰ" تو صحیح زبان تھی حالانکہ "کو" پھر بھی غلط ہی ہوتا ناصر کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ یا ناصر کو کافر ٹھیرایا۔ یہ تھی پڑھے لکھوں کی زبان۔

دوسری مثال:۔

"صدیاں صدیوں سے تلاشتی رہی ہیں جس کو"

اس سے قطع نظر کر کے مصرعہ "شاعری کے قبیل سے بہرحال نہیں ہے لفظ "تلاشتی" لٹریچر کی زبان نہیں "تلاش کرنا" بولتے ہیں نہ کہ "تلاشنا"۔

تیسری مثال :-

"نظامِ تہضیم کی غلط روی سے آنتوں میں زخم
پڑ جاتے ہیں"

یہاں بھی اس سے قطع نظر کر لیجئے کہ یہ مصرعہ کیسے ہوا۔ تہضیم خدا جانے کہاں ندیم صاحب نے پڑھ لیا۔ ہضم سے انہضام آتا ہے اہتضام آتا ہے۔ تہضم آتا ہے تہضیم نہیں آتا۔ زبان سے دھینگا مشتی کو جدت طرازی کہنا مشکل ہے۔ "غلط روی" بھی یہاں بے محل استعمال ہوا۔ نظامِ ہضم کی خرابی کو "غلط روی" کا عنوان نہیں دے سکتے۔ یہ لفظ ایسی اشیاء کے لئے بول سکتے ہیں جن کے ساتھ حرکت اور انتقالِ مکانی کا تصور بھی وابستہ ہو۔ "رفتن" ہے ہی انتقالِ مکانی کا نام۔ معدہ ٹھیک ہو یا مریض بہرصورت اپنی جگہ فٹ ہے۔ وہ مقام نہیں بدل سکتا اس لئے اس کی کارکردگی کا بگاڑ "غلط روی" نہیں کہلائے گا۔

چوتھی مثال :- "کولمبس کی چشم شہ پر"

چشم شہر مہملات میں سے ہے۔

یہ تو الفاظ کے چند نمونے ہوئے۔ فقرے بھی عجیب و غریب ہیں۔ جیسے :-

"مرضِ نامذکور کا لازمی اثر نظمِ تجسیم مضمحل نیم زندہ"

یہ ایک مصرعہ ہوا۔ اگلا مصرعہ "فرادیٰ فرادیٰ جدولوں کو بھوتو"

تیسرا مصرعہ: "مرضِ دیرینہ کے خاتمہ کا امکان روشن ہوگا"

شاعری تو خیر یہ ہے ہی نہیں۔ پیروڈی بھی نہیں کہہ سکتے۔ مطلب سمجھنے کے لئے سر پکڑے قارئین لانے ہوں گے۔ ویسے کھینچ تان کے مطلب بنا ہی لو تو حاصل کیا۔

قلم ناگفتہ بہ شوخیاں کیسے کرتا ہے اس کا ایک نمونہ۔

میرے قلم کو بھی زکام ہو گیا ہے۔
یا شاید سوزاک
اور کاغذ والیہ پراکٹنگ

میں بڑی دیر سے
کسی گوتم بدھ کا منتظر ہوں۔

یقین نہیں آتا کہ ایسی چیزیں بھی شاعری کے نام پر پیش کی جا سکتی ہیں ان میں مزاح کا بھی لطف نہیں ورنہ دل ہی بہل جاتا۔ گوتم بدھ زکام کو بھی روک دیتے ہوں یہ پہلی بار سننے میں آیا حیرت ختم حیرت۔

نظامِ عدل کی جگہ "نظامِ تعدیل" ـــ حلوت کی جگہ "حزامت؟" ـــ مظہور ـــ ناگزیر سڑک ـــ شفقت (قاف کی تشدید سے) ـــ دشس سرکل ـــ سبز محصوریت کیا کیا نوادرات نہ سامنے آئے۔

نصیحت کڑوی ہوتی ہے مگر کرنی ہی پڑے گی۔ کیا کریں دل کڑھتا ہے کہ اتنی اچھی صلاحیتوں کا خزان کن راہوں پر نکل گیا۔

عزیز بھائی! موتیوں کو کیچڑ میں نہ بکھیریئے۔ آپ کی خداداد صلاحیتیں ہیرے بھی تراش سکتی ہیں یہ کچرے اور روڑے کا ڈھیر آخر کیوں لگا رہے ہیں۔ خطابات عموماً فریب دیتے ہیں "فخرِ اردو" کی لاج رہ سکتی ہے اگر آپ جوش کو ہوش میں، سیمابیت کو باوقار ٹھہراؤ میں۔ پراگندہ خیالی کو انضباط اور مرکزیت میں تبدیل فرمانے کی کوشش کریں۔ کسی زبان کو بگاڑنا قابلِ فخر نہیں نہ طباعی اور جدت طرازی مذبوحی حرکات کو کہہ سکتے ہیں۔ شاعری کرنی ہو تو شائستہ اور معروف نوع کی کچھ پابندیاں قبول کیجئے۔ نہیں قبول کرتے تو نثر کیا بری ہے۔ الفاظ خواہ مخواہ گڑھے نہیں جاتے۔ ایجاد و اختراع کے کارنامے بھی کچھ بنیادی اصولوں سے مربوط ہوتے ہیں یہ نہیں کہ حسین چہروں پر تیزاب سے گل بوٹے بنایئے۔ دم پکڑ کر زبان کو الٹا لٹکا دینا لٹریچر پیدا نہیں کرتا خندۂ استہزاء کو جنم دیتا ہے۔

آپ نے کس محبت سے کتاب پر یہ الفاظ لکھ بھیجے ہیں:

"اخلاص و عقیدت کے ساتھ ممتاز و منفرد اہلِ قلم
مولانا عامر عثمانی کی نذر"

ہم داد کے بجائے "بیداد" کا ارتکاب کر کے شرمندہ ہو رہے ہیں لیکن یقین کیجئے قلم سے زیادہ ہمیں علم "عزیز" ہے قلم کی قیمت ہی کیا اگر اس کی باگ علم کے ہاتھ میں نہ ہو۔ علم چہار دیواری بنانا

ہے تاکہ جہالتیں صحن میں گھس کر غل غپاڑہ نہ مچائیں۔ آپ کے افکار و خیالات پر ہم نے تبصرہ نہیں کیا ان میں بہت کچھ لائقِ تحسین کے ساتھ ساتھ نظرِ ثانی کا بھی مستحق ہے۔ جھلاہٹ اور بے محل طنز و طعن میں کچھ نہیں دھرا۔ دنیا جیسی کچھ ہے ہوا کرے ہمیں یہ فکر کرنی چاہئے کہ ہم کیسے بنیں۔ اگر دنیا کے بگاڑنے ہمیں بگاڑ دیا تو ہمارا انسانی شرف تنکے سے بڑھ کر کیا رہا جو طوفان کی رو میں بہا چلا جاتا ہے۔ عاقل را اشارہ کافی ست۔

ادب، مزاح، طنز، اسرار و تحیر اور رعنائی و شگفتگی کا ایک دلچسپ مرقع ہوگا۔
بعید نہیں کہ یہ نمبر افسانوی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر جائے۔

حقائق

میں سوچ رہا ہوں گلشن کی تزئین کا ساماں کیا ہوگا
تخریب کا داعی ہر گل ہے تعمیر کا ساماں کیا ہوگا

فیضانِ صبا سے خندہ بہ لب اک خارِ مغیلاں کیا ہوگا
آغوشِ خزاں کا پروردہ مانوسِ بہاراں کیا ہوگا

حالات سے ڈرنے والوں کو حالات کا عرفاں کیا ہوگا
ساحل پر بیٹھے رہنے سے اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

تمئیزِ خیر و شر نہ رہی ادراک حق و باطل نہ رہا
اے اہلِ جہاں اس سے بڑھ کر پھر فتنۂ دوراں کیا ہوگا

بیکل ہے صبا مغموم ہیں گل فریاد بلب ہے ہر بلبل
آغازِ بہاراں جب یہ ہے انجامِ بہاراں کیا ہوگا

اسلام نے آکر بتلایا انساں کو مقامِ انسانی
اے اہلِ جہاں اس سے بڑھ کر تہذیب و احساں کیا ہوگا

ممکن نہیں تبدیلی آئے اشیائے جہاں کی فطرت میں
پتھر ہے بہر صورت پتھر یہ لعلِ بدخشاں کیا ہوگا

(محمد حسین فطرت ۔ بھٹکلی)

○

عشق اک جذبۂ جلال بھی ہے
عشق رنگینیٔ جمال بھی ہے

ہے ابوذرؓ کا جوشِ ایماں بھی
جذبۂ جرأتِ بلالؓ بھی ہے

فلسفی حل نہ کر سکے جس کو
عشق خود دار وہ سوال بھی ہے

عشق ہے اک محبِ صادق بھی
عشق محبوب خوش جمال بھی ہے

بحرِ ہستی کا گوہرِ تاباں
عشق اک دُرِّ بے مثال بھی ہے

شانِ معراج زندگیٔ بشر
زیست کی رفعت کمال بھی ہے

زخمِ دل بھی یہی ہے عاشق کا
زخمِ دل کا یہ اندمال بھی ہے

(محمد عبدالسمیع حافظ)

قرآن اور حدیث

قرآن اور حدیث میں کیا ربط ہے؟ سنت کا مفہوم اور مقام کیا ہے؟ رسالت کسے کہتے ہیں؟ ان ہی جیسے دسیوں سوالوں کا مدلل جواب مولانا مودودی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔ نیا ایڈیشن مع ڈسٹ کور۔ قیمت ــــــ دو روپے ساٹھ پیسے

حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ اور انکی فقہ

اردو زبان میں پہلی بار ایک عمدہ اور جامع کتاب۔ جو حضرت عبد اللہ ابن مسعود پر لکھی گئی۔ سوانح اور حالات۔ غیر مجلد ــــــ سات روپے

فتوح الغیب

شاہ عبد القادر جیلانیؒ کے وہ فرمودات جن کا مطالعہ دل و دماغ کو منور کرتا ہے۔ حقائق و اسرار اور رموز و معارف عام فہم زبان میں۔

قیمت مجلد ــــــ ساڑھے چار روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

…سے مخاطب …

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مسئلہ ابن العربی مکی کے شہ پارے دل… تھوڑے تھوڑے وقفے سے پڑھنا بھی لطف سے خالی نہیں… دین میں جسم کی چاشنی اور طنز کی شگفتگی ہی نہیں افادیت بھی ہے… فقط عنصر برائے طنز اور مزاح برائے مزاح پر بس نہیں کرتا… کسی نہ کسی اخلاقی مقصد پر بھی آپ کی توجہ منعطف کراتا ہے

قیمت جلد اول ــــــ چھ روپے

حصہ دوم ــــــ چھ روپے ۵ پیسے

…یا جماعت اسلامی حق پر ہے؟

دنیا بھر کے علماء وفضلاء کے فتوے اور فیصلے۔ ایک اہم کتاب جو موافق و مخالف ہر ایک کے لئے مفید اور دلچسپ ہے۔ قیمت ــــــ چار روپے ۴/-

…دین و شریعت

اردو ایڈیشن۔ مجلد ۴/۲۵

انگریزی ایڈیشن 〃 ۱۲/-

کھانسی کا وقتی طور پر دب جانا ہی کافی نہیں

آپ اس کا مکمل علاج کیجیے۔

سُعالین لیجئے

یہ صرف کھانسی کی تکلیف ہی نہیں بلکہ کھانسی کو پورے طور پر ختم کرتی ہے

سُعالین میں شامل پانچ جڑی بوٹیاں کھانسی کے موجودہ جراثیم کو ختم کر دیتی ہیں اور ان کی مزید پیدائش کو روکتی ہیں۔ اس طرح یہ ہر قسم کی کھانسی، زکام، گلے کی خراش وغیرہ جیسی شکایتوں میں آرام دیتی ہے۔

ہمدرد

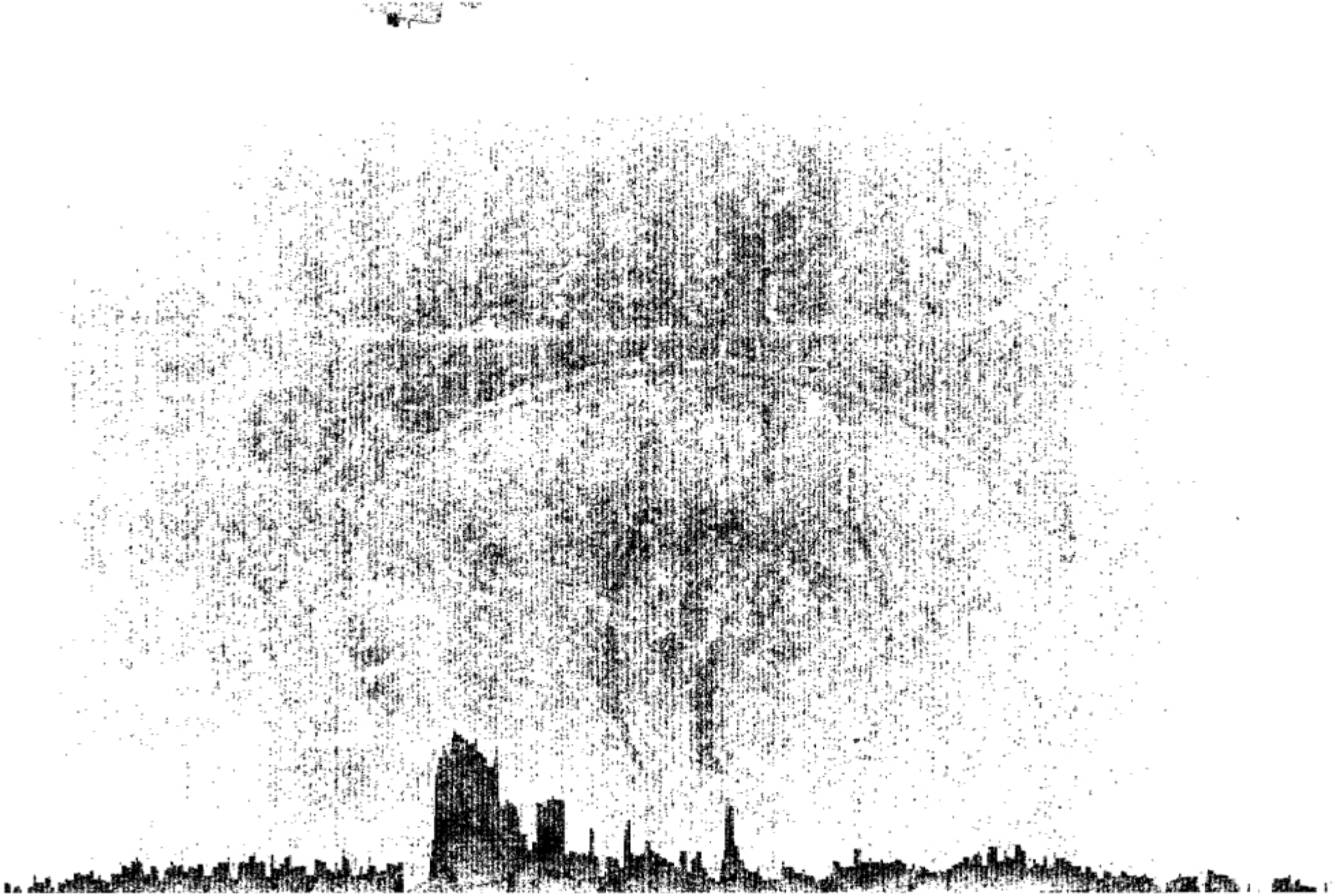

surm
سچے موتی
پائداری دینے والا۔
ایک تولہ
8/-
ڈاک خرچ
2-75
چھ ماشہ
4-50